جموں وکشمیر میں اردو غزل کا فنی وفکری مطالعہ

(1947 کے بعد)

اندراج نمبر 16HUPH04

مقالہ نگار

اویس احمد

ریسرچ اسکالر

یونی ورسٹی آف حیدرآباد

نگراں

پروفیسر حبیب نثار

شعبہ اردو

یونی ورسٹی آف حیدرآباد

شعبہ اردو

اسکول آف ہیومانی ٹیز، یونی ورسٹی آف حیدرآباد، 500046

2021

فہرست

	پیش لفظ	02
باب اول	جموں وکشمیر میں اردو شاعری ''1947 سے قبل''	08
باب دوم	''جموں وکشمیر میں اردو غزل کا فنی وفکری مطالعہ'' ''1947 سے 1960 تک''	82
باب سوم	جموں وکشمیر میں جدید اردو غزل کا فنی وفکری مطالعہ ''1960 سے 1980 تک''	158
باب چہارم	جموں وکشمیر میں اردو غزل کا فنی وفکری مطالعہ ''1980 تا حال''	200
	ماحصل	289
	کتابیات	311

﴿پیش لفظ﴾

ریاست جموں وکشمیر کو اپنی قدرتی خوبصورتی کے علاوہ علمی وادبی نقطۂ نظر سے دنیائے ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔اس ریاست کی علمی وادبی تاریخ کئی سوسالوں پر محیط ہے۔ ہر ترقی یافتہ قوم کے لئے یہ سرمایہ باعثِ نازوافتخار ہوتا ہے۔اہل قوم کو اس بات پر فخر ہے کہ اس سرزمین نے ادب کے حوالے سے ایسے نام پیدا کیے ہیں،جن کا کام اور نام ہمیشہ عالمِ ادب کی بارگاہ میں روشن رہے گا۔

کلہن کی راج ترنگنی سے کون واقف نہیں،لل دید اور شیخ العالم کا کلام آج بھی دینی مجالس میں روح پرور سکون بخشتا ہے حبہ خاتون اور ارنہ مال کے گیت ہمارے دھان کی کھیتوں میں آج بھی گونجتے ہیں،رسول میر کے رومانی نغموں کے ڈانڈے جان کیٹس سے ملائے جاتے ہیں،غنی کاشمیری کی شاعری نے ایران کے ملک الشعرا(صائب) کو اپنے در کا مسافر بنایا۔مہجور کی حب الوطنی کا کون منکر ہوسکتا ہے۔غرض اس میں مبالغے کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہاں کی ساری تاریخ شعروشاعری کے حوالے سے سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے اور آج تک ان شخصیات کا فیض اس سرزمین پر موجود ہے۔ریاست جموں وکشمیر کے ادیب اپنے خونِ جگر کو صرف کر کے جہاں اپنی مادری زبان (کشمیری) کی آبیاری کرتے رہے،وہیں اردو ادب میں بھی ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ یہاں اردو زبان کو کبھی بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔

ریاست جموں وکشمیر ہندوستان کا واحد خطہ ہے جہاں اردو کو بول چال کی زبان کے ساتھ ساتھ ادبی سطح پر کافی بلند مقام حاصل ہے۔ یہاں کے بہت سے شعرا ملک بھر کے ادبی منظرنامے پر اپنی چھاپ قائم کر چکے ہیں۔ان شاعروں نے اردو ادب کی تمام اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ غزل گوئی میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔لیکن راقم الحروف کی معلومات کے مطابق ان کے غزلیہ کلام کے تعینِ قدر میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے تو ان کا نام لیا ہے لیکن ان کے حوالے سے گفتگو کرنے کی زحمت نہیں اُٹھائی ہے۔ریاست جموں وکشمیر کی ادبی تاریخوں میں ان کے غزلیہ کلام کے مقام کا مثبت ذکر شاید ہی نظر

آئے گا، بلکہ ضمنی طور پر اردو غزل کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس طرح ریاست کی غزل خوابِ پریشاں کی حیثیت رکھتی ہے اور یہاں کی اردو غزل کے متعلق سنجیدہ اور باقاعدہ خیالات مشکل ہی سے ملیں گے۔ یہی بات میرے پیشِ نظر رہی جس نے مجھے اس موضوع کو منتخب کرنے پر آمادہ کیا اور میری خواہش تب پوری ہوئی جب میرے استاذِ محترم پروفیسر حبیب نثار صاحب کے فیصلے پر میرے موضوع کا انتخاب ''جموں و کشمیر میں اردو غزل کا فنی وفکری مطالعہ، 1947 کے بعد'' کے عنوان سے طے پایا۔لیکن موضوع منتخب ہونے کے بعد یہ احساس ہونے لگا کہ یہ موضوع بڑا مشکل ہے۔اس موضوع کے تعلق سے اپنی یونیورسٹی کے کتب خانہ سے استعانت کی کوئی امید نہ تھی۔لیکن میرے نگراں پروفیسر حبیب نثار صاحب کے مشفقانہ سلوک نے میرا اعتماد بڑھایا۔موصوف نے یہ ہدایت دی کہ جہاں کہیں بھی ریاست کی غزل گوئی سے متعلق مواد ملے فراہم کیا جائے۔ میں نے استاد کی رائے پر لبیک کہہ کر حکم بجالایا۔جس کا ثمر میرے اس مقالے کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔

جموں و کشمیر میں اردو غزل کا فنی وفکری مطالعہ، 1947 کے بعد'' کو میں نے درجِ ذیل چار ابواب میں پیش کیا ہے۔

باب اول:۔جموں وکشمیر میں اردو شاعری 1947 سے قبل۔

مقالے کے اس باب میں ریاست جموں وکشمیر میں اردو شاعری کے ابتدائی نقوش کی نشان دہی کرتے ہوئے فارسی زبان کے زیر سایہ اُبھرنے والے اُن شاعروں کا ذکر آیا ہے جو اپنے دور میں ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں بسنے والے شعرا کا مقابلہ تو نہ کر سکے لیکن ہمیں ان کی کاوشوں کی تحسین وآفرین کرنی چاہئے کہ جب ریاست میں اردو زبان کا نام ونشان نہ تھا تب بھی انہوں نے اس بیرونی زبان سے کوئی غفلت نہیں برتی۔ساتھ ہی ساتھ انیسویں صدی کے ابتدا سے تقسیم ہند تک کے اہم شعرا کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا

ہے۔

بابِ دوم:۔جموں وکشمیر میں اردو غزل کا فنی وفکری مطالعہ 1947 سے 1960 تک۔

اس باب میں ریاست میں موجود اس دور کے اہم شعرا کی غزلیہ شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ساتھ ہی اُن چند گمنام شعرا کا ذکر بھی ہوا ہے جنھوں نے اپنے دور میں اچھی شاعری کی ہے لیکن انھیں کسی بھی زمرے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

بابِ سوم:۔جموں وکشمیر میں اردو غزل کا فنی وفکری مطالعہ 1960 سے 1980 تک۔

مقالے کا یہ باب 1960 سے 1980 تک کے اس شعری منظر نامے پر مبنی ہے جو سیاسی وسماجی سطح پر جدید ڈسکورس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس باب میں ریاست کا بدلتا ہوا شعری منظر نامہ زیرِ بحث آیا ہے۔ یہاں صرف انھیں شاعروں کے غزلیہ کلام کا جائزہ لیا گیا ہے جو زیادہ تر جدید شعری رجحانات کے تحت شاعری کرتے رہے۔

بابِ چہارم:۔جموں وکشمیر میں اردو غزل کا فنی وفکری مطالعہ 1980 تا حال۔

مقالے کے اس باب میں ریاست کے اُن شعرا کی غزلیہ شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے جو ریاست کے پورے ادبی منظر نامے پر چھائے ہوئے ہیں اور جنھوں نے 1980 کے بعد ریاستی و بیرونی ریاستوں کے ادبی منظر نامے پر اپنی چھاپ قائم کی ہے۔ساتھ ہی ریاست سے تعلق رکھنے والی اُن شاعرات کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے مرد شعرا کے شانہ بہ شانہ اپنے جذبات وخیالات کا اظہار تو مختلف شعری اصناف اور ہیئتوں میں کیا ہے لیکن بد قسمتی سے ان خواتین قلمکاروں کے تئیں ایک طرح کا سکوت نظر آتا ہے۔اگر چہ چند قلمکاروں کی دبی دبی سی آوازیں سرگوشیوں میں سنائی دیتی ہیں مگر یہ آوازیں ان کے گھروں کی چار دیواری سے ٹکرا کر رہ گئی ہیں۔

ماحصل:۔ اس میں جموں و کشمیر کی غزلیہ شاعری پر معروضی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے بعد حروفِ تہجی کی ترتیب سے کتابیات کو شامل کیا گیا ہے اور تحقیق کے دوران جن رسائل و جرائد سے استفادہ کیا گیا ہے، اُن کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

سپاس نامہ:

مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں سب سے پہلے میں ذاتِ باری تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی بارگاہ میں دست بہ دعا ہو کر شکر بجا لاتا ہوں، کہ جن کی کرم فرمائیوں اور چاہتوں کے بغیر میرے مقالے کا مکمل ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔

میرا خوش گوار فرض بنتا ہے کہ میں اپنے مقالے کے نگراں استاذی قبلہ پروفیسر حبیب نثار صاحب کا شکریہ ادا کروں۔اگر ان کی رہنمائی اور ہمت افزائی میرے شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ مقالہ اتنی جلدی تکمیل کو نہیں پہنچتا۔مجھ پر انھوں نے جتنی شفقت عنایت فرمائی اس کا صلہ الفاظ میں نہیں دیا جاسکتا ہے۔

میں شعبہ اردو، حیدرآباد یونی ورسٹی کے تمام اساتذہ، پروفیسر فضل اللہ مکرم صاحب، ڈاکٹر محمد زاہد الحق صاحب، ڈاکٹر عبدالرب منظر صاحب، ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ، ڈاکٹر رفیعہ بیگم صاحبہ، ڈاکٹر نشاط احمد صاحب اور ڈاکٹر محمد کاشف صاحب کا بھی شکر گزار ہوں، جتنی کچھ وہ میری رہنمائی کر سکتے تھے ہمیشہ کرتے رہے۔

میں اپنے اُن احباب و اقربا کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے دورانِ تحقیق میری مدد اور حوصلہ افزائی کی اور جن کے نامِ گرامی لکھتے ہوئے مجھے فخر محسوس ہوتا ہے۔بشریٰ بشیر، عامر نبی، ڈاکٹر بلال احمد میر، صریر بٹ، ڈاکٹر شوکت رشید، ڈاکٹر رافد اویس، ڈاکٹر جنید علی، ڈاکٹر جمشید ٹھوکر، ڈاکٹر سجاد احمد بٹ، ڈاکٹر توفیق احمد بٹ، ڈاکٹر جاوید احمد بٹ، ڈاکٹر رئیس احمد بٹ، ڈاکٹر سرور لون، آکرتی سریش، ڈاکٹر نغمہ پروین، ڈاکٹر منظور پنڈت، گلزار مدنی، مدثر گنائی، رئیس احمد، میر محمد عابد، اشفاق کیمسٹری، ڈاکٹر عاقب بٹ،

ڈاکٹر اشفاق مجید اور عرفان کیمسٹری کے علاوہ اُن تمام کتب خانوں اور انجمنوں کے منتظمین کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جن سے میں مستفید ہوتا رہا۔

میں اپنے والد حاجی غلام رسول گنائی، والدہ ازہ بیگم، چچا حاجی غلام محمد گنائی، چاچی عائشہ بیگم کے علاوہ بھائیوں اور بہنوں کا سپاس گزار ہوں۔ جن کی دعائیں اور مالی تعاون ہمیشہ میرے شاملِ حال رہا۔ میں ان کی صحت اور عمر درازی کے لیے دعا گو ہوں۔

میں ان تمام لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جن کا میں یہاں نام نہیں لے سکا، بلکہ انھوں نے اس مقالے کی تکمیل میں میری کچھ بھی رہنمائی فرمائی ہو۔

مجھے اپنے ماموں مرحوم عبد الکریم صاحب اور مشفق پڑوسی مرحوم محمد مقبول وانی، عرف (مگھ ٹوٹھ) ہمیشہ یاد رہیں گے۔ جو میرے پی ایچ۔ڈی میں داخلے کو لے کر بہت خوش ہوئے تھے لیکن وہ آج ہمارے درمیاں موجود نہیں ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

آخر پر میں اس اُمید کے ساتھ قلم رکھتا ہوں کہ میں نے زندگی کے جو عزیز لمحات اس مقالے کو لکھنے میں صَرف کیے ہیں، وہ رائگاں نہیں ہونگے۔ میں اس مقالے کو موثر بنانے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ شائقانِ ادب کی نظرِ کرم پر ہے۔ مجھے اس چیز کا بھی احساس ہے کہ خوبیوں سے زیادہ اس میں خامیاں ہی ہونگی اور اگر زندگی نے وفا کی تو میں اس مقالے پر نظرِ ثانی کر کے اُن غلطیوں کا ازالہ کروں گا جن سے میں واقف رہوں گا۔ والسلام

حیدر آباد　　　　　　　　　　اویس احمد

ایم۔اے، ایم۔فل

﴿باب: اول﴾

جموں و کشمیر میں اردو شاعری ”1947 سے قبل“

ریاست جموں وکشمیر کچھ اپنی سرزمین کے محل وقوع کی حیثیت سے، کچھ آب وہوا کی تاثیر کے سبب اور کچھ اپنی مسلمہ ذہانت، بیدارِ مغزی، سنجیدہ مزاجی، مناسب طبع اور اپنے حسن وصورت کے لحاظ سے دنیا بھر میں نہایت اہم درجہ رکھتی ہے۔ جہاں یہ اپنی خوبصورتی میں کوئی ثانی نہیں رکھتی وہیں زبان وادب کے سلسلے میں اپنا ایک اہم مقام رکھتی ہے۔اس ریاست کومختلف اللسان خطہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہاں پر کم وبیش سات زبانیں بولی جاتی ہیں۔جن میں کشمیری، دادری، بلتستانی، پنجابی، ڈوگری، ہندی اور اردو زبان شامل ہیں۔ان زبانوں کو ریاستی آئین کے دفعہ 28 کے تحت منظور کیا گیا ہے۔لیکن ان تمام میں سے اردو کو ریاست کی بین الاقوامی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

ریاست جموں وکشمیر وہی خطہ ہے جو کبھی سنسکرت اور فارسی زبانوں کا مسکن رہ چکا ہے،لیکن زمانے کی فطرت ہے کہ جس چیز کو اپنے پورے عروج پر پہنچاتا ہے،اسے زوال وادبار کے دن بھی دکھادیتا ہے۔فطرت کے اسی اصول نے سنسکرت اور فارسی زبانوں کے ساتھ کیا۔اس دعوے کے سلسلے میں چند مثالیں دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

کلہن کی راج ترنگنی سے کون واقف نہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جسے ہندوستانی اور یورپی مورخوں نے سنسکرت زبان میں لکھی گئی قدیم کشمیر کی نہایت معتبر تاریخ تسلیم کیا ہے۔غنی کاشمیریؔ کی شہرت کا کون منکر ہو سکتا ہے۔ان کے فارسی کلام نے ایران کے ملک الشعرا کو اپنے در کا مسافر بنایا اور ان کا رنگِ سخن مغلیہ دور کی شاعری میں ایک امتیازِ خاص رکھتا ہے۔نہ صرف یہ بلکہ اردو ادب کے شعرا بھی ان کے کلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔خدائے سُخن میر تقی میرؔ،غنی کاشمیریؔ کے دیوان سے اپنے اکتسابِ فیض کا ذکر اس طرحدارانہ

انداز سے کرتے ہیں۔

کچھ گدا شاعر نہیں ہوں میرؔ میں
تھا میرا سر مشق دیوانِ غنیؔ

خواجہ حیدر علی آتشؔ نے بھی غنی کاشمیریؔ کی شاعری سے استفادہ کیا ہے۔انہوں نے اپنی ایک غزل میں غنی کاشمیریؔ کی غزل کے مطلع کے مضمون کو اس طرح باندھا ہے۔

صیادِ اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے دام و دانہ کیا

(انتخابِ کلام،خواجہ حیدر علی آتشؔ ۔مرتبہ، ولی الحق انصاری۔مطبع۔اتر پردیش اردو اکیڈمی(لکھنو)اشاعت 1984)

غنی کاشمیریؔ کی غزل کا مطلع یوں ہے۔

بر برگِ گل رشتۂ باشد بپای عندلیب
دامِ دیگر نیست حاجت از برائے عندلیب

(دیوانِ غنی کاشمیریؔ،مطبوعہ،1845)

ریاست جموں وکشمیر کے لوگوں کی مادری زبان ''کشمیری'' ہے اور اس زبان میں سرمایہ ادب فراہم کرنا ان کا اولین فرض بنتا ہے۔ یہاں کے لوگوں نے اس زبان سے بھی کوئی غفلت نہیں برتی۔ بلکہ اس زبان کے ادب پارے کشمیر کی ادبی تاریخ کا ایک اہم سرمایہ ہے۔لل دید اور شیخ العالم جیسی شخصیات سے کون واقف نہیں۔ان کا کلام آج بھی یہاں کی دینی مجالس میں روح پرور سکون بخشتا ہے حبہ خاتون اور ارنہ مال کے گیت ہمارے دھان کی کھیتوں میں آج بھی گونجتے ہیں، رسول میر کے رومانی نغموں کے ڈانڈے جان کیٹس سے ملائے جاتے ہیں، مہجور کی حب الوطنی کا کون منکر ہوسکتا ہے۔غرض اس میں مبالغے کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہاں

کی ساری تاریخ شعروشاعری کے حوالے سے سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے اور آج تک ان شخصیات کا فیض اس سرزمین کو حاصل ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے ادیب اپنے خونِ جگر کو صرف کر کے جہاں کشمیری، فارسی اور دیگر زبانوں کی آبیاری کرتے رہیں، وہیں اردو ادب میں بھی ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ یہاں اردو زبان کو کبھی بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا اور اردو زبان کے متعلق حکومتی سازشوں کے خلاف یہاں کے لوگ اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ابتدا سے تا حال حکومت نے اردو کی جگہ انگریزی کو رائج الدفتر بنانے کی کئی کوششیں کی، لیکن اردو کے تحفظ کے لیے یہاں کے لوگ سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوئے اور فارسی اور کشمیری سے زیادہ ادبی سرمایہ اسی اردو زبان میں تخلیق کیا۔ یہاں کے ادیبوں نے اپنی موافقتِ طبع اور سریع الفہمی کے فیض سے اردو زبان کو اس طرح اپنایا کہ گویا یہ بھی ان کی مادری زبان تھی۔

ریاست جموں وکشمیر تین صوبوں پر مشتمل ہے۔ جموں، کشمیر اور لداخ۔ یہ تینوں صوبے رہن سہن، شکل وصورت، تہذیب اور زبان و بیان کے معاملے میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جموں میں ڈوگری زبان بولی جاتی ہے، کشمیر میں کشمیری اور لداخ میں لداخی بولی جاتی ہے۔ لیکن ان تینوں خطوں کے لوگوں کو ایک دوسرے سے ملانے کا واحد ذریعہ اردو زبان تھی۔ یہی وجہ بنی کہ ڈوگرہ حکمران مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اردو زبان کی مقبولیت کو دیکھ کر اسے 1889 میں سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا (بحوالہ۔عبدالقادر سروری۔کشمیر میں اردو'' جلد اول'' صفحہ ۹۱) اس سے پہلے یہاں پر فارسی زبان رائج تھی اور فارسی زبان میں لکھے گئے ادبی سرمائے کی بنا پر کشمیر کو ایرانِ صغیر کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ چونکہ ریاست ہمیشہ سے مطلق العنان بادشاہوں کے قبضے میں رہ چکی ہے اور جہاں رعایا کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو وہاں ادبی سرمائے کو محفوظ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ 23، ستمبر 1925 میں مہاراجہ ہری سنگھ نے جموں وکشمیر کی باگ دوڑ سنبھالی۔ یہ وہ

دور تھا جب ملک گیر سطح پر اقبالؔ، حسرت موہانیؔ، جوشؔ، جگرؔ، حفیظ جالندھری وغیرہ جیسے شعرا کی بازگشت سے پورا برصغیر گونج رہا تھا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دورِ حکومت میں علامہ اقبالؔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے کشمیر آئے ہوئے تھے۔ اس دورے کے بارے میں شفق سوپوری اپنی کتاب ''غ۔م۔طاؤس، فن اور شخصیت'' کے صفحہ 29، پر محمد دین فوقؔ کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''وہاں (کشمیر میں) اپنی آنکھوں سے جو کشمیر کی حالات دیکھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ نشاط باغ کی سیر میں جہاں سر اقبال ہر اہلِ دل کی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

شرابے کبابے ربابے نگارے

وہاں نشاط کی سیر کے دوران میں بدنصیب کشمیریوں کی المناک حالات کے متعلق اسی نظم میں لکھتے ہیں۔

کشیری کہ با بندگی خود گرفتہ
بتے مے تراشد زسنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے
خودی نا شناسے زخود شرمسارے
بر شم قبا خواجہ از محنتِ اُو
نصیب تنش جامۂ تار تارے
نہ دردیدۂ اُو فروغ نگاہے
نہ در سینہ او دل بے قرارے
ارزاں مے فشاں قطرہ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

آزادیِ کشمیر کے اس عظیم داعی شاعرِ مشرق حضرت علامہ اقبال نے کشمیر کے لوگوں کی ستم پُرسی کا حال

اپنے مجموعہ کلام ''ارمغان حجاز'' میں ان درد انگیز الفاظ میں بیان کیا ہے۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

سینۂ افلاک سے اُٹھتی ہے آہِ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر

کہہ رہا ہے داستاں بے دردیِ ایام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر

آہ! یہ قومِ نجیب وچرب دست و تر دماغ
ہے کہا روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

علامہ اقبالؔ کے علاوہ متعدد ادیبوں نے کشمیر کے لوگوں کی ستم ظریفیوں کا بیان اپنی مختلف تحریروں میں کیا ہے۔لیکن جتنا کچھ لکھا گیا ہے، اس سے آگے بھی ہماری داستان سفر کرتی ہے۔ یہاں غالبؔ کا یہ شعر مجھے یاد آتا ہے۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ ستم بہت ہوئے

مذکورہ بالا تمہیدی الفاظ کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا چلن کب سے چلتا آرہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس بارے میں قطعی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔لیکن یہ

بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ریاست میں اردو شاعری فارسی کے زیرِ سایہ پروان چڑھتی رہی۔ کیونکہ 18 ویں صدی کی ابتدا ہی سے ہمیں ریاست میں فارسی کے ایسے شعرا نظر آتے ہیں جن کے ہاں ریختہ میں لکھے گئے کچھ اشعار ملتے ہیں اور کچھ شعرا کے ہاں مکمل غزلیں دستیاب ہوتی ہیں۔ یہ وہی دور ہے، جب شمالی ہندوستان میں۔ آبروؔ 1747 ، مضمونؔ،1745، ناجیؔ،1754، حاتم،1781، مظہر جان جاناں 1781، رنگینؔ 1756 ، میر دردؔ 1719 میر حسنؔ 1736 میر تقی میرؔ،1723 وغیرہ جیسے قدآور شعرا موجود تھے۔ ان شعرا کے ہاں، جہاں فارسی اور اردو میں لکھا گیا ادبی سرمایہ دستیاب ہوتا ہیں وہیں ریختہ میں بھی لکھی گئی کچھ غزلیں ملتی ہیں۔ اس لئے اس دور میں کشمیر میں رہنے والے شعرا سے بھی یہی اُمید کی جا سکتی تھی۔ جب ہم اردو شاعری کی بات کرتے ہیں، تو اس میں، غزل، نظم، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قصیدہ، قطعہ، ترکیب بند، ترجیح بند وغیرہ سب آ جاتے ہیں۔ اس طرح سے جب ہم ریاست جموں و کشمیر میں پہلے شعری نمونے کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ وہاں ہمیں سب سے پہلا شعری نمونہ مثنوی کی صورت میں ملتا ہے اور یہ نمونہ 1131ھ بمطابق 1717 میں لکھا ہوا ہے۔ جس کے مصنف میاں غلام محی الدین میرؔ پوری ہے۔ انہوں نے یہ مثنوی ''گلزارِ فقیر'' کے عنوان سے لکھی ہے جو تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحے پر تیرہ اشعار درج ہیں۔ اس طرح سے یہ مثنوی کل 520 اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کا نسخہ زمیندار کالج گجرات کے پروفیسر احمد حسین قریشی کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا۔ حبیب کیفوی اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' کے صفحہ نمبر 19 پر لکھتے ہیں کہ مثنوی کے آخر میں مصنف اور کاتب کا نام بھی درج ہے اور سالِ تصنیف بھی ایک شعر میں درج ہے۔ مثنوی کے آخری اشعار کی نقل پیش خدمت ہوں۔

کلمہ پاک پر ختم کلام
نیک مبارک سید تمام

غلام محی الدین ایک فقیر
جس کا حضرت آپ ہے پیر
قطب عالم شاہ میرا باپ
جنھو نیں دیا اپنا آپ
حق کی راہ میں سب کچھ دیا
سب کچھ دے کر حق کوں لیا
شیخ اجل اور عارف کامل
قطب دین مکمل اکمل
شیخ محمد یوسف نام
ہر کمال میں بھیے امام
حق تعالیٰ ہو ان سیں راضی
آپ اور جس دن ہوگا قاضی
سب خانداں بدا ہے ککھر
اصیل نجیب اور نیکو گوہر
سید سلطان دیواں اور خان
متشرع ہوئے با ایماں
آپ کے شہر میں رہن ہمارا
مولد مسکن اور پیارا

میر پور نام ہے بیچ پنجاب
حق راکھے ان کے دائم آب
یہ نسخہ جب تھیا تمام
''گلزارفقر'' ہو یا نام
تخمیناً یہ نیک کلام
چار پہر میں ہوئی تمام
اکتیس برس اور باراں سو
ہجرت سیں ہوئی تھی تو
پیغمبر پر اور آل کرام
لاکھ درود اور لاکھ سلام

اس مثنوی کا ذکر مشہور ماہرِ لسانیات حافظ محمود شیرانی نے مقالاتِ محمود شیرانی کے جلد دوم میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''گجرات ودکن میں اگرچہ اردو تالیفات دسویں صدی ہجری سے شروع ہو جاتی ہیں۔ لیکن شمالی ہندوستان میں دوصدی بعد تک ان کا پتہ نہیں چلتا۔ دہلی میں ابھی اردو دبستان قائم بھی نہیں ہو چکا ہے کہ پنجاب میں لوگ اردو زبان میں مثنویاں لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ میر پور (کشمیر) کے شیخ غلام محی الدین مثنوی ''گلزار فقیر'' 1131ھ میں ختم کرتے ہیں''۔(1)

محمود شیرانی کے اس بیان سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ کشمیر کے لوگ شمالی ہندوستان کے مقابلے میں بہت

پہلے اردو مثنوی کے فن سے واقف تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مثنوی ''سحرالبیان'' تو کیا، بلکہ اس کا مصنف بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حبیب کیفوی نے محمود شیرانی کے بیان پر اکتفا کیا ہے۔ جہاں محمود شیرانی نے اس مثنوی کا سنِ تصنیف 1131ھ بتایا ہے وہیں حبیب کیفوی نے آنکھیں بند کر کے 1131ھ نقل کیا ہے۔ جب کہ مثنوی کے اس مصرعے میں شاعر نے خود 1231ھ بتایا ہے۔

اکتیس برس اور باراں سو

اس مثنوی کا املا بھی قدیم ہے۔ کیونکہ سے کے بدلے سیں لکھا گیا ہے، بڑا کو بدا لکھا گیا ہے، رکھے کو راکھے لکھا ہے، نے کے بدلے نیں، کو کے بدلے کوں، اصل کو اصیل لکھا گیا ہے، تھا کو تھیا وغیرہ۔ یہ وہی املا ہے جو ہمیں قدیم دکنی مثنویوں میں ملتا ہے۔ مثنوی کے ایک شعر میں مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ مثنوی تقریباً ایک دن میں مکمل ہوئی۔

تخمیناً یہ نیک کلام
چار پہر میں ہوئی تمام

چونکہ میرے اس باب کا عنوان ہے ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو شاعری 1947 سے قبل'' اس لیے سب سے پہلے میں اُن شعرا کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جو اپنے دور میں ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں بسنے والے شعرا کا مقابلہ تو نہ کر سکے لیکن ہمیں ان کی کاوشوں کی سراہنا کرنی چاہئے کہ جب ریاست میں اردو زبان کا نام ونشان نہ تھا، تو بھی اُنہوں نے اس بیرونی زبان سے کوئی غفلت نہیں برتی۔ جہاں ان شعرا کے ہاں وافر مقدار میں فارسی کلام ملتا ہے۔ وہیں ریختہ (اردو) کی بھی کچھ غزلیں یا اشعار اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ ریاست میں اردو شاعری فارسی کے زیرِ سایہ آنکھیں کھول رہی تھی۔ اس سلسلے میں جو سب سے پہلا نام ہمارے سامنے آجاتا ہے، وہ ہے۔

خواجہ محمد مومن جبل غازیؔ:۔

ان کا اصلی نام محمد مومن تھا اور غازیؔ تخلص کرتے تھے۔ غازیؔ کشمیر کے مشہور بادشاہ یوسف شاہ چک کے مصائب خواجہ ابوالقاسم جبل کے فرزند تھے۔ بقولِ عبدالقادر سروری۔

''غازیؔ نے فارسی کے علاوہ ریختہ میں بھی شاعری کی تھی۔جس میں ان کی ایک رباعی دستیاب ہوئی ہے۔جو ریختہ میں لکھی گئی ہے''۔(2)

رباعی ملاحظہ ہوں۔

اے باد اوتر گر گزری دیو سر
از من خبری نیز بہ آں دلبر بر
کشمیری و فارسی اگر گوش نہ کرد
ہندیش بگوی کہ''او تر میرا تر''

رباعی میں لفظ'' دیوسر'' کشمیر کے مشہور ضلع کولگام کے ایک قصبہ دیوسر کے بہ نسبت آیا ہے۔اس کے علاوہ رباعی میں لفظ''باد اوتر'' اور''اوتر میر'' میں صنعتِ تجنیس کا اچھا استعمال کیا ہے۔جس سے رباعی کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب''کشمیر میں اردو'' جلد دوم کے صفحہ نمبر 37 پر لکھا ہے۔

''خواجہ محمد جبل کے کلام کا یہ نمونہ، ہندوستان میں اردو کے تشکیلی دور کے ریختوں اور ملفوظات سے مشابہ ہے''۔

میر عبدالغنی بیگ قبولؔ:۔

عبدالغنی نام اور قبولؔ تخلص، کشمیر میں فارسی زبان و ادب کے ایک بہت اچھے شاعر گزرے ہیں۔

قبولؔ یوسف شاہ چک کے دور میں کشمیر سے دہلی چلے گئے تھے۔پیر غلام حسن کھویہامی نے اپنے تذکرے ''تاریخ کشمیر'' کے صفحہ 41 پر قبولؔ کی صلاحیتوں کے تعلق سے لکھا ہے۔

''مجلس طرازی شعر وسخن، ودقیقہ پردازی ای فن را بدرجہ کمال رسا نیدومرجع ارباب معنی شد''۔

قبولؔ نے اس زمانے میں دلی کا رُخ کیا۔جب وہاں پر ایہام گوئی کی تحریک بڑے شد ومد سے جاری تھی۔ایہام سے مراد کسی شعر میں ایسا لفظ لے آنا، جو ذومعنی کا حامل ہو۔یعنی ایک قریب کا اور دوسرا بعید کا اور قاری کو پڑھتے وقت یہ دقت ہوجاتی ہے کہ کون سا معنی لیا جائے۔قبولؔ پر بھی ایہام گوئی کا بڑا اثر پڑا۔کہا جاتا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے فقر کی زندگی اختیار کر لی تھی۔قبولؔ کا تمام تر ادبی سرمایہ دست برد زمانہ کی نظر ہو چکا ہے اور یہ وہ بے نوا ہے جن کا صرف ایک شعر اردو تذکروں میں ملتا ہے۔جس کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی طبیعت کس قدر سلاست پسند، فصیح اور رواں تھی۔شعر ملاحظہ ہوں۔

دل یوں خیالِ زُلف میں پھرتا ہے نارہ زن
تاریک شب میں جیسے کوئی پاسباں پھرے

(عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو'' جلد دوم''صفحہ 48)

عبدالغنی قبولؔ کو مختلف تذکروں میں الگ الگ ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔شیفتہؔ نے ''گلشن بے خار'' میں غنی بیگ لکھا ہے۔مرزا قطب الدین باطن نے ''گلستانِ بے خزاں'' میں مرزا علی بیگ لکھا ہے۔علی ابراہیم خان خلیل نے ''گلزارِ خلیل''میں عبدالغنی قبولؔ تحریر کیا ہے۔قبولؔ کا انتقال 1725 کو دلی میں ہوا۔

پنڈت دیارام کاچرو خوشدلؔ:۔

پنڈت دیارام کاچرو خوشدلؔ کا شمار کشمیر میں افغان دور کے اہم انشاپردازوں میں ہوتا ہے۔وہ فارسی

زبان کے ایک قادرالکلام شاعر تھے۔خوشدلؔ کی پیدائش 1744 کو سرینگر کے ایک مشہور علاقہ رعناواری میں ہوئی۔خوشدلؔ نے متعدد موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے۔شعری اصناف مثلاً،غزل،قصیدہ،قطعہ،گیت کے علاوہ موسیقی سے بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔عبدالقادر سروری ان کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

> ’’افغان حکمرانوں نے،خوشدل کے علم وفضل اور انشا میں کمال کی وجہ سے ان کی قدردانی کی،چنانچہ تیمور شاہ کے میر منشی مقرر ہوکر وہ کابل گئے۔۔۔۔۔۔اپنے مربیوں کی مدح میں انہوں نے کئی قصیدے بھی لکھئے ہیں۔ وہ غزل بھی اچھی کہتے تھے اور دو رسالے’’بہارِسخن‘‘اور’’گلزارسخن‘‘ بھی ان کی یادگار ہیں‘‘۔(3)

خوشدلؔ کی یادگار ان کی ایک ذاتی بیاض ہے۔جس میں انہوں نے اپنے پسندیدہ اشعار کا اندراج کیا ہے۔ان کا مشہور شعر جسے کشمیر میں کسی کشمیری الاصل کا لکھا ہوا پہلا اردو شعر سمجھا جاتا ہے اور اس شعر کی مقبولیت کا احساس اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کشمیر کے قبرستانوں میں مدفن لوگوں کے بیشتر کتبوں پر خوشدلؔ کا یہ شعر کندہ کیا ہوا ہے۔

آئے تھے ہم مثل بلبل سیرِ گلشن کر چلے
لے لو مالی باغ اپنا، ہم تو اپنے گھر چلے

یہاں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس شعر کا متن الگ الگ لوگوں نے مختلف طریقوں سے تحریر کیا ہے۔مذکورہ بالا شعر کا متن جوہر قدوسی کی کتاب’’گلدستہ اردو‘‘اشاعت2009 سے لیا گیا ہے اور یہی متن بیشتر کتبوں پر لکھا ہوا ملتا ہے۔اس کے برعکس عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب’’کشمیر میں اردو‘‘ جلد دوم میں درج ذیل متن تحریر کیا ہے۔

آگئے تھے مثل شبنم، سیر گلشن کر چلے
باغباں تو دیکھ لے اپنا چمن ہم گھر چلے

ان دومتون سے بالکل الگ متن محمد یوسف ٹینگ نے تحریر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

''کشمیر میں اردو کی ارتقا کی کہانی کا مطالعہ کرنے والوں کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ کشمیر کے دورِ ظلمت میں جو انیسویں صدی کی ابتدا سے اس کے وسط تک خاص طور پر بے حد قہر ساماں رہا۔یہاں منشی دیا رام کاچرو خوشدل جیسے شاعر موجود تھے جو اردو کے ایسے موتی لئے ہوئے شعر نکال سکتے تھے''۔

آئے تھے مثل صبا ہم سیر گلشن کر چکے
لے لو مالی باغ اپنا ہم تو اپنے گھر چلے(4)

بیاض میں شامل ایک قطعہ بھی یہاں درج کیا جاتا ہے۔

یہ آبِ زر لکھا ہے بوعلی نے مدارِ دارِ دنیا سفر ہے
کہ سونے سے مسافر کوں خطر ہے کہ عمر بے وفا اندر گزر ہے

چند قطعات کے علاوہ کچھ گیت بھی لکھے ہیں۔ایک گیت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اُٹھو میرے لالہ مدن گوپالہ آیا تیرا بالہ بلاونہ کر
دودھ،مکھن،روٹی چوپٹ کی دیوانگی بنسی بجاونہ کو
جاگیو گوپالہ،لالہ پنچھی بند بولے جاگیو پنچھی بولہ لالہ پنچھی ہنسے

خوشدلؔ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ انھیں زندگی کے آخری ایام میں ملک بدر کیا گیا اس لیے یہ بات افسوس کے ساتھ لکھنی پڑتی ہے کہ ان کی سوانح باوجود سعی بسیار معلوم نہ ہوسکی۔صرف اس قدر دریافت ہو

سکا کہ 1744 میں پیدا ہوئے۔لیکن معلوم نہیں کہ کس سن میں آپ نے انتقال فرمایا۔

محمودؔ گامی:۔

محمودؔ گامی کشمیری زبان کے ایک کہنہ مشق شاعر گزرے ہیں۔ان کا سنِ پیدائش 1756 ہے۔محمودؔ نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے،لیکن مثنوی ان کا خاص میدان ہے۔ان کی مشہور کشمیری مثنویوں میں،شیریں فرہاد،لیلیٰ مجنوں،محمود غزنوی،یوسف زلیخا،شیخ منصور،ہارون رشید وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مثنویاں کشمیر کے لوگوں میں بہت ہر دل عزیز رہ چکی ہیں اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان مثنویوں کو محفلوں میں پڑھ پڑھ کر یا سُن سُن کر فراغت کے لمحات گزارتے رہیں۔محمودؔ کی یہ چند مثنویاں ان کے شاعرانہ کمالات کا بین ثبوت ہے۔ان کی ایک مثنوی ''عشق بازی نوراللہ خان'' کا پتہ بھی ملتا ہے۔جس میں اردو زبان میں لکھا گیا ایک بند مسدس کی شکل میں لکھا ہوا ہے۔

سنو فریاد میری ہے خدایا
سجن پر کیا ہوا آج کیوں نہ آیا
کدھر چلتا؟ کہاں؟ ہم کیا کروں گا
اس کی خاطری آج میں مروں گا
ہمارا کیا لیا کیا لے لیا دل
اسی کو چارہ مانگو وقت مشکل

محمودؔ کی کشمیری مثنویوں میں سے یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ مشہور جرمنی مستشرق بیلر (BELAR) نے جرمنی زبان میں کیا ہے۔

محمودؔ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے فارسی زبان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔جس کا ذکر

غلام نبی خیال کاشمیری نے اپنی کتاب ''محمود گامی'' میں کیا ہے۔اس کتاب کو جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی کی مالی معاونت سے شائع کیا گیا ہے۔اس کتاب کی عدم موجودگی کے سلسلے میں حبیب کیفوی ،مصنف،کشمیر میں اردو،1979 کے بیان کی تائید میں ایک اردو غزل بھی شامل ہے۔ساتھ ہی ان کا دعوٰی ہے کہ یہ کشمیر میں لکھی گئی پہلی اردو غزل ہے۔

الصنہ للہ کہ مرا یار اچھا ہے
وز ماہ رخان ماہ من بسیار اچھا ہے
جانانہ زلیخا نہ چو مستانہ بر آمد
اکھیاں کو جو دیکھوں تو خمار اچھا ہے
صد پارہ کند خارہ رہے تیر نگارش
مژگان و دو ابروئے کماں دار اچھا ہے
بر برگ گل تازہ عرق دانہ شبنم
در لعل لبش گوہر شہسوار اچھا ہے
شیریں دو انارش بکنار سمن او
پروردہ پئے عاشق بیمار اچھا ہے
مستانہ ز احوالِ اسیران بہ تغافل
درکار خود ہشیار وہ سرکار اچھا ہے
از پیر خرد دوش شنیدم بعد ہوش
محمود بگو شعر شکر بار اچھا ہے

یہ بنیادی طور پر عشقیہ غزل ہے۔جس میں شاعر نے اپنے محبوب کا خدوخال اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔جسے ہم دوسرے الفاظ میں سراپا نگاری کہتے ہیں۔اس غزل کو پڑھ کر شبہ ہوتا ہے کہ اس شاعر نے اس کے علاوہ بھی کافی اردو اشعار نظم کیے ہونگے مگر افسوس کہ ان کو محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔محمودؔ کی سنِ وفات کے بارے میں یہ عام خیال ہے کہ وہ 90 سال کی عمر پا کر 1855 میں اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئے۔

میر کمال الدین حسین اندرابی رسواؔ:۔

نام،کمال الدین اور رسواؔ تخلص کرتے تھے۔ان کا شمار سترہ ویں صدی کے اہم انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔وہ اورنگ زیب کے دور اقتدار میں دلی سے ہجرت کر کے کشمیر چلے آئے تھے۔انہیں افضلؔ پانی پتی اور فضلیؔ کے معاصرین میں شمار کیا جائے گا۔ان کا کلام ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا۔لیکن ان کے شاگردِ عزیز لچھی رام نے ان کے تمام رقعات کو اکھٹا کر کے ''رقعات خاتم الکمال'' کے نام سے موسوم کر کے شائع کیا ہے۔جس میں ان کی کچھ نظمیں اور غزلیں ریختہ کی شکل میں ملتی ہیں۔جو اُس زمانے کا خاصہ تھا۔پروفیسر قدوس جاویدان کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

> ''میر کمال الدین حسین رُسواؔ مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر(وفات 1707) کے فرزند شہزادہ محمد اکبر کے حلقہ مقربین میں شامل تھے لیکن جب بعض مفاد پرست درباریوں کے بہکاوے میں آ کر شہزادہ محمد اکبر نے اپنے والد اورنگ زیب کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو میر رسواؔ کشمیر لوٹ آئے۔میر رسواؔ کے خطوط کا مجموعہ ان کے ایک شاگرد لچھی رام ولا پرداس ملتانی

نے ''رقعات خاتم الکمال'' کے نام سے رسؔوا کی وفات کے 49
برس بعد 26 جمادی الاول 1181ھ کو تدوین کیا''۔(5)

میر کمال الدین رُسوا کو کشمیر کا پہلا اردو غزل گو شاعر سمجھا جاتا ہے۔اس تعلق سے ڈاکٹر فرید پربتی لکھتے ہیں۔

''جموں وکشمیر میں اردو شاعری کے ترقی یافتہ روپ کے ڈانڈے صحیح معنوں میں میر کمال الدین حسین اندرابی رسؔوا سے ملتے ہیں۔ان کی شاعری میں اُس دور کے دیگر شعرا کی طرح قدیم اور دکنی الفاظ کا امتزاج پایا جاتا ہے۔سلاست اور بندشِ الفاظ اُن کی شاعری کے خاص اوصاف ہیں''۔(6)

اس سلسلے میں دورائے بھی نہیں ہوسکتی ہیں۔کیونکہ یہ وہ شاعر گزرے ہیں جن کے ہاں ایک تو اُس دور کا شعری مزاج ملتا ہے اور دوسری خاصیت یہ کہ ان کے ہاں سے ہمیں مکمل غزلیں دستیاب ہوتی ہیں۔ایک مکمل غزل کے لئے کم سے کم پانچ اشعار کا ہونا لازم ہے۔اس طرح سے اگر دیکھا جائے تو ان سے پہلے ریاست میں کوئی ایسا نام نہیں ملتا ہے جن کے ہاں اس طرح کا التزام دیکھا جا سکے اور ساتھ ہی ساتھ زمانی لحاظ سے بھی انہیں تقدم حاصل ہے۔رسؔوا کی جو غزلیں ریختہ کی شکل میں دستیاب ہوئی ہیں۔ان کا اندراج ضروری سمجھتا ہوں۔

محبت پیت معشوقوں میں کم ہے
نہ از عشاق پروا ہے نہ غم ہے
نہیں یک لحظہ از یاد تو غافل
تمہارے سینے میں دل دمبدم ہے

بہت مشتاق ہیں تیرے ولیکن
ٹھکانے سے محبت دو ٹوک کم ہے
اے کوئی جہاں میں یار کم ہے
اگر ہے یار،بے آزار کم ہے
ندیدم بے جفا یک بے وفا را
دریں گلشن، گل بے خار کم ہے
دلی دادم و غمہا!خریدم
جگت میں پیت سا پیار کم ہے

﴿غزل نمبر2﴾

جان اس لٹک اوپر فدا ہے
ستم گر بے وفا، یہ کیا ادا ہے
بیک نظارہ دل داد یم از است
وفا دشمن، جفا خو ہے، بلا ہے
بمسکیں دِل، بہ دیدار کی بھیک
گدا ہے، بے نوا ہے، بے خدا ہے

﴿غزل نمبر3﴾

امشت صنم کے واسطے جان و تنم در جنگ ہے
ساز طپیدَن۔۔۔۔۔۔۔۔۔آہنگ ہے

از دیدہَ خونبار من وزنا لہائے زارِ مَن
اندر سر اے تار من، سب جوش ہے، سب رنگ ہے
دوری کر از چشم ترم و ز چشم زاد سر۔۔۔!
اما دل غم پروردم تجھ سنگ دل کے سنگ ہے
با غیر الفت تا کجا از یار وحشت تا بکی!
سب سوں وفا ہم سوں جفا اے بے وفا کیا دھنگ ہے
کو باش اصدرعاشقاں مجھ سا بلا گرداں ہے
ہر چند از عشق چو من تجھ بے وفا کو تنگ ہے
تا رفتہ از دیدہ ام با کس نبارا میدہ اَم
از جملہ جگ رنجیدہ ام، با کامیابم جنگ ہے

ان غزلوں کے علاوہ ایک غزل کا صرف ایک شعر دستیاب ہوا ہے۔

کمر بستی بخونِ بے گناہاں
خدا سیں ڈر، خدا سے ڈر، خدا سے

مذکورہ بالا فارسی زبان کے زیرِ سایہ اُبھرنے والے شعرا کے علاوہ اس دور کی شعری فضا اور بھی کئی ناموں سے معمور ہے۔ جن میں لکھن جونا گامی بلبل، پر مانندؔ، واسہ کول وگرہ بلبلؔ، کشن راز دان، رسول میرؔ، محمد علی حشمتؔ، محمد امین امینؔ، کشن چند مجروحؔ، احسن اللہ خان بیانؔ، حفیظؔ کاشمیری، اجودھیا پرشاد حیرتؔ وغیرہ کے نام قابلِ فخر ہیں۔

یہاں سے اب ہم اُس دور کے شعرا کی طرف رُخ کریں گے، جب ریاستی حکومت نے 1889

میں ایک بہترین منصوبے کے تحت اردو کو سرکاری زبان کے منصب سے سرفراز کیا۔اس دور کے شعرا نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی اور انسان کے ذاتی حالات ونفسیات کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ملکی سطح پر رونما ہونے والے مختلف ادبی رجحانات کا اثر قبول کرتے رہیں۔اس تعلق سے مظفر حنفی لکھتے ہیں۔

''ان شاعروں نے اپنے عہد کے مختلف ادبی رجحانات اور شعری روایات سے متاثر ہو کر مختلف النوع شعری تجربے کئے۔اس سے ان کی عصری آگہی اور شعر و ادب میں تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہو جاتا ہے''۔(7)

ریاست جموں وکشمیر کے مستقل باشندوں کے علاوہ بیرونی ریاستوں سے آنے والے اشخاص نے بھی یہاں کی ادبی فضا میں چار چاند لگا دیئے، جن میں خوشی محمد ناظرؔ، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی، اثر لکھنوی، محمد دین تاثیر، زبیر رضوی، کمال احمد صدیقیؔ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔یہ سب لوگ ریاست میں اردو ادب کا مرتبہ بلند کرنے میں جڑے رہیں۔اس سلسلے میں فرید پربتیؔ لکھتے ہیں۔

''وہ نظم نگار جو غیر مقامی ہیں البتہ یہاں کی ادبی فضا کو اپنی زمزمہ سنجیوں سے معمور کر چکے ہیں اُن میں خوشی محمد ناظرؔ، پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفیؔ، محمد الدین تاثیرؔ، اثر لکھنوی، کمال احمد صدیقی، فیاض رفعت، مظہر امام، زبیر رضوی قابلِ ذکر نام ہیں۔''(8)

ان ادبی شخصیات کے علاوہ جو نامور ادبا وشعرا یہاں کی ادبی محفلوں میں شریک ہوتے رہیں۔ان میں جگر مراد آبادی، سیمابؔ اکبر آبادی، پنڈت لبھو رام جوش ملسیانیؔ، مولوی عبد الحق، علامہ اقبالؔ، حفیظ جالندھریؔ، اسرار الحق مجازؔ، ڈاکٹر جعفر رضا، علی سردار جعفریؔ، ڈاکٹر مسعود حسین خان، پروفیسر عالم خوندمیری،

کبیر احمد جانبسی وغیرہ کے نام نامی قابلِ بیان ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کا سب سے بڑا اختصاص اس کی قدرتی خوبصورتی ہے۔اس خوبصورتی کا نظارہ کرنے کی خاطر دنیا بھر سے لوگ یہاں تشریف لاتے رہیں۔جن میں عاشق بھی ،معشوق بھی ،رقیب بھی ، شفیق بھی ،زاہد بھی ، پاک بھی ،رند بھی ،اور ہند سے آئی ہوئی مختلف ادبی شخصیات شامل ہیں اور یہ لوگ یہاں پر اپنے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے کی خاطر مختلف ادبی محفلوں کا انعقاد کراتے رہیں۔جس سے ریاست کے ادبی مزاج کو فروغ ملتا رہا۔اس تعلق سے مظہر امام لکھتے ہیں۔

''برصغیر ہندو پاک کے علمی وادبی طبقوں کے لئے یہ سرزمین ایک زیارت کدہ بن گئی چنانچہ برصغیر کے ادبا وشعرا بھی ہر سال اس گل کدے میں پہنچ کر اپنی محفلیں سجاتے رہے اوران کی موجودگی سے یہ سرزمین دارالشعرا بن جاتی رہی''۔(9)

اس دور کے ریاستی شعرا وادبا اپنی ذہانت وفطائت اور صلاحیتِ علمی وذوقی میں ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں قدرے آگے تھے۔مولوی عبدالحق نے 1940 میں ریاست میں ایک ادبی اجتماع سے مخاطب ہونے کے فوراً بعد یہاں پر انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایک شاخ قائم کرنے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں ریاست اردو کا مرکز بن گئی۔مولوی عبدالحق یہاں رہ کر پرجا سبھا میں کی گئی تقریروں سے اتنے متاثر ہوئے کہ واپس جا کر دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس کی تقریب میں اپنی رپورٹ میں کشمیر کے اردو داں طبقے کے بارے میں لکھا ہے۔

''شاید ہندوستان کے کسی صوبے میں اردو اس قدر مقبول اور رائج نہیں جس قدر کشمیر میں ہے۔مدارس میں اردو پڑھائی جاتی ہے اور ذریعہ تعلیم اردو ہے۔دفاتر کی زبان بھی اردو ہے اور بہت اچھے

اردو کے ادیب اور شاعر موجود ہیں۔ وہاں کی اسمبلی کے اجلاس کو
بھی جا کر دیکھا ہے سب ممبر بلا استثنا اردو میں بلا تکلف تقریریں
کرتے تھے۔ یہ سُن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ پنجاب اسمبلی میں ایسی
اچھی اردو کی تقریریں نہیں ہوتیں''۔(10)

انجمن ترقی اردو کی شاخ کے قیام سے کچھ اردو شعرا بیرونی ریاستوں سے آئیں، کچھ یہاں پر پیدا ہوئے اور اس طرح مشاعروں و محافل کے منعقد کرنے کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ جس نے یہاں پر ذوقِ شاعری کو خوب چمکایا اور اس دور میں یہاں اردو کی بڑی گرم بازاری دیکھنے کو ملتی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں موجود اس دور کے شعرا کی درجہ بندی کرتے ہوئے بڑی خامی اور مشکل یہ ہے کہ ان کے بارے میں یہ معلوم کرنا بہت دشوار ہوگیا ہے کہ یہ کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ ساتھ ہی یہ بات افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ ان اشخاص کی سوانح عمری مفصل نہیں ملتی اور اگر ایسے اشخاص کسی اور ملک میں پیدا ہوئے ہوتے، تو شاید ان کے سوانح کوائف اس قدر مفصل لکھئے گئے ہوتے کہ ان کی اصلی تصویر کا ایک ایک خط و خال ہماری نظروں کے سامنے آجاتا۔ بہر حال ان شعرا کے تعلق سے جو معلومات میسر ہوئی ہیں آگے ان کے اندراج کا خاص خیال رکھا جائے گا۔

حسن علی تنہاؔ انصاری:۔

تنہاؔ انصاری ریاست جموں وکشمیر میں 1947 سے پہلے کے شعرا میں ایک اہم نام ہے۔ ان کی پیدائش 1914 میں ہوئی۔ تنہاؔ کا اصل نام حسن علی تھا اور تنہاؔ تخلص کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والد مہا راجہ گلاب سنگھ کے دور میں کشمیر وارد ہوئے اور ضلع بڈگام کے ایک علاقہ ماگام میں قیام کیا۔ لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر 1910 میں نقل مکانی کر کے دلنہ بارہمولہ چلے گئے، جہاں ان کا خاندان آج بھی مقیم ہے۔ تنہاؔ نے

اپنی ابتدائی تعلیم ضلع بارہمولہ کے قصبہ سوپور میں حاصل کی۔ یہ علاقہ علم و ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ تنہاؔ نے یہاں سے بی۔اے کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ فاضل اورادیب فاضل کی ڈگریاں بھی حاصل کی۔

تنہاؔ نے اس وقت شاعری کرنی شروع کی۔ جب ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا پہلا سنگِ میل ''انگارے'' کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ اس دور میں تنہا نے تنِ تنہا ڈوگرہ حکمرانوں کے مظالم کے خلاف آواز اُٹھائی۔ تنہاؔ کے معاصرین میں غلام محی الدین حاجنیؔ اور نظر لولابیؔ تھے۔ یہ دونوں اپنے وقت کے اچھے شعرا میں شمار کیے جاتے تھے۔ تنہاؔ انصاری کا بیش تر ادبی سرمایہ زمانہ برد ہو چکا ہے۔ لیکن ان کے بھتیجے ضمیر انصاری نے ان کے کچھ کلام کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ضمیر انصاری کے مطابق تنہاؔ اردو کے علاوہ کشمیری، عربی اور فارسی زبانوں میں بھی شاعری کرتے تھے۔

تنہاؔ ایک اچھے مدرس بھی تھے۔ وہ خود تدریسی پیشے سے منسلک ہونے کے علاوہ اساتذہ کے لیے کتابیں لکھتے رہے تاکہ ریاست کا تعلیمی نظام بڑھ جائے۔ انہوں نے اساتذہ کے لیے ''صحیح اردو بولیں'' اور ''تعلیمِ زبان'' کے نام سے دو کتابیں تحریر کیں۔ جو کئی سالوں تک بی۔ایڈ کے سیلبس میں شامل تھیں۔ تنہاؔ انصاری کو ریاست جموں و کشمیر میں تعلیمی ڈھانچے کو مستحکم کرنے کے صلے میں 1960 میں best teacher award سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ انھیں اس وقت کے صدرِ ہند ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کے بدست تفویض کیا گیا۔

تنہاؔ انصاری کو خطوط نویسی میں بھی اچھا رتبہ حاصل تھا۔ وہ ریاست کے مشہور شعرا کے علاوہ بیرونی ریاستوں کے شعرا و ادبا کے نام بھی خطوط لکھتے رہیں۔ تنہاؔ کے ان تمام خطوط کو ان کے چھوٹے بھائی نشاط انصاری نے جمع کر کے ''خاطرِ احباب'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

تنہاؔ نے اردو کے علاوہ کشمیری زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ ان کی کشمیری شاعری کا مجموعہ ''فرات''

کےعنوان سے شائع ہو چکا ہے۔جس پر جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی نے انہیں best book award سے نوازا ہے۔تنہاؔ انصاری کا اردو شعری مجموعہ ''شبنمستان'' کے عنوان سے 1972 میں شائع ہوا ہے۔تنہاؔ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ پر کشش انفرادیت کے مالک تھے۔تنہاؔ رومان پرور شاعر تھے۔ان کے یہاں رومانیت کی جو مثال نظر آتی ہے وہ ہمارے ذہن کواختر شیرانی کی رومان پرور وادیوں میں سیر کرنے کے لیے اُکساتی ہے۔جہاں کبھی سلمیٰ،کبھی ناہید تو کبھی بلقیس نظر آتی ہے۔خوشی و غم،اُمیدو نا اُمیدی انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں،لیکن تنہاؔ کے ہاں ان کا ایسا امتزاج ملتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے میں مل کر ذم ہو جاتے ہیں۔رشید نازکی اپنے ایک مضمون ''تنہاؔ انصاری،ایک تعارف'' میں لکھتے ہیں۔

> ''وہ اتفاقات اور رعایات کی سیڑھی سے ایسے عروج پر نہیں پہنچا ہے جہاں وہ اپنی اصلیت کو بھول جاتا۔نہ حادثات اور آلام کی الم ناکیوں نے اسے برجِ مصائب میں اس طرح محصور کیا ہے کہ اسے پہچاننا مشکل ہو جائے۔وہ متوازن زندگی کی ایک طویل داستان ہے''(11)

تنہاؔ انصاری بڑے حساس واقع ہوئے ہیں۔انسان دوستی اور ہمدردی ان کا خاندانی مسلک تھا۔تنہاؔ ہر انسان کے اندر اچھائیاں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے تھے۔کہا جاتا ہے کہ وہ جس سے بھی ملتے خوش اخلاقی سے پیش آتے ۔ریاکاری کا عنصر ان میں نہیں تھا۔تنہاؔ انسانی حیات کے اسرار ورموز پر سوچنے کے قائل تھے۔ان کے گھر کا ماحول بڑا مذہبی تھا۔تنہاؔ کے والد ایک درویش منش بزرگ تھے۔جس کا براہ راست اثر تنہاؔ کی زندگی پر پڑا۔تنہاؔ نے سب سے پہلے نعت گوئی کی طرف توجہ دی اور اپنے مشاہدات وکیفیات کو نعت کا پیکر عطا کیا،ساتھ ہی اپنے روحانی اثرات وکیفیات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

یارب مجھے بنادے دیوانہ محمد ﷺ بیگانۂ خدا ہے بیگانۂ محمد ﷺ

مے عشقِ احمدی کی ساقی مجھے پلادے ہوجائے تا کہ ہر رگ مستانۂ محمد ﷺ

یہ اشعار تنہاؔ کی عقیدتِ رسولؐ کی علامت اور حضور اکرمؐ سے ان کی والہانہ شیفتگی کے عکاسی اور جذب و مستی کا رنگ لیے ہوئے ہیں۔اسی دور میں لکھی گئی ان کی ایک غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

عالمِ ہستی میں برگشتہ میری تقدیر ہے
ہو چکا بے کار ثابت ناخنِ تدبیر ہے

اس شعر میں ناخنِ تدبیر کی بے کاری کی تعبیر انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔کیونکہ انسان پر جب کوئی مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے۔تو وہ اسے اپنی قسمت سمجھتا ہے۔یعنی انسان ہر بُری چیز کو قسمت سمجھتا ہے اور ہر اچھی چیز کو اپنی کارستانی۔اگر دیکھا جائے تو یہ تنہاؔ کا خاص رنگ نہیں ہے بلکہ عنفوانِ شباب میں دماغ کی تاروں سے غیر شعوری طور پر ایسی آواز نکلی ہے۔

تنہاؔ محبوب کے فراق میں تڑپتے ہیں،مگر وہ اس چیز کو کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتے ہیں۔لیکن اس مغموم کیفیت کو آشکار کرنے کے لیے انسان کے اندر ایک مخبر چُھپا ہوا ہے۔بقولِ علامہ اقبال ؎

مبتلائے درد کوئی عضو ہو تو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

یعنی انسانی پیکر کا کوئی بھی جُز جب کسی درد میں مبتلا ہوتا ہے تو آنکھ سے نکلنے والے آنسوں اس کا پتہ دیتے ہیں۔تنہاؔ کہتے ہیں کہ میں اپنے محبوب کے فراق میں تڑپنا کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن میرے آنسوؤں نے یہ راز کھول دیا۔

کُھل گیا جو بھید تنہا اُن کی بزمِ ناز میں
چشمِ گریاں کی خطا ہے میری کیا تقصیر ہے

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ تنہاؔ انصاری کا بیشتر ادبی سرمایہ پُر آشوب حالات کے نظر ہو چکا ہے۔ خاص کر 1932 سے لیکر 1947 تک کا سارا کلام تقسیمِ ہند کے ہنگاموں کی نظر ہوا ہے۔ کیونکہ اس دور میں تنہاؔ کا جائے مقام دلنہ (بارہمولہ) بُری طرح سے متاثر ہوا تھا۔ اس دور میں لکھی گئی ان کی ایک نظم ''میری ناہید مجھ کو بھول جاؤ'' 1939 کا پتہ چلتا ہے۔ اس دور میں تنہاؔ کی زندگی اور شاعری میں زبردست تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ وہ خیالوں کی دنیا سے نکل کر حقیقی زندگی سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے محبوب ناہید کی خیالی دنیا سے فرار پا کر کسی اور اضطراب میں جگہ ڈھونڈتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تنہاؔ محسوس کرنے لگتا ہے کہ 'اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا'۔ محبوب کا خیال عاشق کے دل و دماغ سے بآسانی دور نہیں ہوسکتا ہے مگر وقت ایک انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور محبوب سے التجاء کہنا پڑتا ہے۔

محبت کی کہانی بھول جاؤ
خلش ہائے جوانی بھول جاؤ
وہ رنگین زندگانی بھول جاؤ
تمہاری مہربانی بھول جاؤ
میری ناہید مجھ کو بھول جاؤ

اس بند میں ایمائیت کا عنصر شامل ہے۔ ایمائیت سے مراد ہے، دوسروں پر چھوڑ دینا۔ تنہاؔ محبوب کو ماضی کی بھول بھلیوں سے باہر آنے کی تلقین کرتا ہے۔ دراصل بھول جانے کی یہ تمنا اور التجا محبت کو یاد رکھنے کی گزارش سے کم نہیں ہے۔ دنیا نے دکھا دیا ہے کہ جب بھی انسان حقائق ہائے شیریں کی کھوج میں نکلا ہے، تو کسی شیریں، ناہید، سلمٰی، بلقیس، میرزا، لیلا وغیرہ کی یادوں نے اس کے جگر کو عشق و عاشقی کا درپن بنایا ہے۔ دیکھا جائے تو حسن و عشق اردو شاعری کا ایک اہم موضوع رہا ہے اور یہ ہمیشہ رہے گا۔ لیکن جب ملکی

حالات ناسازگار ہوتے ہیں تو ایسے دور میں حسن وعشق کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی ہے بلکہ ان حالات سے مقابلہ کرنے کی خاطر ہمیں اپنے محبوب کو بھی ساتھ لینا پڑتا ہے اور اگر وہ ساتھ چلنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو ایسے حالات میں ہمیں اسے نظر انداز کرنا چاہئے۔ تنہاؔ اپنے محبوب کو خوابوں اور خیالوں میں بھی نہ آنے کی تلقین کرتا ہے۔

بُھلا دو چاندنی راتوں میں آنا
تبسم سے وہ اک بجلی گرانا
وہ پریوں کی طرح دل کا چُرانا
ستانا چھیڑنا، ہنسنا ہنسانا
میری ناہید مجھ کو بھول جاؤ

شاعر کو اپنی زندگی کے مثلِ گلشن ہونے پر ناز ہے۔لیکن اس کے ختم ہونے کا بھی غم ستاتا ہے۔اس نظم میں تجاہلِ عارفانہ کا اچھا استعمال ہوا ہے۔

غلط کہتی ہو پیاری میں جوان ہوں
نہیں معلوم میں کیا ہوں کہاں ہوں
میں گلشن ہوں مگر وقفِ خزاں ہوں
ہلاکِ شیوہ نازِ بُتاں ہوں
میری ناہید مجھ کو بھول جاؤ

اس بند میں تجاہل عارفانہ کی وہ کسک محسوس ہوتی ہے کہ شاعر جان بوجھ کر انجان بننا چاہتا ہے اور اپنی ناہید کو بھول جانے کی التجا کرتا ہے۔

تنہاؔ انصاری کی ایک اور نظم بعنوان ''کسی کی یاد'' نظم ''میری ناہید مجھ کو بھول جاؤ'' کی متضاد شکل نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہاں تنہاؔ اپنے محبوب کو یہ التجا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ''مجھے بھول جاؤ''۔ لیکن نظم ''کسی کی یاد'' میں اپنے محبوب کی یاد میں تڑپنے کا غم بیان کیا گیا ہے اور ماضی کی کھوئی ہوئی کچھ حقیقتوں کو یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہ پہلے کی طرح دل کی کلی کھل کر نکھرتی ہے
نہ کوئی رس بھری آواز اب دل میں اُترتی ہے
وفا سینے میں چُپ، اظہارِ ہمدردی سے ڈرتی ہے
کبھی مرمر کے جی اُٹھتی ہے پھر جی جی کے مرتی ہے
یہ کس کی یاد مجھے ہر گھڑی بے چین کرتی ہے!

شاعر کی یہ بے چینی دراصل اپنے محبوب سے والہانہ عقیدت کا اظہار ہے۔ وہ اپنے محبوب سے کہنا چاہتا ہے کہ میری اس بے چینی کا بنیادی سبب تم ہی ہو۔ شاعر اپنے محبوب کی جدائی میں اس قدر نڈھال دکھائی دیتا ہے کہ اب وہ اپنے محبوب کے بچھڑ جانے کا غم کسی سے نہیں کہہ پاتا۔

نہ احساساتِ رنگین کی سنہری رو میں بہتا ہوں
نہ اپنے دل سے اب چُپ کے کوئی بات کہتا ہوں
میں تنہا اپنی ایک اُجڑی ہوئی دنیا میں رہتا ہوں
بظاہر چُپ ہوں گو آلام پہ آلام سہتا ہوں
یہ کس کی یاد مجھ کو ہر گھڑی بے چین کرتی ہے

اس نظم میں صنعت استفہامیہ سے کام لیا گیا ہے۔ شاعر پہلے غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتا ہے جب

کہ اسے اس بے چینی کا سبب معلوم ہے۔شاعر ہر بند کے آخر میں سوال کرتا ہے، یہ کس کی یاد؟ جو دراصل اس کے محبوب کی یاد ہے۔ جو شاعر کو ہر وقت بے چین کر دیتی ہے۔

تنہاؔ اپنی زندگی میں مختلف آزمائشوں سے گزرے ہیں۔کبھی انہیں غم جاناں ستاتا ہے تو کبھی غمِ دوراں کی مختلف آزمائشیں گھیر لیتی ہیں۔اب شاعر غمِ جاناں کی رعنائیوں کو بھول کر محفلِ کائنات کی روایات جان کر نئی وارداتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنی زندگی کے پرُ آشوب دور کو بدلنے کی خاطر گلشنوں اور لالہ زاروں سے رخصت چاہتا ہے۔

سُدھارو خدا کے حوالے سدھارو
میری آرزؤں کے رنگین بہارو

پُر آشوب اس دور کی زندگی ہے
خُدا حافظ اے گلشنو لالہ زارو

شاعر بنی نوع انسان کی غلامی کے سخت خلاف ہے۔وہ ایک انسان پر ہو رہے مظالم کے خلاف آواز اُٹھاتے ہوئے سوال کرتا ہے۔

ہے مُرغ تہِ دامِ انسانیت کیوں
اے انسان کی آزادیوں کے سہارو

ایک انسان کو جب غلامی کی زنجیر میں جھکڑ دیا جاتا ہے۔تو وہاں اس کی زبان پر تالا اور قلم پر روک لگا دی جاتی ہے اور یہ سب کام سیاست کا ہوتا ہے۔شاعر سیاستدانوں کو زبان و قلم کے پہرے داروں سے تعبیر کرتے ہوئے پوچھتا ہے۔

زبان و قلم پر یہ پہرے ہیں کب تک
کہو تم ہی دستِ سیاست کے مارو

غمِ دوراں کی یہ دھڑکنیں بڑی وضاحت سے ساقی میں سنی جاسکتی ہیں۔ یہ دراصل شاعر کے ارمانوں کا المیہ ہے۔ اس کے فکر واحساس کے داغ داغ اجالوں میں آرزوؤں کی سسکتی صحبتیں دم توڑ رہی ہیں۔ شاعر کو ہر طرف مصائب ومشکلات کی لہریں نظر آتی ہیں۔ زندگی کی ہر حسین شے میں ایک ناشائستہ کیفیت نظر آتی ہے۔ رنج والم کے اس طوفانی دور میں شاعر کو فکر واحساس کی پریشانی سے زیادہ روح وضمیر کے جنجال کا غم ہے۔ تنہاؔ نہ صرف فریاد کُناں ہے بلکہ ان کے کلام میں ایک گھن گرج ہے۔ وہ بڑے ہی اعتماد کے ساتھ زمانے کی ستم ظریفیوں پر چوٹ کرتے ہیں۔

نہ پوچھ ہم جیتے ہیں کیوں کر تیری رنگین دنیا میں
سُسکتی زندگی ہے اور زبان خاموش ہے ساقی
یہ کس نے کہہ دیا تجھ سے میرے ہاتھوں میں بربط
یہاں سرفرطِ گریہ سے وبالِ دوش ہے ساقی
توقع تجھ سے کیا تیری جفاؤں کی شکایت کیا
سِتم ایجاد گردوں بھی اذیت کوش ہے ساقی

تنہاؔ انصاری کی زندگی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر نئی مصیبت سے ایک نیا حوصلہ پالیتے ہیں۔

چمن میں آج تک کیا ہم پہ بیتی یاد ہے مجھ کو
چلو اک بار پھر چرخِ کہن کی آزمائش ہے

الغرض کہا جاسکتا ہے کہ تنہاؔ کے اندازِ فکر ونظر میں بڑی بے باکی ہے۔ وہ اپنی بات کو چھپانا گناہ سمجھتے

ہیں۔شاعر کرب وبلا کے طوفانوں میں گھبراتا نہیں بلکہ للکارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

حسینیت ہے میری فطرتِ بے باک میں شامل
تجھے ناحق میرے کرب ومحن کی آزمائش ہے

نندلال کول طالبؔ کاشمیری:۔

پروفیسر پنڈت نندلال کول طالبؔ کاشمیری، انگریزی، فارسی اور اردو کے ایک نامور ادیب گزرے ہیں اور ان کی یہ فضیلت سندی ہے۔ کیونکہ وہ ایم۔اے، منشی فاضل اور ادیب فاضل کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔طالبؔ کاشمیری کا بچپن ہی سے شعروشاعری کی جانب میلان طبع تھا۔وہ بچپن ہی سے مختلف شعرا کی ادبی مصروفیات اور کارگزاریوں کو دیکھتے اور سمجھتے رہے جس سے ان میں شعرگوئی کا شوق پیدا ہوا۔طالبؔ نے اردوادب کی مشہور شخصیات سے اکتسابِ فیض حاصل کیا ہے۔جن میں دربارلکھنو کے مدیر منشی رام سہائے تمنّا، مولانا سید احمد حسن شوکت میرٹھی اور پنڈت دتاتریہ کیفی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔لیکن پنڈت دتاتریہ کیفی کی صحبت نے سونے پہ سہاگہ جیسا کام کیا ہے۔انہیں کی شاگردی میں رہ کر طالبؔ نے شاعری کرنی شروع کی، جس کے معترف وہ خود ہے۔

حضرت کیفی کی شاگردی پر نازاں کیوں نہ ہوں
میں ہوا طالب تو بخشا فیضِ روحانی مجھے

نند لال کول طالبؔ کاشمیری کی پیدائش 28/دسمبر 1899 کو کشمیر کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے کیا لیکن بہت جلد شاعری کی طرف مائل ہوئے۔طالبؔ کا کلام ہندوپاک کے مختلف رسائل وجرائد کی زینت بنتا رہا۔جن میں الہلال (دہلی) مستانہ جوگی (لاہور) اخبارِ عام (لاہور) مخزن (لاہور) اتحاد (امرتسر) سناتن دھرم پرچارک (امرتسر) صبحِ کشمیر

(لاہور) رنبیر (جموں) گلشن (لاہور) کشمیر میگزین (لاہور) طریقت (لاہور) وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔طالبؔ کے تعلق سے معلومات بہم پہنچاتے ہوئے ڈاکٹر پریمی رومانی لکھتے ہیں۔

''طالبؔ نے شعر گوئی کا آغاز زمانۂ طالبِ علمی سے ہی کیا تھا۔انہیں اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی خاصی دستگاہ حاصل تھی۔شروع میں انہوں نے دلبرؔ تخلص کیا۔چنانچہ ان کا کلام 1912 سے برابر غیر ریاستی اخبارات اور جرائد میں دلبرؔ کے ہی تخلص سے نظر آتا ہے۔یہ وہ زمانہ تھا جب ریاست سے کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا تھا۔ان کا ابتدائی کلام اخبارِ عام، بہارِ کشمیر، صبح کشمیر، گلشنِ کشمیر جیسے لاہور سے چھپنے والے اخبارات اور رسائل کے علاوہ ہندوستان کی دوسری جگہوں سے شائع ہونے والے رسائل میں برابر شائع ہوتا تھا۔''(12)

طالبؔ نے 1911 سے باقاعدہ طور پر شاعری کرنی شروع کی ہے۔جیسا کہ اقتباس میں لکھا گیا ہے کہ وہ ابتدا میں دلبرؔ تخلص کرتے تھے۔لیکن آگے جا کر طالبؔ کاشمیری کے نام سے ہی مشہور ہوئے۔طالبؔ کا شعری مجموعہ ''رشحات التخیل'' کے نام سے 1925 میں منظر عام پر آیا ہے۔اس مجموعے میں کئی غزلوں کے علاوہ 20 نظمیں، 2 مراثی، 1 رباعی اور 4 مضامین شامل ہیں۔اس کتاب کا دیباچہ اردو ادب کے مشہور شاعر پنڈت دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے۔دیباچے میں طالب کو دادِ سُخن دیتے ہوئے کیفی صاحب لکھتے ہیں۔

''زبان کی درستگی اور محاورے کی صحت اس درجہ کی ہے کہ ایک اہلِ زبان کے کلام میں اور طالب کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہے''۔(13)

طالبؔ کاشمیری ایک بہت اچھے مدرس بھی تھے۔انھوں نے بہت برسوں تک سرینگر کے امر سنگھ کالج

میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ یہاں رہ کر وہ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاگردوں کی رہنمائی کرتے تھے اور شعر وادب کی پرکھ تقابلی نقطۂ نظر سے کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنی علمی استعداد سے بہت سارے رسائل و اخبارات کو بھی فیض پہنچایا ہے۔ ساتھ ہی بابائے اردو مولوی عبدالحق، پنڈت دتا تریہ کیفی، اور چودھری خوشی محمد ناظر کی صحبتوں میں رہ کر دادِ سخن حاصل کرتے رہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب ان کی سخندانی کے بڑے معترف تھے۔ یکم نومبر، 1925 کو مولوی عبدالحق، طالبؔ کے نام ایک خط میں شعری مجموعہ ''رشحات التخیل'' کو دیکھ کر لکھتے ہیں۔

> ''میں نے جستہ جستہ آپ کا کلام دیکھا، مجھے فی الحقیقت تعجب ہے کہ آپ نے وادیِ کشمیر میں رہ کر اردو زبان پر ایسی قدرت کیوں کر حاصل کر لی، یہ آپ کی ذہانت اور فراصت کی دلیل ہے۔ اس پر آپ کی نظر، آپ کا بیان قابلِ داد ہے۔ بیان میں صفائی اور گداز ہے اور یہ بڑی تعریف کی بات ہے'' (14)

طالبؔ کاشمیری کا دوسرا شعری مجموعہ ''مرقع افکار'' کے نام سے 1952 میں شائع ہوا ہے۔ لیکن آج اس مجموعے کا کہیں پر کوئی نام ونشان نہیں ملتا۔ طالبؔ نے اس مجموعے کا ذکر مرزا غالب پر لکھی گئی مبسوط کتاب ''جوہرِ آئینہ'' کے تعارفی الفاظ میں ضمناً کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے۔

> ''محترم پروفیسر ضیاء احمد صاحب، ایم۔ اے آج سے سولہ سترہ سال پہلے میرے دوسرے مجموعہ کلام معروف بہ 'مرقع افکار' پر ایک مبسوط مقدمہ تحریر کر کے مجھے ممنونِ احسان کر چکے ہیں۔ تعارف کے علاوہ محترم پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے پیش لفظ قلمبند کر کے مجھے فخر بخشا ہے۔ دونوں بزرگوں کی ذرہ نوازی کا تہہ

دل سے شکر گذار ہوں۔(صفحہ نمبر،7-8)

اس اقتباس سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ طالبؔ کے دوسرے شعری مجموعے ''مرقع افکار'' کا مقدمہ پروفیسر ضیاء احمد نے لکھا ہے اور اس کا پیشِ لفظ اردو ادب کے مشہور ادیب پروفیسر احتشام حسین نے تحریر کیا ہے۔لیکن افسوس کہ ان کا یہ مجموعہ شاید دست بر دِ زمانہ سے تلف ہوا ہے۔

1916 میں لکھی گئی ان کی ایک نظم ''طفلانہ جذبات'' کے عنوان سے ملتی ہے جو بنیادی طور پر پنڈت ونا یک پرشاد طالب بنارسی کی نظم کی تضمین ہے۔اس نظم میں انسانی جذبات وخیالات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔نظم میں ایک ایسے لڑکے کے جذبات کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس کا بھائی مر گیا ہے۔ایک معصوم بچے کے دل پر ایسی حالت میں کس قسم کے خیالات اُبھر سکتے ہیں اور ایک بچہ اپنی سیدھی سادھی زندگی کے مطابق بھائی کی ناگہانی موت پر کیا کچھ سوچ سکتا ہے۔بچے کا اپنی ماں سے جذباتی ہو کر یہ پوچھ لینا۔

بھائی کو مرے کیا ہوا ماں یہ بتا دو
کچھ حال خدا کے لیے اس کا تو سنا دو
دیکھا نہیں برسوں سے اسے لا کے دکھا دو
اماں مری اماں مرے بھائی کو بلا دو
اس کام میں پیسہ نہیں دھیلا نہیں جاتا
پر مجھ سے اکیلا کہیں کھیلا نہیں جاتا

بیٹے کے یہ پُر درد الفاظ ماں کے جگر کو چھلنی کر دیتے ہیں۔ایسی حالت میں ماں کی زبان سے کیا کچھ نکل سکتا ہے۔شاعر نے بڑے ہی موثر انداز میں ان جذبات وخیالات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

کیا تجھ کو بتاؤں ترے بھائی کا پتہ اب
وہ ایسی جگہ کب ہے کہوں اس کو کہ آ اب

وہ چاند ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا اب
تو دیکھ سکے گا نہ اُسے ماہ لقا اب
اب آپ کو بھی غم کے حوالے نہ کرو تم
اس بات کو جانے بھی دو نالے نہ کرو تم

طالبؔ کے نزدیک ذاتِ الٰہی کو چھوڑ کر دنیا کی کوئی بھی چیز شعر سے بڑھ کر وقعت نہیں رکھتی ہے۔وہ کہتے ہیں ''شاعری سے جو سرورِقلب،لطفِ محویت اور حالت وجد مجھ پر طاری ہوتی ہے ۔اس کا بیان حدِامکاں سے باہر ہے''۔(رشحات التخیل،ص8)

نندلال کول طالبؔ ایک بہت اچھے مترجم بھی تھے۔انھوں نے طالبِ علمی کے زمانے ہی میں رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور تصنیف ''گیتا نجلی'' کی تین نظموں کا ترجمہ اردو زبان میں کیا ہے۔انہوں نے یہ ترجمہ پروفیسر جی۔این۔داس کی فرمائش پر کیا ہے۔اس تعلق سے خود لکھتے ہیں۔

''7دسمبر 1917 کو پروفیسر جی۔این۔داس صاحب کی طرف سے راقم کو ایشیا کے ملک الشعرا جناب رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور تصنیف ''گیتا نجلی'' کی تین نظمیں اردو میں ترجمہ کرنے کا ایما ہوا۔نیاز مند ان دنوں سیکنڈ ائیر کلاس میں پڑھتا تھااور امتحان فاضل عالمی کی تیاری میں مصروف تھا۔لہٰذا رواروی میں تینوں نظموں کا ترجمہ کیااور ان کی خدمت میں یہ مترجمہ نظمیں پیش کیں۔پروفیسر صاحب نے ان کو پسند فرمایا اور جس مطلب کے لیےان کودرکارتھیں،کارآمد ہونے کااظہار کیا''۔(15)

اس اقتباس سے یہ آشکار ہوتا ہے کہ طالبؔ ابتدا ہی سے علم وادب کا بڑا شغف رکھتے تھے۔جس کے

سبب ادبی شخصیات ان سے ایسا کام انجام دینے کے لیے کہتے تھے۔ ورنہ اگر دیکھا جائے، ترجمہ نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں طبع آزمائی کرنا ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں ہے۔

طالبؔ کاشمیری کا ایک اہم کارنامہ ان کی کتاب ''جوہرِ آئینہ'' ہے۔ جو بنیادی طور پر اردو کے مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی زندگی اور ان کے فکر و خیال کے مختلف گوشوں کو سامنے لانے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس کتاب کا سنِ تصنیف 1971 ہے۔ یہ بنیادی طور پر طالبؔ کاشمیری کا مرزا غالبؔ پر لکھا گیا ایک مضمون ہے۔ جو اکتوبر، 1961 سے اپریل 1968 تک رسالہ ''نوائے ادب'' ممبئی میں ''سرمایہ کلام غالب'' کے عنوان سے بالاقسط شائع ہوتا رہا۔ لیکن پروفیسر ضیاء احمد صاحب کے کہنے پر اس کتاب کا نام ''جوہرِ آئینہ'' رکھا گیا۔ اس کتاب میں طالبؔ نے مرزا غالبؔ کے اردو کلام کے گہرے مطالعہ سے ان کے فکر و فن کے بہت سے گوشوں کو روشن کیا ہے۔ اور تشریحی انداز میں ان کی شاعرانہ خوبیوں کی وضاحت کی ہے۔ جو اکثر نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ یہ کتاب تنقیدِ غالبؔ میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کا تعارف فارسی اور اردو کے مشہور ادیب پروفیسر ضیاء احمد صاحب نے لکھا ہے۔ جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے صدر رہ چکے ہیں اور اس کا پیش لفظ پروفیسر سید احتشام حسین نے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے مسلم ہے کہ اس میں مرزا غالبؔ کے شارحین کے خیالات کو نقل کر کے طالب نے اپنی رائے دینے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی غالبؔ کا دوسرے ہمعصر شعرا سے تقابلی مطالعہ کر کے غالبؔ کی عظمت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں یہ بات افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ طالبؔ کاشمیری جس قدر و منزلت کے مستحق تھے وہ انھیں نہیں ملی اور ان کا یہ شعر اس بیان کی حمایت کرتا ہے۔

مانند بوئے گل اُڑے طالبؔ جہاں سے
ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا

پنڈت منوہر لال دلؔ:۔

پنڈت منوہر لال دلؔ جموں وکشمیر کے شعری منظرنامے کا ایک اہم نام ہے۔ان کا اصل نام منوہر لال اور قلمی نام دلؔ ہے۔منوہر لال دلؔ بنیادی طور پر تغزل کے شاعر ہے۔ان کی غزلیں ان مضامین پر مشتمل ہیں جنہیں غزل کے بڑے اساتذہ نے مقرر کیا ہے۔دلؔ اردو کی کلاسکی شاعری سے بڑے متاثر نظر آتے ہیں اور ان کا بیشتر سرمایہ کلاسکی نظم وضبط میں رنگا ہوا ہے۔ان کی کئی غزلوں میں سماجی معنویت بھی نظر آتی ہے۔لیکن دلؔ نے اس دوران غزل کی ایمائیت سے پورا فائدہ اُٹھایا ہے اور بڑے ہی پُر لطف اشعار نظم کیے ہیں۔

جہاں کے عشرت کدے میں ہم کو نصیب دل کا سُرور کیا ہے
گناہ گاری کی ظلمتوں سے تجلیوں کا ظہور کیا ہے

ہم کس کو حقارت سے دیکھیں ہے کون حقیر اس دنیا میں
تنکے کا سہارا بھی کبھی انسان کے کام آجاتا ہے

منوہر لال دلؔ کے کلام میں پرآشوب جدید دورِ سخن میں جو استواری اور وفاداری دکھائی دیتی ہے، وہ ایک سایہ دار درخت کی چھاؤں کی طرح ہے۔

یہ جہاں اچھا بھی ہوگا تو مگر
جس طرف ہم ہیں ادھر اچھا نہیں

آپ اچھے ہیں تو اچھی بات ہے
کیا بُرا ہے میں اگر اچھا نہیں

منوہرلال دلؔ کی قادرالکلامی کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں طویل ردیفوں پرطبع آزمائی کرتے ہیں۔ان کے اشعار کو پڑھ کرانشاؔء و مصحفیؔ کالکھنوی دوریادآتا ہے۔چنداشعاردیکھے۔

چھوٹ ہی جائے گا وطن آج نہیں تو کل سہی
اب تیری چلنے نہیں پائے گی، چل فرقت کی رات

نظامِ ساغر ومینا بدل سکے تو بدل
محبت نے کئے نازل عذاب اول سے آخر تک

محبت نے کئے نازل عذاب اول سے آخر تک
کہے گا کون حکایت کسی کی میرے بعد

اگر دیکھا جائے تو ان تینوں اشعار کا مضمون ایک ہی ہے۔یہ دعوٰی میرانیسؔ نے بھی کیا تھا’’اک پھول کا مضمون ہو،تو سو رنگ سے باندھوں‘‘۔منوہر لال دلؔ نے ایک مضمون کو کئی رنگ سے باندھنے کی روایت کو زندہ رکھا ہے اور ایسا کرتے ہوئے کہیں بھی تکرار کا احساس نہیں ہوتا ہے۔جو دلؔ کے مشقِ سخن کی ایک اہم دلیل ہے۔

منوہرلال دلؔ کا شعری مجموعہ’’نقدِ دل‘‘ کے عنوان سے 1975 میں شائع ہوا ہے۔اس مجموعے کا پیش لفظ اردو کے مشہور محقق پروفیسر گیان چندجین نے لکھا ہے۔جو اس دوران جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر تھے۔اس مجموعے میں غزلوں کے علاوہ ایک مرثیہ بھی شامل ہے۔اس مرثیہ کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ دلؔ مرثیہ میں رزمیہ انداز کے قائل نہیں بلکہ مرثیہ کے اصل موضوع بین یعنی ماتمِ ورثا کو برتا ہے۔ساتھ ہی

مرثیہ کی اصل ہیت مسدس کے بدلے مخمس کا استعمال کیا ہے۔

تو بے خبر نہیں اس سے خُدا کے پاک رسول
کہ حق پرستوں پہ جاری ہے آفتوں کا نزول
اُلجھ رہے ہیں کئی دامنوں سے ان کے ببول
بنا بتا، انھیں رکھے گا تا بہ کسے تو ملول
یہ رنگ رنگ کے غُنچے، چمن چمن کے ہیں پھول

دلؔ کی غزلوں میں بھی کربلائی رنگ جھلکتا ہے۔جس سے شہدائے کربلا کے تئیں ان کی عقیدت کا پتہ چلتا ہے۔

میدانِ کربلا میں شہیدوں کے خون سے
ہولی یزید کی تھی شہادت حسین کی

منوہر لال دلؔ حساس اور دردمند دل رکھنے والے شاعر تھے۔جس کا اندازہ ان کے کلام کو پڑھنے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔حسن و عشق ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ پروفیسر گیان چند جین اس خوبی کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

> ’’دل بنیادی طور پر حسن و عشق کے شاعر ہیں۔جس کا تخلص دلؔ ہو۔وہ حسن و عشق کا بندہ نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔وہ انہیں کے معاملات کے جملہ پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ان کا کلام آتش وداغ اور ان کے تلامذہ کی یاد دلاتا ہے۔اس دور میں یہ پختہ کلامی بَسا غنیمت ہے‘‘۔(16)

منوہر لال دلؔ کے عشقیہ کلام میں جذبے کی فراوانی، احساس کی شدت اور فکر کی جو ندرت ہے۔وہ

ایک انسان کا دامنِ دل کھینچے بغیر نہیں رہتی۔ دلؔ محبوب کے فراق میں رونے اور سر پیٹنے کو عشق کی توہین سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس چیز سے باز آنے کی تلقین کرتے ہیں۔

آہ وزاری سے نہ کر عشق کی ایدلؔ توہین
کام لے صبر سے بیتاب نہ ہو ہوش میں آ

اس وقت نہ جانے ہوتی ہے کیا قلب ونظر میں سرگوشی
دنیائے حیا کے کانوں تک جب عشق کا نام آجاتا ہے

شہیدِ ناز سے پوچھو رموزِ عاشقی کیا ہیں
گرہ اس عشق کی ہر اک سے سلجھائی نہیں جاتی

شاعر دنیا کی ناپائداری کے بھی قائل تھے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے دنیا کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ ایک انسان دنیا کی آسائشوں میں اتنا گُم ہوجاتا ہے کہ اسے مرنا بھی یاد نہیں رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسن وجوانی رہنے والی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ بہت جلد ختم ہونے والی ہیں۔

کیا پوچھتے ہو جوش جوانی کدھر گیا
اُٹھتا ہوا دھواں تھا فضا میں بکھر گیا

اسی کا نام ہے اہلِ چمن کی خود فراموشی
بہار آئے تو احساسِ خزاں باقی نہیں رہتا

دن عیش وعشرت کے کٹتے ہیں لمبی چوڑی باتوں میں
جب وقتِ مصیبت ہو لب پر اللہ کا نام آجاتا ہے

منوہرلال دلؔ اپنے دور میں جس قدردانی کے مستحق تھے۔وہ انہیں نہیں ملی اور یہ بات صحیح ہے کہ ایک انسان کا اپنا زمانہ کبھی قدردان نہیں ہوسکتا۔لیکن آنے والی نسلیں اس کے کلام کو پڑھ کر نئے گوشوں کو سامنے لانے کی سعی کرتی ہیں۔ٹھیک اسی طرح دلؔ کے ساتھ بھی ہوااوران کا یہ شعراس بیان پر صادر آتا ہے۔

میری نوائے شوق کی میرے جنونِ ذوق کی
قدر کریں گے ہم وطن آج نہیں تو کل سہی

مولانا چراغ حسن حسرتؔ:۔

مولانا چراغ حسن حسرتؔ کی ذاتِ گرامی سے کون واقف نہیں۔وہ اردو ادب کے ایک مایہ ناز ادیب، بلند پایہ صحافی اورایک اچھے شاعرگزرے ہیں۔ان کی پیدائش 1904 کو جاگیرکھٹالی موضع بمیارضلع بارہمولہ(کشمیر) میں ہوئی۔حسرتؔ کا پوراخاندان علم وادب کا گہوارہ تھا۔حسرتؔ کے والدکا نام لالہ کشمیر چند کپور تھا۔لیکن عہد شباب میں مشرف بہ اسلام ہوکرشیخ بدرالدین نام رکھا۔حسرتؔ ابھی کل بارہ برس ہی کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔اس کے بعدانہیں اپنے نانامنشی حسن خان نے گودلیا،جواپنے وقت کےایک بلند پایہ شاعر تھےاورحسنؔ تخلص کرتے تھے۔ان کی کٹھالی میں بہت ساری جاگیرتھی۔حسن خان کوکٹھالی کے مشہور جاگیردار سلطان محمد خان کے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم تھے۔لیکن محمد خان کی وفات کے بعد حسن خان کواپنی اس جاگیر کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رہی اور کٹھالی چھوڑ کر پونچھ کی سرزمین میں آبسے۔اس طرح 1911 میں چراغ حسن حسرتؔ کا ساراخاندان کٹھالی کوچھوڑکر پونچھ میں رہنےلگا۔

چراغ حسن حسرتؔ کی ادبی زندگی کا آغاز پونچھ کی سرزمین سے ہوا۔انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ بدرالدین اور نانا منشی حسن علی خان سے حاصل کی۔حسن علی خان اپنے دور کی ایک اہم ادبی شخصیت سمجھی جاتی تھی۔ان کے گھر پر ایک بہت بڑا ادبی سرمایہ جمع تھا جس کے مطالعے کا شرف حسرتؔ کو حاصل ہوا۔پونچھ کے دور افتادہ علاقے میں اردو زبان وادب کے فروغ میں اس خاندان کا اہم رول رہا ہے۔لیکن جس لگن و انہماک کے ساتھ حسرتؔ نے ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔حسرت نے اگرچہ اپنے قلمی جوہر سرزمینِ دہلی، لاہور اور کلکتہ میں دکھائے،لیکن ان کی ادبی زندگی کا آغاز پونچھ کے علمی وادبی ماحول میں رہ کر ہی پروان چڑھا تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ حسرتؔ کو بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہونا پڑا۔اس لئے تعلیم کا انتظام مناسب طور پر نہ ہوسکا۔جس کے سبب تلاش ومعاش کی تمام تر ذمہ داری انھیں کے سر آئیں۔اس طرح تلاش ومعاش کی فکر کے سبب آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد ہی پونچھ کے ایک نجی سکول میں کام کرنا پڑا۔لیکن حسرتؔ کے علمی ذوق نے انہیں کہیں بھی چین سے رہنے نہیں دیا اور اسکول کی نوکری چھوڑ کر شملہ چلے گئے۔جہاں انہیں بشت کاٹن اسکول میں ملازمت ملی۔ساتھ ہی اپنی پڑھائی کو بھی آگے بڑھاتے رہے۔شملہ میں قیام کے دوران منشی فاضل اور ایف۔اے کے امتحانات پاس کر لئے۔1925 میں شملہ کو خیر باد کہہ کر کلکتہ چلے گئے۔جہاں وہ کلکتہ سے نکلنے والے مشہور اخبار ''عصرِ جدید'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔اس کے بعد وہ پے در پے مختلف رسائل واخبارات کی ادارت سے منسلک رہے۔جن میں نئی دنیا، پیغام، آفتاب، جمہور وغیرہ شامل ہیں۔

کلکتہ میں ان کا کل چار سال قیام رہا اور 1929 میں مولانا ظفر علی خان کے ایما پر لاہور چلے گئے۔جہاں وہ اخبار زمیندار، انصاف، احسان وغیرہ میں لکھتے تھے اور روز نامہ ''احسان'' کے مستقل

کالم ''مطائبات''،میں ''سندباد جہازی'' کے فرضی نام سے مزاحیہ تحریریں لکھتے رہے۔

مولانا چراغ حسن حسرت ایک ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ بیک وقت ایک بہت بڑے صحافی،مقالہ نگار،مزاح نگار،ترجمہ نگاراور شاعر تھےاور ہر میدان میں زبان و بیان کی پاکیزگی و برجستگی کی وجہ سے منفرد نظر آتے ہیں۔خوش دیو مینی اپنے ایک مضمون ''چراغ حسن حسرت''میں لکھتے ہیں۔

> ''مولانا چراغ حسن حسرت اپنی پاکیزگی ، زبان اور شگفتگی بیان کے لئے بڑے مشہور تھے وہ خصوصی مقالہ نگاری میں منفرد،مزاحیہ کالم نگاری میں لاجواب، ترجمے میں طاق،شعروسخن میں ماہراور محاورہ زبان کی پابندی میں قدامت پرست تھے۔ہر لفظ، ہر محاورہ، ہر فقرہ جانچ تول کر لکھتے تھے۔ان کی زبان سادگی،شگفتگی اور برجستگی کے لئے بھی مشہور تھی۔ان کے قلم نے گلشن اردو میں ایسے گلہائے رنگارنگ کھلائے جن کی مہک تا ابد رہے گی''۔(17)

چراغ حسن حسرت کسی بھی ادبی تحریک سے منسلک نہیں رہے بلکہ جو کچھ لکھا اپنی لگن اور محنت کی بنیاد پر لکھا۔جہاں انہیں کسی طرح کی خامی محسوس ہوتی تھی وہاں وہ اس پر دل کھول کر طنز کرتے تھے۔وہ شعر کے لیے قافیے کا ہونا ضروری سمجھتے تھےاور بے قافیہ شاعری کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''بے قافیہ شاعری یا جدید شاعری عجیب چیز ہے،اگر راشد کی نظموں کو نکال دیا جائے تو اس صنف میں کام کی بہت کم چیزیں رہ جاتی ہیں۔آپ نے اس انداز کی نظمیں نہ پڑھیں ہوں تو راقم الحروف کے چند اشعار سن لیجئے۔

سنا ہے کہہ دیا انگور نے آلو بخارے سے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ بھینسیں آہ یہ بھینسیں
ہوا میں تیرتے ہیں قہقہے آن کی جُگالی کے

کہا سوسن نے مچھر سے
کہ میری روح کا نغمہ میرے صندوق میں ہوگا

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا جدید شاعری کی وضع کردہ نظم کی مختلف ہیتوں کے بڑے مخالف تھےاور وہ شاعری میں قافیہ پیمائی کے بڑے دلدادہ رہے ہیں۔

مولانا چراغ حسن حسرتؔ کی طبیعت میں سب سے منفرد چیز ان کی خودداری ہے۔وہ عمر بھر صحافت سے وابستہ رہے۔صحافت میں ان کی انفرادیت یہ تھی کہ وہ پورا اخبار تنِ تنہا لکھتے تھے۔ساتھ ہی محققین کا یہ خیال ہے کہ ان کی تحریروں کو پڑھ کر یہ سراغ لگانا مشکل ہے کہ ان کا تعلق پونچھ جیسے دورافتادہ علاقے سے ہوگا۔حسرتؔ نے صحافتی مصروفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے۔بغاوتِ عرب،مطائبات،کیلے کا چھلکا،کرنل لارنس کشمیر،جدید جغرافیہ پنجاب اور پربت کی بیٹی،وغیرہ ان کی ادبی یادگاریں ہیں۔

مولانا چراغ حسن حسرتؔ نہ صرف ایک بہت بڑے صحافی تھے بلکہ شعروشاعری کا بھی بڑا شغف رکھتے تھے۔انہوں نے زیادہ تر عشقیہ شاعری کی ہیں،جسے وہ مختلف مشاعروں میں سنا کر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔مولانا کا تمام تر شعری سرمایہ نامساعد حالات کے نظر ہو چکا ہیں۔لیکن جو چند اشعار موصول ہوئے ہیں،انہیں دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ شعروشاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔

حسرت کو لے تو آئے تری بزمِ ناز میں
کمبخت رو نہ دے کہیں محفل کے سامنے

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہوجاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

غمِ آرزو کو نہ زندہ کر دلِ بے خبر یہ وہ آگ ہے
جو سُلگ اُٹھی تو سُلگ اُٹھی جو دبی رہی تو دبی رہی

شمعیں بجھنے لگیں کہرام ہے پروانوں میں
رخ روشن سے عیاں نورِ سحر ہے کہ نہیں

جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

اب کے برسات میں بھی پی نہ سکے
ہم پہ روتی ہوئی برسات گئی

رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑیئے رات گئی بات گئی

ڈرتا ہوں کہ اس چشمِ فسوں ساز کی گردش
احساسِ تمنا کو تمنا نہ بنا دے

امیدِ وصل نے دھوکے دیئے ہیں اس قدر حسرتؔ
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

حسرتؔ بڑے ہی صاف گو اور مخلص شخص تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جس سے بھی ملتے بڑے ہی فراخ دلی اور اخلاق سے پیش آتے تھے۔ حسرتؔ کے اندر ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جس کے سبب ایک سونی پڑی ہوئی محفل کو بھی روشن کر دیتے تھے۔ ماہنامہ آجکل، دہلی، شمارہ ستمبر 1955 میں حسرتؔ کے تعلق سے لکھا گیا ہے۔

> ''چراغ حسن حسرتؔ کی شخصیت میں سب سے بڑی چیز اُن کی بزلہ سنجی تھی۔ ان کے مزاج میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ لہجہ بھی ظریفانہ تھا۔ سچ بات کہنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ انہیں احباب پیار سے 'لیمپ حسن حسرت' کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ''محفل کتنی بھی سونی اور ویران کیوں نہ ہو، یہ اپنی شگفتہ مزاجی، خوش کلامی اور بذلہ سنجی سے اس میں اُجالا کر دیتے ہیں''۔

چراغ حسن حسرتؔ کی ایک غزل کو مشہور گلوکار نصرت فتح علی خان نے گایا ہے۔ان اشعار کو نصرت ہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔لیکن اصل میں یہ حسرتؔ کے تحریر کردہ اشعار ہیں۔اشعار دیکھئے۔

زندگی مختصر نہیں ہوتی
شبِ غم کی سحر نہیں ہوتی

زندگی تو ہی مختصر ہو جا
شبِ غم مختصر نہیں ہوتی

چراغ علی حسرتؔ کے ایک دوست ظہیر بابر، ماہنامہ 'آج کل' کے دسمبر 1955 کے شمارے میں مرحوم حسرتؔ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ان کے نظریات سے بہتوں کو اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن ان کی ذات سے وہی نفرت کرسکتا ہے۔جس کے دل میں کسی کے لئے بھی جگہ نہ ہو''۔

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ چراغ حسن حسرتؔ گونا گوں صلاحیتوں کے مالک تھے اور انھوں نے اردو ادب کے لیے جو خدمات انجام دیے ہیں۔انھیں اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

شیام لال ایمہؔ:۔

شاعری میں ایمہؔ تخلص کرتے تھے اور طالب کاشمیری کے شرفِ تلمذ میں سے تھے۔ریاست میں اردو ادب کے فروغ میں ان کا بھرپور حصہ ہے۔وہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے قلمکاروں میں ایک اہم نام ہے۔انہوں نے اپنی محنت، لگن اور علمی صلاحیت سے اپنے قلم کا جادو جگایا اور اردو ادب کے دونوں شعبوں

یعٰنی نظم ونثر میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔وہ اردو اور کشمیری زبان کے قلمکار ڈاکٹر برج پریمی کے والد گرامی تھے۔

شیام لال ایمہؔ کی پیدائش 1899 کو سرینگر کے ایک مشہور علاقہ حبہ کدل میں ہوئی۔گھر میں علمی ماحول پہلے ہی سے تھا۔ان کے والد پنڈت شدھر کول خود بھی ایک مدرس تھے۔ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد مشن اسکول سرینگر سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ابھی اس سے آگے پڑھنے کا ارادہ ہی تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہوا،جس سے تمام تر گھریلوں ذمہ داریاں انہیں کے سر آئیں اور معاشی صورتحال کو سنوارنے کی غرض سے ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ملازمت کے دوران پڑھنے اور لکھنے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے،ادیب فاضل،ادیب کامل اور منشی کے امتحانات پاس کیے۔عبدالقادر سروری ان کی ادبی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''ایمہؔ نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں اوران کے اکثر مضامین مذہبی موضوعات یا تہواروں پر ہیں۔مثلاً،نوراتری اور بھگوان رام، شری رام چندرجی کے چرنوں میں، جیون مکت سدرشن وغیرہ۔نورہ سے خطاب میں سرسید احمد خان کے ایک مضمون کی طرح تمنا میں نئے سال سے وابستہ کی ہیں''۔(18)

شیام لال ایمہؔ کا ادبی سرمایہ مختلف روزناموں مثلاً مارٹند (کشمیر) رتن (جموں) اور لاہور سے نکلنے والے مشہور روزنامہ ''پھول'' کے شماروں میں چھپتا تھا۔وہ بیک وقت ایک اچھے افسانہ نگار،مضمون نگار اور شاعر تھے۔اس امر کے تعلق سے پریمی رومانی لکھتے ہیں۔

> ''شیال لال ایمہؔ کے ادب کا بیشتر حصہ روزنامہ ''مارتنڈ'' سرینگر، ''رتن'' جموں اور ''پھول'' لاہور جیسے رسائل وجرائد کے پرانے

شماروں میں محفوظ ہے۔ وہ بیک وقت ایک شاعر بھی تھے، افسانہ
نگار بھی اور انشا پرداز بھی۔ مضموں نگاری سے بھی انہیں گہری دلچسپی
تھی''۔(19)

شیام لال ایمہؔ کا سارا ادبی سرمایہ حوادث زمانہ کی نظر ہو چکا ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود اس سرمائے کو حاصل کرنے میں میں ناکام رہا۔لیکن شیرازہ کے ایک شمارے میں ان کے کچھ اشعار دستیاب ہوئے ہیں۔ان اشعار کو پڑھ کر ایمہؔ کی حساس طبیعت کا احساس ہوتا ہے۔انہوں نے اپنے فکر وفن کو سعادتوں سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ہے۔ایمہؔ کے اشعار حسنِ تاثیر اور نفسیاتی گہرائی کی اچھی مثالیں ہیں۔ساتھ ہی ان میں جذبے سے زیادہ شعور کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔مثال دیکھئے۔

کسی معشوق کم سن پر طبیعت آنے والی ہے
دل پروردہ عشرت پر مصیبت آنے والی ہے

ارادہ ان کا ہے محفل میں بے پردہ نکلنے کا
قیامت ہے، قیامت میں قیامت آنے والی ہے

شیام لال ایمہؔ نے اپنے متقدمین میں سے مرزا غالبؔ کی تقلید میں ایک غزل تخلیق کی ہے۔اس غزل میں ایک ایسی تیکنیک کا استعمال کیا گیا ہے، جسے صنعت ادا بندی کہا جاتا ہے۔صنعت ادا بندی دراصل غالب کے دعوے ''مراسلے کو مکالمے'' میں تبدیل کرنے کی تکمیل ہے۔یہ وہ صنعت ہے جسے مرزا غالبؔ کے بعد کسی اور شاعر نے شاید ہی اپنایا ہو۔غالبؔ کے دیوان میں اس طرح کی صرف ایک غزل ملتی ہے۔جس کا مطلع اور مقطع پیشِ خدمت ہوں۔

غنچۂ نا شگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں
(مرزا اسداللہ خان غالبؔ)

دیکھیئے اسی طرز پر لکھی ہوئی ایمہؔ کی تخلیق کردہ غزل کے اشعار۔

عاشق کو تم بے قرار رکھتے ہو کس طرح
سیماب رکھ لیا ہاتھ میں بتلا دیا کہ یوں

کس طرح ایک چاند کے ہالے بنے ہیں دو
کانوں میں بالے ڈال کے بتلا دیا کہ یوں

شیام لال ایمہؔ کے کلام سے ہمیں ایک قصیدہ بھی دستیاب ہوا ہے۔ جس کا سنِ تخلیق 9/اکتوبر 1915 ہے۔ یہ بنیادی طور پر کشمیر کے کسی بادشاہ یا حکمران کی شان میں لکھا گیا بیانیہ قصیدہ ہے۔

اے کریما! شاہِ کشمیر روز و شب دلشاد ہو
بارگاہِ ایزدی میں نت نئے فریاد ہو
روز افزوں ہو ترقی، اس کی عمرِ دراز میں
چشمِ دشمن ابتری میں برہم و برباد ہو

تیری رحمت ہو ہمیشہ اس کے سر پر سائباں
اس کے گفتار میں ہمیشہ منصفی اور داد ہو
یہ دُعا شام و سحر ہووے قبول بار گاہ
اس کی رعایا میں سد ہا یکدیگرِ اتحاد ہو

شیام لال ایمہ کی شاعری کا موضوع واسلوب اگر چہ روایتی دکھائی دیتا ہے۔مثلاً حسن وعشق کے وہی گھسے پٹے موضوعات، ہجر ووصال کے وہی فرسودہ خیالات،لیکن اگر دیکھا جائے تو انہوں نے ان موضوعات کو نئے انداز سے بیان کیا ہے۔جنہیں پڑھ کرایک قاری وجدانی طور پر محبت کے درد کومحسوس کرسکتا ہے۔

دشتِ دل سے مثلِ بادہ کے فراری چھوڑ دے
اور بیگانوں سے ملنے کی تیاری چھوڑ دے

دل لے گیا تو قاتل،مجھے چھوڑ دیا ہے
نہیں ہوگیا تو واصل،مجھے چھوڑ دیا ہے بسمل

یارو وصال تیرا پاکر ہو جائیں رخصت
ارماں یہی ہے در دل، مجھے چھوڑ دیا ہے بسمل

نالوں سے میرے ظالم چرخ بلند پر بھی
تارے ہوئے ہیں گھائل،مجھے چھوڑ دیا ہے بسمل

اے صنم پھر کر قبول یہ التجائے شام ہے
تا صباح واصل تو ہو جا،یہ مکاری چھوڑ دے

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ان کا سب سے مشہور افسانہ ’’غربت‘‘ کے عنوان سے جموں سے نکلنے والے مشہور روزنامہ مارتنڈ کے شیوراتری نمبر 28 فروری 1939 کو شائع ہوا ہے۔زندگی کے آخری ایام میں فالج کے مرض میں مبتلا رہ کر کل 50 سال کی عمر میں 1949 میں وفات پائی۔

غ۔م۔طاؤس:۔

غ۔م۔طاؤس ریاست کے شعری منظر نامے کا ایک اہم نام ہے۔ان کا ادبی سرمایہ دو کتابوں ،موج موج (شعری مجموعہ)اور یادوں کے آنسو(نثری تصنیف) پر مشتمل ہے۔طاؤس بنیادی طور پر ایک بہت بڑے بیوروکریٹ تھے اور اپنے فرائضِ منصبی کی وجہ سے اپنی علمی استعداد کو پوری طرح بروئے کار نہ لاسکے۔لیکن ان کے مختصر ادبی سرمائے کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے معیار کو مقدار پر فضیلت دی ہے۔

غ۔م۔طاؤس کا پورا نام میر غلام محمد طاؤس تھا لیکن ادبی حلقوں میں غ۔م۔طاؤس کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ان کی پیدائش 22 مئی 1920 کو کشمیر کے دارالخلافہ سرینگر میں ہوئی۔سرینگر میں ان کا نانیہال تھا اور کشمیر کا مشہور قصبہ پانپور ان کا آبائی وطن۔

طاؤس کے والد کا نام حاجی سیف الدین تھا جو خود بھی ایک باوقار ادب نواز تھے۔انہوں نے الف لیلیٰ کے قصہ ’’قمر الزماں‘‘ کا کشمیری زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔سیف الدین کو اپنے آبا و اجداد سے علم ودانش کے علاوہ چکداری بھی وراثت میں ملی تھی۔لیکن طاؤس نے چکداری پر علم ودانش کے حصول کو اہمیت دی۔طاؤس کی ابتدائی تعلیم پانپور میں ہی ہوئی اور مزید تعلیم کے لیے سرینگر کے اسلامیہ ہائی اسکول میں

داخلہ لیکر 1936 میں دسویں کا امتحان امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔مزید تعلیم کے لیے سرینگر کے مشہور سری پرتاپ کالج میں داخلہ حاصل کیا۔ جہاں سے 1940 میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد 1941 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور 1943 میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔لیکن سری پرتاپ کالج کی ادبی فضا انہیں نہایت راس آئی اور یہیں کے آب وہوا نے گلِ سخن کی آبیاری کی ہے۔اس تعلق سے خود فرماتے ہیں۔

> ''میں نے شعر گوئی کی ابتدا سری پرتاپ کالج سرینگر میں طالبِ علمی کے دنوں میں کی تھی۔ان دنوں ''پرتاپ'' کالج میگزین کشمیر کا غالباً واحد ادبی میگزین تھا۔یہ میگزین اپنا ایک منفرد رنگ و آہنگ رکھتا تھا۔میری ابتدائی تخلیقات اسی میگزین میں چھپنے لگی تھیں''۔(20)

غ۔م۔طاؤسؔ نے وادیِ کشمیر کے مشہور شاعر میر غلام رسول نازکیؔ کے شرفِ تلمذ میں رہ کر مشقِ سخن حاصل کیا اور انہیں کے ایما پر اپنا تخلص طاؤسؔ اختیار کیا۔اس تعلق سے خود فرماتے ہیں۔اقتباس دیکھئے۔

> ''کبھی کبھی میں اور میرا دوست شیخ غلام جو بلبلؔ تخلص کرتے تھے، نازکی صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر فنی مشوروں سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ایک موقعہ پر ہم دونوں نازکیؔ صاحب کے پاس بیٹھے تھے کہ نازکی صاحب نے علامہ اقبال کا یہ شعر دہرایا۔
>
> کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
> بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ
>
> بس اس وقت سے طاؤس میرے نام کے ساتھ اس طرح چپک گیا کہ آج تک چپکا چلا آ رہا ہے اور اب میرے نام کا ایک ضروری

جُزو بن کے رہ گیا''۔(21)

طاؤس ایک بہت اچھے نثار بھی تھے۔انہوں نے اپنی نثری تصنیف ''یادوں کے آنسو'' میں اپنے دور کے پُر آشوب حالات کو قلمبند کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔طاؤس نے تقسیم ہند کا المناک واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس واقعہ سے کشمیر کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات پر کیا اثرات رونما ہوئے۔اُن کو اپنی کتاب ''یادوں کے آنسو'' میں بڑے ہی جذباتی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہیں۔

20 مارچ 1986 کے روزنامہ آفتاب میں ''یادوں کے آنسو'' پر ایک تبصرہ ملتا ہے۔جس میں لکھا گیا ہے۔

> ''یادوں کے آنسو'' ان کی (طاؤس کی) نہایت کامیاب کوشش ہے اور اسے بغور پڑھنے سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اعلٰی عہدوں پر فائز رہنے کے دوران طاؤس صاحب اپنے اندر دردمند دل بھی رکھتے تھے اور اس دردمند دل نے سالہا سال تک کشمیری عوام پر جبر و زیادتیوں کے جو گھاؤ برداشت کیے وہ ''یادوں کے آنسو'' کی صورت میں منظر عام پر آئے تھے۔''

طاؤس کا پہلا اور آخری شعری مجموعہ ''موج موج'' کے عنوان سے 1981 میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں شامل بیشتر غزلیں اور نظمیں سیاسی رنگ و آہنگ لئے ہوئے ہیں۔کیونکہ طاؤس کا دور کشمیر میں سیاسی اتھل پتھل کا دور تھا۔ ہر طرف بے چینی و بے اعتمادی کا دور دورہ تھا۔طاؤس نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا اسے صفحۂ قرطاس پر اُتارنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین، صفحہ نمبر 16 پر ''موج موج'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں۔اقتباس دیکھئے۔

> ''انہوں نے اس ماحول کو جس میں انہوں نے اپنی زندگی بسر کی

شاعر کی نظر سے دیکھا اور اپنی تلخ، تُرش اور شیریں حقیقتوں کو جو اُن کی نظر سے گزریں اپنی شاعری میں سمیٹا''۔

جب ہم طاؔؤس کی شاعری پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں ان کی ابتدائی دور کی غزلیں کلاسکی لب ولہجہ اور انداز میں ملبوس نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی اس میں قدیم روایتی ادب کا اثر صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔

عدو جو کچھ بھی کہتا ہے اسے تسلیم کرتے ہیں
مری ہر بات پر کہتے ہیں یہ مانی نہیں جاتی

باغباں مسرور، گلچیں خوش، ہوا طوفاں خیز
بجلیاں ہیں وقف میرے آشیانے کے لیے

کچھ ایسی ہے میرے سوز دروں کی کارفرمائی
بہار آئے نہ آئے چاک کرتا ہوں گریباں کو

اگر ہم ان اشعار میں استعمال کردہ الفاظ پر غور کریں گے تو ہمیں ان کے اندر تہ در تہ گریاں نظر آئیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے بیشتر اشعار ایک سے زیادہ حالات پر صادق آتے ہیں۔ مثلاً۔ باغباں کا مسرور ہونا، ہوا کا طوفاں خیز ہونا، بجلیوں کا آشیانے کے لئے وقف ہونا، چاکِ گریباں وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جواب فرسودہ ہو چکے ہیں لیکن یہ فرسودہ تمثیلیں، علامتیں اور استعارے اردو کے کلاسکی دور کے بیشتر شعرا کے یہاں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر میر تقی میؔر کا یہ شعر دیکھئے۔

جو پوچھا کہ کتنا ہے گُل کا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

کلی کا جواب نہ دینا بلکہ تبسم کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گُل کی ہستی بقدرِ یک تبسم ہے۔

حیدر علی آتشؔ کا ایک شعر دیکھئے۔

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفو گر رہیں رفو کرتے

شاعر کا ہمیشہ اپنے گریباں کو چاک کرنا اور پھر رفو گروں کا تاعمر کام پر لگے رہنا محبت کی سعبتوں کی طرف اشارہ ہے۔

طاؤسؔ کے ابتدائی دور کی شاعری 1944 سے قبل تخلیق کردہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہیں جو بنیادی طور پر ان کی طالبِ علمی کے دور کی شعری کاوشوں کا نتیجہ ہے۔جس میں طاؤسؔ کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا پَرتو نظر آتا ہے۔طاؤسؔ نے وارداتِ قلبی کے ساتھ عنفوانِ شباب کے جذبات وخیالات کو بھی بیان کیا ہیں۔

پھر بہار آئی دلوں میں ولولے پیدا ہوئے
دیکھئے کن کن تمناؤں کا ہو جاتا ہے خون

طاؤسؔ کا یہ شعر اردو کے کلاسکی شعرا کے رنگِ سخن کی آبیاری کرتا ہے۔خواجہ میر دردؔ کا یہ شعر دیکھئے۔

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر، اُودھر چلے

میر دردؔ کے اس شعر میں درد و غم کا جذبہ کارفرما ہے۔یہ وہ دور تھا جب دنیا کی تمام خوبصورت چیزیں

ایک شاعر کی آنکھوں کے سامنے تھیں، لیکن دوسری جانب کشمیر کے لیے یہ دورِ عظیم بربریت سے کم نہ تھا۔ لوگ مہاراجہ کے ظلم و جبر سے تنگ آ چکے تھے۔ اس لئے طاؤسؔ کے پاس موت کی ہمہ گیری اور دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرنا ضروری تھا۔

تاریخ کبھی بھی ایک ڈگر پر نہیں ٹھہرتی۔ بلکہ یہ وقت کے ساتھ ساتھ نت نئے روپ دھار لیتی ہے۔ ساتھ ہی وقت کے پہلو بہ پہلو لوگوں کے عقائد بھی بدلتے رہتے ہیں۔ یہی حال کشمیر کا تھا۔ طاؤس نے اپنی مشہور نظم ''اک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا'' میں شیخ محمد عبداللہ جیسے عظیم سیاسی لیڈر کو پابند سلاسل بنانے کا تذکرہ بڑے ہی شاعرانہ پیرائے میں کیا ہے۔

ہے کہاں قائد ذی المرتبت عالی مقام
قوم کا معمار اعلیٰ سر فروشوں کا امام
نام جس کا ہے یہاں وردِ زباں خاص و عام
بے نیازی ہے تیری یا حق پرستی کا انعام
آج پابند سلاسل شیر ہے کشمیر کا
اک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ نظم بنیادی طور پر طاؤس کا شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے تئیں اظہارِ عقیدت ہے۔ یہ وہ دور تھا جب کشمیر کا چپا چپا شیخ محمد عبداللہ کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ لیکن جب وقت اپنی کروٹ بدل لیتا ہے تو بڑے سے بڑے شہنشاہوں کے تخت اُلٹ دیتا ہے۔

طاؤسؔ نے اپنی زندگی میں نت نئے ستم دیکھے ہیں۔ لیکن وہ کبھی بھی ان چیزوں سے اُکتا نہیں گئے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ زندگی کو کسی بھی حالت میں جینے کی ٹھان لیتے ہیں۔

مجھے اس خاکداں سے پھر بھی بے پایاں محبت ہے
یہ جینا کچھ بھی ہولیکن مجھے جینے سے الفت ہے

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ طاؤس نے اپنے ہم وطنوں کی آواز بن کر جو ادبی خدمات انجام دیے ہیں انھیں کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔آخر کار اپنے عہد کا یہ مزاج آشنا شاعر 1992 کو جمعہ کے دن داعئ اجل کو لبیک کہہ گیا۔

کشمیری لال ذاکر:۔

ان کا اصلی نام کشمیری لال موہن اور قلمی نام ذاکر ہے۔ذاکر کی پیدائش 7اپریل1919 کو بیگا بانیاں ضلع گجرات میں ہوئی۔والد کا نام گورداس رام اور والدہ کا نام پرمیشوری دیوی تھا۔ذاکر نے ایم۔اے تک کی تعلیم حاصل کی ہے۔جو اس زمانے کے دستور کے مطابق اعلٰی تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ذاکر کی شادی 1944 میں صوبہ جموں کے ایک آسودہ حال گھرانے میں ہوئی۔ان کی بیوی کا نام شیلاموہن تھا۔جن کے بطن سے دو اولادیں ،ایک بیٹا اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔شادی کے بعد وہ جموں ہی میں مستقل طور پر رہنے لگے اور اسی سرزمین میں رہ کر ان کے ذہنی شعور اور دماغی اہلیت کی تربیت ہوئی۔

کشمیری لال ذاکر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک کہانی بعنوان ''الگ الگ راستے'' سے کیا۔جو لاہور سے نکلنے والے مشہور رسالہ ہمایوں کے 1943 کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

کشمیری لال ذاکر ایک ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ بیک وقت ایک ناول نگار،افسانہ نگار، خاکہ نگار، ڈرامہ نگار،سفر نامہ نگار ہونے کے علاوہ ایک بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ذاکر کی شہرت اردو دنیا میں ایک فکشن نگار کی حیثیت سے مسلم ہے لیکن ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔اس تعلق سے وزیر آغا لکھتے ہیں۔

''کشمیری لال ذاکر ایک معروف افسانہ نگار ہی نہیں ایک جانے پہچانے شاعر بھی ہیں۔ان کی زیادہ وجہِ شہرت ان کی افسانہ نگاری ہے،مگر غزل کے میدان میں بھی انہوں نے تازہ کاری کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔''(22)

ذاکر اردو، ہندی اور پنجابی زبانوں کے بہت بڑے ادیب تھے۔جس کی زندہ مثال ان کی لکھی ہوئی 85 کتابیں ہیں۔جن میں خالص اردو کی 43 اور ہندی اور پنجابی کی 42 شامل ہیں۔''جب کشمیر جل رہا ہے (افسانے) '' آدھے چاند کی رات'' (افسانے) '' دھرتی صدا سہاگن'' (ناول) '' جاتی ہوئی رُت'' (ناول)،لمحوں میں بکھری ہوئی زندگی''(ناول)''ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی''(ناول)''یہ صبح زندہ رہے گی'' (سفرنامہ)،''نئی صبحوں کے سفیر''(خاکوں کا مجموعہ)،'' نیا سویرا(ڈرامے) '' یادوں کے کھنڈر(ناول)،انیسواں ادھیائے(ناول)،عکس رُخِ گلبدن(مجموعہ قطعات)یہ صبح زندہ رہے گی (سفرنامہ)1997 ''شیشہ بدن خواب'' (شعری مجموعہ)1999 وغیرہ منظرعام پر آچکے ہیں۔بہر حال مجھے اس بحث سے اس وقت کوئی سروکار نہیں ،یہ سطور صرف ان کی ادب نوازیوں کو آشکار کرنے کی غرض سے اشارتاً حائل ہوگئیں ہیں۔

کشمیری لال ذاکر کا شعری مجموعہ'' شیشہ بدن خواب'' 1999 میں شائع ہوا ہے۔جس میں چند قطعات کے علاوہ صرف غزلیں شامل ہیں۔اس مجموعے کا دیباچہ اردو کے مشہور ادیب پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے۔دیباچے میں مجموعے کے تعلق سے آزاد لکھتے ہیں۔

''شیشہ بدن خواب'' کی شاعری شاعر کی قلبی آسودگی اور ناآسودگی ،طمانیت اور اضطراب،نشاط اور درد و گداز کا ایک مرقع ہے جو حُسنِ بیان اور صوتی آہنگ کے نقوش سے مزین ہے۔''(23)

کشمیری لال ذاکرؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی ہے۔ذاکرؔ کے ہاں کلاسکی شعرا کے رنگِ سخن کی آبیاری ملتی ہے،ساتھ ہی نئے عہد کے شعور اور نئی تحریکات کے اثر نے ان کی غزلوں کو فکر و اسلوب کے اعتبار سے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ذاکرؔ کے کلام کی سب سے بڑی خاصیت،زبان کی سلاست اور بیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ فہم و فراست کی کارفرمائی ہے۔انھوں نے عصری حسیت کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ذاکرؔ کا حسنِ بیاں بڑا نرالا ہے۔چند اشعار دیکھئے۔

ہم اُجالے ہیں سرِ شام ہی کھو جائیں گے
ہم اُجالوں کو کسی آنکھ نے دیکھا ہی نہیں

میں وہ آنسوں جو سلگتا ہی رہا پلکوں پر
کسی دامن پہ، کسی گال پہ ٹپکا ہی نہیں

ان اشعار میں ایک طرح کا تسلسل ملتا ہے۔اس کے باوجود غزل کے آرٹ کے مطابق یہ اشعار معنی و مفہوم کے اعتبار سے اپنی جگہ مکمل ہیں۔یہاں تنہائی و بے چینی کے ایسے مربوط سلسلے دکھائی دیتے ہیں جہاں شاعر ایک ایسے غم میں گرفتار ہوتا ہے جو غم کسی اور کو کہنے کے لائق نہ ہو۔یہ بنیادی طور پر ایک حساس دل کی فریاد ہے۔آگے دیکھئے۔

نظر اُٹھا کے انھیں ایک بار دیکھ تو لو
ستارے پلکوں پہ ہم نے سجا کے رکھے ہیں

کریں گے آج کی شب کیا، یہ سوچنا ہوگا
تمام کام تو کل پر اُٹھا کے رکھے ہیں

دیکھنے میں یہ دوالگ الگ شعر ہیں،لیکن ان میں ایک طرح کی اندرونی وابستگی پوشیدہ ہے۔دونوں اشعار کامنبع رائگاں کا وہ احساس ہے، جومحبت اور زندگی سے وابستہ شاعر کی توقعات کی شکست کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔پہلے شعر میں شاعر اپنے معشوق سے مخاطب ہے، جس کے لیے اس نے اپنی آنکھوں میں جو خواب سجائے تھے۔اُن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آنسوؤں کے ان ستاروں کی طرف ایک نظر دیکھ لینے کی درخواست کرتا ہے۔جنھیں ان ٹوٹے ہوئے خوابوں کی جگہ اس نے اپنی پلکوں پہ سجا رکھا ہے۔شاعر کے لہجے میں جو حسرت ناکی ہے وہ صاف ظاہر کرتی ہے کہ اس کی یہ التجا بھی بیکار جائے گی۔

دوسرے شعر میں لاحاصل کا یہ احساس اور شدت اختیار کر گیا ہے۔یہاں زندگی کی ساری مصروفیات،ساری چیزیں شاعر کے لیے اپنی فوری کشش کھو چکی ہیں۔وہ انھیں آنے والے کل پر ٹالتا رہتا ہے۔لیکن لمحۂ رواں کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔مثلاً،اپنی استقامت کے لیے کسی استغراق کی تلاش اور جب یہ لمحۂ رواں اُبھر کر ایک طویل سیاہ رات کی شکل اختیار کرتا ہے،تو اس کے اقتضا کو یکسر رد کر دینا مشکل ہوتا ہے۔ذاکرؔ کے بہت سے اشعار میں جو معنوی ربط پایا جاتا ہے۔اس تعلق سے جگن ناتھ آزادؔ رقمطراز ہیں۔

> ”کشمیری لال ذاکرؔ کی شاعری ایک ایسی ماورائی انداز کی شاعری ہے جسے تنقید کی گرفت میں لانا آسان نہیں۔ذاکرؔ کی غزل ایک انوکھی انفرادیت کی حامل ہے۔ایسی انفرادیت جس میں شعور اور لاشعور دونوں ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور اس طرح سے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا آسان نہیں رہتا۔“(24)

ذاکرؔ کی شاعری کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ ان کے کلام میں خیالات اور مواد کی یکسانیت بدرجۂ اتم موجود ہے،مگر باوجود اس کے یہ اشعار الگ الگ اثرات کے حامل نظر آتے ہیں۔آگے دیکھئے۔

خلوص، درد، محبت، وفا، رازداری
یہ نام ہم نے کسی آشنا کے رکھے ہیں

اس شعر میں انسانی زندگی کے مختلف پہلو، ہمارے ٹھوس، مالی و عملی اقدار اور جمالیاتی اقدار کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ ندرت بیانی اس شعر میں توجہ طلب ہے۔ لیکن اصل خوبی اس بلیغ اشارے میں پیوستہ ہے کہ ہمارا ’’آشنا‘‘ وہی ہوگا جو ہماری ان خواہشات پر پورا اُترتا ہو۔ وجود مادی کا وہ ڈھانچہ ان تصورات پر پورا اُتر سکے گا، جس میں، خلوص ہو، محبت ہو، وفا ہو، رازداری ہو۔ اُسی کی آشنائی زندگی کی معنویت کو اور زیادہ دوبالا کر سکتی ہے۔

تمہارے در کے سوالی بنیں تو کیسے بنیں
تمہارے در پہ تو کانٹے اَنا کے رکھے ہیں

’’اَنا‘‘ (Ego) غیرتِ عشق کا ایک جزوِ عظیم ہے۔ محبوب میں اگر ’’اَنا‘‘ نہ ہو تو محبت کی صعبتوں کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن محبت کی اصل معراج خودسپردگی میں پوشیدہ ہے۔ خودسپردگی عاشق اور معشوق کے درمیان حائل تمام پردوں کو ہٹا دیتی ہے اور عاشق اپنے محبوب کے لیے اس حد تک جاتا ہے۔

میں ٹوٹ کر بھی نہ بکھرا کمال اس کا ہے
فسانہ میرا ہے لیکن خیال اس کا ہے

مری یہ تازہ کہانی بڑی پرانی ہے
خطوط میرے ہیں لیکن جمال اس کا ہے

عاشق محبت میں چور ہو کر، محبوب کی موجودگی کو اپنی آنکھوں کا نور سمجھتا ہے۔

میری آنکھیں اس کے نور سے روشن ہیں
میں نے جو کچھ دیکھا ہے سب اس کا ہے

کشمیری لال ذاکرؔ کی شاعری کا بیشتر حصہ جذباتی رنگ لیے ہوئے ہے۔عاشقانہ جذبات وخیالات کی داستان ہر چند رسمی نہیں ہے۔مگر اس کے باوجود ان میں ایک طرح کا عمدہ اور صحتمند توازن قائم رہتا ہے۔

یہ ظالم دوسروں کے درد سے واقف نہیں ہوتے
یہ معصوموں کے یارانے بڑی تکلیف دیتے ہیں

ذاکرؔ کی شاعری میں جذبات واحساسات کی جو شدت پائی جاتی ہے وہ ایک انسان کو غور وفکر کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ان کا اسلوبِ بیان نہایت سادہ ہے۔لیکن اس میں احساسات کی جو شدت ہے وہ ایک قاری کا دل اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔جس پر ان کا یہ شعر صادر آتا ہے۔

جسے خلوص سے پڑھتا ہے ہر حسین قاری
وہ میرا قصہ وہ میرا فسانہ ہوتا ہے

سیفیؔ سوپوری:۔

سیفیؔ سوپوری ریاست کی پہلی نسل کے قلم کاروں کی صف میں ایک اہم نام ہے۔ان کا اصل نام سیف الدین تھا۔لیکن ادبی حلقوں میں سیفیؔ سوپوری کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ان کی پیدائش 19 ؍جنوری 1922 کو ضلع بارہمولہ کے قصبہ سوپور کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔سیفیؔ کی ابتدائی تعلیم وتربیت سوپور میں ہوئی اور ملازمت وسکونت بھی اسی علاقے میں اختیار کی۔سیفیؔ نہ صرف اردو زبان کے شاعر تھے، بلکہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی خاصا عبور رکھتے تھے۔انہوں نے بہت سی کتابوں کے تراجم بھی کئے ہیں۔جس کی سب سے بڑی مثال ان کی کتابیں، ’’کیمیائے سعادت از حضرت امام

غزالی‘‘ (فارسی سے کشمیری)۔ وجودیت از ژاں پال سارتر‘‘ (انگریزی سے اردو)۔’’شرح مائتہ عال از حضرت جرجانی‘‘ (عربی سے کشمیری)۔’’وجودیت از ژاں پال سارتر‘‘(انگریزی سے کشمیری) ہیں۔

سیفؔی نے غزلیں بھی کہیں ہیں اور نعت گوئی میں بھی اعلیٰ جوہر دکھائے ہیں۔سیفؔی سعید خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے طبیعت مائل بہ جدت نعت گوئی سے ذوق رکھتے تھے۔نعت گوئی میں سیفؔی نے اپنے دل وجگر کے ٹکڑوں کو نکال کر صفحۂ قرطاس پر اُتارا ہے اور درِ حبیبؐ کی زیارت نصیب نہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے سرورِ کائناتؐ کی بارگاہ میں سرخم کرتے ہوئے ایک حقیقی اُمتی ہونے کی مثال قائم کی ہے۔جو بنیادی طور پر ان کا خاندانی رنگ ہے کیونکہ سیفؔی کا تمام خاندان آج بھی نعت گوئی میں مصروف ہے۔ان کی لکھی ہوئی ایک نعت شریف کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

گہر اثر میرے ادراکِ آگہی میں ابھر
کریں نثار شہہ انبیاء پہ سبد گہر

جو میری آنکھ ہے خوشا بار شایاں ہے
جُھکا نہ آج تک میرا درِ حبیب پہ سر

حبیب وہ کہ حبیبِ خدا جسے کہیے
شفیع وہ کہ شفاعت کرے سرِ محشر

سیفؔی سوپوری کے شخصی کردار اور صحبتِ صالح نے ان کے کلامِ نعت کو جلا بخشی ،جس سے ان کے نعتیہ کلام میں سرشاری،شیفتگی وخودسپردگی ملتی ہے۔ان کے نعتیہ کلام میں خلوص وعقیدت کا معیار نہایت بلند ہے۔ ساتھ ہی جب اس میں زبان کی سادگی اور جذبے کی سچائی شامل ہوتی ہے،تو اس میں ایک الگ قسم کی مٹھاس

اور دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔سیفؔی غزل لکھنے کے فن سے بھی پوری طرح واقف تھے۔وہ ایک اچھے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں غزل کے فنی لوازمات سے سمجھوتا نہیں کرتے ہیں۔ان کے منفرد لب و لہجے اور فکری گہرائی کا اندازہ ان کے متعدد اشعار سے ہوتا ہے۔

کل لوگ بھی کیا جانے ہم لوگ کہاں تھے
آئینے کا کہنا ہے کہ پردے میں نہاں تھے

اک آگ سی سینے میں ہے کیا نام ہے اس کا
اپنے بھی تو یارو کئی انداز بیاں تھے

سیفؔی سوپوری کا اندازِ بیاں نہایت سادہ ہے۔وہ ایک عام خیال کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔سیفؔی کے کئی اشعار میں داخلیت کے بجائے خارجی اثرات نمایاں ہیں۔انہوں نے ایک اصولی بات کہی ہے لیکن سادگی کے ساتھ اور جس سے قاری کے دل و دماغ پر کوئی غم آفریں نقش مرتسم تو نہیں ہوتا بلکہ ایک انسان کا ذہن دنیا کے مساوی پہلو کی طرف لے جانے کی اچھی مثال ہے۔

کیا میؔر کے انداز کا دعویٰ تھا کسی کو
جو لوگ یہاں آئے تھے سب اہلِ زباں تھے

اگر دیکھا جائے تو ''خدائے سخن'' کا دعویٰ کرنے والے سر پھرے بہت ملیں گے،مگر حقیقت تو یہی ہے کہ تیشۂ فن لے کر دودھ کی نہریں نکالنے والے فرہاد کم ہی نظر آتے ہیں۔سیفؔی سوپوری تادم مرگ ادبی سرگرمیوں سے وابستہ رہے۔عمر کے تقاضے کے سبب 2018 میں 96 سال کی زندگی پا کر اپنے پیدائشی علاقہ سوپور میں انتقال فرمایا۔ان کے جسدِ خاکی کو اپنے آبائی قبرستان بمقام حیات شاہ میں سپردِ لحد کیا گیا۔

دیناناتھ مستؔ کشمیری:۔

دیناناتھ مستؔ کا شمار 1947 سے پہلے کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ان کا اصل نام دیناناتھ کوشک چکن ہے۔لیکن ادبی حلقوں میں مستؔ کاشمیری کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ریاست میں اردو شعر و ادب کو فروغ دینے میں ان کا اہم حصہ ہے۔وہ بنیادی طور پر ایک صحافی تھے،لیکن یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ جتنے بڑے صحافی تھے، اتنے ہی بڑے شاعر تھے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''فردوسِ خیال'' کے عنوان سے 1977 میں دہلی کے نعمانی پریس سے شائع ہوکر سامنے آیا ہے۔یہ مجموعہ پانچ حصوں،کشمیر جنت بے نظیر، نیرنگ فطرت،نغمات وطن،شخصیات اور روحانیات پر مشتمل ہیں۔اس مجموعے کا تعارف شاعرِ حیات جوش ملسیانی نے لکھا ہے اور پیش لفظ شاعرِ شباب جناب جگن ناتھ آزاد نے تحریر کیا ہے۔اس کے بعد'' الہاماتِ مستؔ'' 1985 کے عنوان سے ایک اور شعری مجموعہ شائع ہوا ہے۔لیکن ان دو مجموعوں کی اشاعت سے پہلے ان کا ایک مجموعہ کلام منصب شہود پر آنے کو تیار تھا،لیکن ایک حادثے کے سبب اشاعت سے قبل ہی ضائع ہوگیا ہے۔اس تعلق سے مستؔ خود فرماتے ہیں۔

> ''اس سے قبل (فردوسِ خیال) بھی ایک مجموعہ کلام 1955.1956 میں تیار کیا گیا تھا، دوسرے ہی دن کاتب صاحب کے حوالے کرنا تھا،لیکن شومئِ قسمت کہ قرول باغ نئی دہلی میں میرے فلیٹ میں دن دھاڑے چوری ہوگئی۔ بہت سا قیمتی سرمایہ چلا گیا اور اس کے ساتھ وہ مسودہ بھی چور لے گئے۔اس میں ادبی مشاہیر کے خطوط اور رائیں تھیں، کچھ نادر تصویریں بھی تھیں جو مجموعے میں چھپنی تھیں،سب کچھ غارت ہوگیا۔''(25)

مستؔ کاشمیری کی پیدائش 1902 میں جنوبی کشمیر کے ایک مشہور علاقہ اننت ناگ میں ہوئی۔

یہاں پر ان کی خاندانی ملکیت تھی۔لیکن 1947 کے ہنگامے سے پیدا شدہ بحرانی صورتحال کے سبب اپنا آبائی علاقہ چھوڑ کر سرینگر کے حبہ کدل علاقے میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ابتدائی تعلیم اپنے ننھیال بمقام ویری ناگ (بونہ گنڈ) اوراننت ناگ کے مختلف اسکولوں سے حاصل کی۔1950 میں ملازمت کے سلسلے میں دہلی کا رُخ کیا۔یہاں کی آب و ہوا اتنی راس آئی کہ دہلی کو ہی اپنا مسکن بنا بیٹھے۔لیکن ریاست سے انھیں جو والہانہ عقیدت تھی، اس میں کسی بھی طرح کی کمی نہیں آئی۔مستؔ کاشمیری نے فرسودہ اندازِ شعر کو اپنانے کی کوشش نہیں کی۔لیکن اس کے باوجود بھی ان کی شعری تخلیقات میں تغزل کی چاشنی اور دل آویزی موجود ہے۔وہ اپنے موضوعات میں رنگ بھرنے کے لئے تمدنی اور قدرتی مناظر اور حسن وخوبی کے کسی بھی پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔

مستؔ نے اپنی ادبی خدمات کے ذریعے اپنے تاریخی وطنِ کشمیر کو روز افزوں کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔انھوں نے اپنے وطنِ عزیز کے دلفریب مقامات پر طویل نظمیں تخلیق کی ہیں۔اے مستؔ وطن تیرا، سُرخئی بہار، صبح دہقان، زعفران کے پھول، سیبوں والی، خزاں، بہار برف باری، کنولوں کا پھول، میں جھیل ڈل، کیسر کی شہزادی وغیرہ اس کی اہم مثالیں ہیں۔ان نظموں میں کسی ایک مرکزی احساس کے چاروں طرف پیکروں کے تانے بانے بننے کا عمل پایا جاتا ہے۔مستؔ کے کلام میں ہندی الفاظ کی بڑی تعداد ملتی ہیں اور ان الفاظ کی آمیزش بڑی دلچسپ اور برمحل معلوم ہوتی ہے۔جس سے ان کے حسن و بیان کی خوبی میں شیرینی پیدا ہوئی ہے۔ان محاسن کے علاوہ مستؔ کا جمالیاتی احساس بھی بڑا شدید محسوس ہوتا ہے۔جس کا احساس ان کی متعدد نظموں کو پڑھ کر بخوبی ہوتا ہے۔لیکن نظم ''کالی ساڑی'' اس کی ایک خاص مثال ہے۔

وہ کالی ساری پہن کے آئی ہے حسن کتنا چمک رہا ہے
سیاہ فانوس میں یہ نورِ چراغِ سینا چمک رہا ہے

شرابِ گلفام و آبِ حیواں سیاہ شیشے میں جلوہ گر ہے
چھُپا ہے بدلی میں ماہ پُر ضو کہ مہرِ انور طلوع پر ہے

ہوئی ہے تزئینِ حُسنِ کافر بپا قیامت قیامتوں میں
مَلاحتیں گُم صباحتوں میں صباحتیں گم ملاحتوں میں

مستؔ کی بیشتر نظمیں ایک ایسے نغمے کی مانند ہے جو اپنے وطن کی محبت کے جذبے سے معمور ہے۔''بانہال کی چوٹی پر'' ان کی ایک منفرد نظم ہے۔ بانہال صوبہ جموں اور صوبہ کشمیر کے بیچ میں ایک علاقہ پڑتا ہے۔ یہ علاقہ اُونچی پہاڑیوں کی گود میں چُھپا ہوا ہے۔ جموں سے آتے ہوئے ان پہاڑیوں کو عبور کرنے کے بعد وادیِ کشمیر شروع ہو جاتی ہے۔مستؔ نے بڑے ہی منفرد انداز میں ان پہاڑیوں کی خوبصورتی اور بلندیوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں کشمیر کے لیے دیوارِ چین کے مترادف قرار دیا ہے۔

چوٹی پہ بانہال کی یوں '' جلوہ گر'' ہوں میں
جیسے کہ آج ہمسر شمس و قمر ہوں میں

چھوتا ہوا ستاروں سے میرا سر بلند
چاہوں تو ڈال سکتا ہوں میں عرش پہ کمند

میں آج وہ مسافر رفعت نصیب ہوں
گویا کہ اب خدا کے میں بالکل قریب ہوں

اُونچا اُٹھاؤں سر تو کروں اُس سے گفتگو
موسیٰ سے لن ترانیاں جس کی رہی ہو خُو

اک پاسباں ہے خلقت کشمیر کے لئے
دیوارِ چین ہے جنتِ کشمیر کے لئے

الغرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مستؔ اپنے ماحول سے زیادہ لطف اندوز ہوئے ہیں اور فطرت کی رنگینیوں اور موسمی کیفیتوں کی طرف زیادہ مائل ہوئے ہیں۔وہ اپنی نظموں میں ایک ایک جُز کی تفصیل اس طرح پیش کرتے ہیں کہ حقیقت اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ لفظوں میں ڈھل جاتی ہے۔مستؔ کو اپنے کشمیری ہونے پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔جس کا احساس ان کی نظم ''اے مست وطن تیرا'' کو پڑھ کر بخوبی ہوتا ہے۔جس کا ایک شعر یوں ہے۔

کشمیر جنت ہے اے مست وطن تیرا
تقدیر تیری کتنی فرخندہ و روشن ہے

وشوا ناتھ درماہؔ بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔انہوں نے مناظرِ فطرت اور مذہبی موضوعات پر بڑی اچھی نظمیں تخلیق کی ہیں۔قمر قمرازیؔ کا شمار بھی اسی دور کے اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔کشمیر کی قدرتی خوبصورتی سے متاثر ہوکر اچھی اور فکر انگیز نظمیں لکھئی ہیں۔پنڈت تاراچندؔ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔انہوں نے کشمیر کی قدرتی خوبصورتی کو جس خوبی کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔وہ انہیں کا حصہ ہے۔

قاضی غلام محمد بھی اسی دور کے ایک مزاحیہ شاعر تھے۔وہ زندگی اور سماج کے کھر درے پن اور تضادات کا گہرا شعور رکھتے تھے اور ان حالات سے رنجیدہ ہونے کے بجائے ان پر قہقہہ لگاتے

ہیں۔زبان و بیان پر ان کو کامل عبور تھا،اور وہ بلا شبہ ایک پختہ کار مزاحیہ شاعر تھے۔نند لال بے غرضؔ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔انہوں نے بھی مذہبی تہواروں پر اچھی نظمیں لکھی ہیں۔مثال دیکھئے۔

آج کیوں مہکا ہوا ہے باغ جنت کا شام　　　گلشن ہستی کا عارض کس لیے ہے لالہ فام

دیکھ ہمدم چشم باطن سے تو عالم کا نظام　　　ہم کو فطرت دے رہی ہے آج کیوں بھر بھر کے جام

ہے عروس دہر کے رُخ پر بہار آئی ہوئی

مردنی زال خزاں کے چہرہ پر چھائی ہوئی

مرزا کمال الدین شیداؔ 1947 سے پہلے دور کے ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ان کے یہاں سیاسی،سماجی و اقتصادی موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں اور غزل میں بھی اپنی طبیعت کے جوہر دکھاتے ہیں۔کشنؔ سمیل پوری بھی اسی دور کے ایک اچھے شاعر گزرے ہیں۔ان کی نظمیں اور غزلیں فکر و فن کے امتزاج کا ایک حسین پیکر ہیں۔ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

کہیں دیر و کعبہ کے درمیاں کوئی ایک حسین مقام تھا

وہاں رقص تھا، وہاں جام تھا، وہیں جاکے ہم بھی ٹھر گئے

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ 1947 سے قبل جو شعرا ریاست کے منظر نامے میں علم برداروں کی حیثیت رکھتے ہیں اُن میں خاص شعرا وہی ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ان شعرا کے علاوہ جن ناموں سے اس دور کی شعری فضا معمور ہے،اُن میں،قیسؔ شیروانی،عبدالسمیع پالؔ،کشن لال حبیب،کشن چند کشن،علیم یزدانی، ذوالفقار علی نسیمؔ،کشن سمیل پوریؔ، ہدایت اللہ فوق، قائمؔ چاند پوری،محمد علی حشمتؔ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ان شعرا نے اپنے مخصوص اندازِ بیاں اور طرزِ تخیل سے متعدد شعری اصناف میں نئی روح پھونک دی ہے،ساتھ ہی مفکرانہ انداز اور حقیقت پسندی کے اظہار کے علاوہ حسنِ بیاں میں نئے نئے خیالات کو جگہ دے

کر اردو شاعری کی اہمیت کو اور نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو کے بڑے شعرا نے جو راستے مقرر کیے تھے۔ انھیں راستوں پر چل کر ان شعرا کا کلام پروان چڑھتا رہا۔ ساتھ ہی آگے آنے والے شعرا نے ان کے نقشِ قدم پر چل کر اردو شاعری کے دامن کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے اور اپنی انفرادی حیثیت کو نمایاں کرنے میں لگے رہے۔

☆☆☆

حوالے

(1) حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو، اشاعت 1979، صفحہ نمبر 33

(2) کشمیر میں اردو' جلد دوم، اشاعت 1982، صفحہ نمبر، 36۔37

(3) عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، جلد دوم، اشاعت 1982۔ سرینگر، کشمیر، صفحہ 49

(4) عرضِ ناشر، محمد یوسف ٹینگ۔ کشمیر میں اردو، دوسرا حصہ، از عبد القادر سروری، ترتیب، محمد یوسف ٹینگ، اشاعت 1982

(5) ماہنامہ، شیرازہ، جموں و کشمیر میں اردو شاعری نمبر، سرینگر کشمیر، جلد: 52۔ شمارہ 7۔6

(6) ڈاکٹر فرید پربتی، جموں و کشمیر میں اردو شاعری۔ مشمولہ مجلّہ، ترسیل، اشاعت، 2011۔ ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر (کشمیر)

(7) ماہنامہ تعمیر، سرینگر۔ شمارہ 2 اگست 1983، صفحہ نمبر 13

(8) ڈاکٹر فرید پربتی، جموں و کشمیر میں اردو شاعری، مشمولہ، ترسیل، سالانہ ادبی و تحقیقی مجلّہ، منجانب، ڈسٹنس ایجوکیشن، کشمیر یونیورسٹی، صفحہ 116

(9) حبیب کیفوی، کشمیر میں اردو، صفحہ نمبر 13 اشاعت 1979

(10) عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، جلد دوم، اشاعت۔ کلچرل اکیڈمی جموں و کشمیر 1982 صفحہ نمبر 26

(11) شیرازہ شمارہ، 1962,003 صفحہ نمبر، 104

(12) ڈاکٹر برج پریمی، جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما۔ تنقید و تحقیق، اشاعت 1992، جموں، صفحہ 154

(13) طالبؔ کاشمیری۔ شعری مجموعہ 'رشحات التخیل' 1925، صفحہ 9

(14) شعری مجموعہ، رشحات التخیل، صفحہ نمبر 202

(15) مجموعہ، رشحات التخیل، ص 166

(16) مجموعہ، نقدِ دل، صفحہ نمبر 8، 13/ جنوری 1975

(17) ہمارا ادب، شخصیات نمبر 002، صفحہ نمبر 51

(18) عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، جلد دوم۔ اشاعت 1982، صفحہ نمبر 453

(19) پریمی رومانی، کتاب، پیش رفت۔ مطبع۔ رچنا پبلکیشنز جموں، اشاعت 2002۔ صفحہ 78

(20) شفق سوپوری، غ۔م۔ طاؤس، فن اور شخصیت۔ صفحہ 9

(21) شفق سوپوری، غ۔م۔ طاؤس۔ فن اور شخصیت۔ صفحہ نمبر، 9، 10

(22) سوونیر، جشنِ کشمیری لال ذاکر، 25، فروری۔ 1995 گوہر ہاوس، چنڈی گڑھ، صفحہ 91

(23) کشمیری لال ذاکر، شعری مجموعہ، شیشہ بدن خواب، اشاعت 1999۔ دہلی، صفحہ 17

(24)، کشمیری لال ذاکر، شعری مجموعہ، شیشہ بدن خواب، اشاعت، دہلی۔ 1999، صفحہ 16

(25) دینا ناتھ مست، شعری مجموعہ۔ فردوسِ خیال، اشاعت، 1977، مطبع، نعمانی پریس، دہلی۔ صفحہ 36

﴿باب دوم﴾

جموں و کشمیر میں اردو غزل کا فنی و فکری مطالعہ

''1947 سے 1960 تک''

علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا مخزن ریاست جموں و کشمیر ہر دور میں منفرد اور ممتاز رہا ہے۔ ہندوستان کے دوسرے ادبی مراکز دہلی، لکھنو، رام پور، حیدرآباد اور بعض دیگر ریاستوں کی طرح اردو شعروادب کی سرپرستی وآبیاری میں ریاست جموں وکشمیر کا جو حصہ رہا ہے اُس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس ریاست کے دامنِ فیض سے وابستہ رہنے والے اربابِ کمال کی صف میں جہاں ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ، پنڈت دتاتریہ کیفیؔ، برج نارائن چکبستؔ، جگن ناتھ آزادؔ، چراغ حسن حسرتؔ، خلیفہ عبدالحکیم وغیرہ جیسے علم وفن اور شعروسخن کے آفتاب ومہتاب نظر آتے ہیں، وہیں کچھ ایسے فنکار بھی یہاں رہے ہیں، جن کی آوازیں سر زمینِ کشمیر سے باہر نہ بڑھ سکیں اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ یہیں کی فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئیں۔ ہیمرا آجؔ ٹھپہ ہیرانگری، اشتیاق خورشیدؔ کاظمی، سید فتح حسین شاہ ظفر کاظمی ایسی ہی چند ہستیاں ہیں جنہوں نے یہاں کی شعری روایت کو آگے بڑھانے اور علمی وادبی ماحول کو نکھارنے اور سنوارنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

ہندوستان کا شاید ہی کوئی باشندہ ایسا ہوگا، جو تقسیمِ وطن کے المیہ سے بیگانہ ہوسکتا ہے۔ 14 اور 15 راگست 1947 کو دو بہنیں (پاکستان اور ہندستان) کچھ اندرونی تقاضوں کی بناپر دو الگ الگ گھر بسانے پہ مجبور ہوئیں، مگر ساتھ ہی ریاست جموں وکشمیر کو بھی دو حصوں میں منقسم کرنے پر آمادہ ہوگئیں۔ ریاست کے ایک حصے پر پاکستان نے قبضہ جمالیا اور دوسرے حصے پر ہندوستان قابض ہوا۔ تب سے لیکر آج تک کشمیر میں ان دونوں ممالک نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر انسانی حقوق کی پامالی کا ایسا سلسلہ جاری رکھا ہے جو آج تک تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ ایسے حالات میں ایک حساس انسان کا جگر کانپ اُٹھتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد جو دردناک صورتحال پورے ملک کے ساتھ ساتھ ریاست میں رونما ہو رہی تھی، اس کو ریاست جموں وکشمیر کی غزلیہ شاعری میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے زیادہ کشمیر کے لوگوں کو اس کربناک صورتحال سے گزرنا پڑا، یہی وجہ ہے کہ یہاں کی غزلیہ شاعری میں دردوکرب کا اظہار

بڑے شد و مد سے ملتا ہے۔

1947 کے بعد کا دور ایک نیا جذبہ اور ہمہ گیر دور کی بشارت لے کر آتا ہے۔ یہ وہ دور ہے، جب یہاں کے شعرا سماجی و معاشی تعمیر نو کو وسعت دینے کی طرف متوجہ ہوئے، ساتھ ہی یہ شعرا نئی رفعتوں اور وسعتوں کو چھونے کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ اس دور کے شعرا کے تعلق سے ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں۔

> ''تقسیمِ وطن کے بعد دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے جو اب بھی جاری ہے۔ یہ ایک جذبہ ہمہ گیر اور باز ور دور کی بشارت لے کر آتا ہے، اسی دور میں کشمیر کا فنکارانہ ذہن نئی رفعتوں اور وسعتوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے۔ جدید مغربی تعلیم اور سائنسی تہذیب سے واقفیت کے نتیجے میں کشمیری ادبا عالمی سطح پر قدیم و جدید کی کشمکش کے نتیجے میں پیدا شدہ بحرانی صورت حال سے نمٹنے لگے۔ وہ علاقائی اور ملکی سطح پر سیاست اور معاشرے کے تضادات، کشمکش اور تشدد پسندی کے شعور سے متصف ہیں۔''(1)

ڈاکٹر برج پریمی کے اس بیان میں صداقت ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد ریاست جموں و کشمیر کے بیشتر شعرا جدید شعری تقاضوں کے تحت شاعری کرنے لگے اور ساتھ ہی اس تقسیم کے نتیجے میں جو کربناک صورت ِحال پورے ملک کے ساتھ ساتھ ریاست میں رونما ہو رہی تھی، اُس کا عکس یہاں کے ادب میں بھی نمایاں ہوتا رہا۔ لیکن تقسیم ہند سے لیکر 1960 کے درمیانی عرصے میں کچھ ایسے پرانے اور بڑے شاعر بھی گزرے ہیں جو ان حالات سے واقف تو تھے، لیکن ان حالات کا زیادہ ذکر اپنی شاعری میں نہ کر سکے، بلکہ روایتی موضوعات ہی کو لے کر آگے بڑھتے رہے، یا یوں کہیے کہ نئی روش کا کوئی شاندار پسِ منظر ان کے ہاں نہیں ملتا ہے۔ راقم الحروف کی رائے میں تقسیمِ ریاست، فسادات اور ہجرت کے نتیجے میں ریاست میں اردو شاعری کا

یہ دور بڑا خاموش رہا ہے۔

جن شعرا کے مزاج کی انفرادیت 1947 سے 1960 کے درمیانی دور میں تشکیل پائی ۔ساتھ ہی مکانی اعتبار سے ملک گیر شہرت پائی اور زمانی لحاظ سے اردو شعر وادب کی تاریخ کے اوراق پر اپنے نام وکام کی مہر ثبت کی ،اُن میں میر غلام رسول نازکی ، رسّا جاودانی، شوریدہ کاشمیری، عابد مناوری، قیصر قلندر، شہ زور کاشمیری کے علاوہ چند غیر معروف شعرا،ہیمر اج ٹھپہ ہیرانگری، اشتیاق خورشید کاظمی، سید فطح حسین شاہ کاظمی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ان شعرانے اگر چہ 1947 سے قبل لکھنا شروع کیا تھالیکن ان کی انفرادیت اس دور میں زیادہ اُبھر کر سامنے آئی۔ایسا کہنا بھی ٹھیک نہیں ہوگا کہ انہوں نے صرف غزلیں لکھی ہیں بلکہ ان میں سے کچھ نے نظم نگاری، قطعہ نویسی، رباعی گوئی وغیرہ میں بھی قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔لیکن ان کی غزلیں نہ صرف معیار واقدار میں ان کے دوسرے کلام کے برابر ہیں بلکہ اردو شاعری میں اپنی فکری وفنی خوبیوں کی وجہ سے قابلِ مطالعہ بھی ہیں۔چونکہ میرا موضوع غزل گوئی سے متعلق ہے۔اس لیے میں ان کی غزلوں کو ہی اپنے مطالعے کا موضوع بناتا ہوں۔مذکورہ بالا غزل گوشعرا میں جس نے ایک خاص امتیاز کا ثبوت پیش کیا ہے، وہ بہرحال میر غلام رسول نازکی ہے۔

میر غلام رسول نازکی :۔

میر غلام رسول نازکی کا شمار ریاست جموں وکشمیر کے استاد شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی پیدائش 16ر مارچ 1910 کو اپنے ننہیال قصبہ سوپور کے ایک گاؤں ''وٹلب'' میں ہوئی۔نازکی کے والد کا نام میر غلام مصطفٰی نازکی تھا۔جو 1965 میں سرینگر سے ہجرت کر کے بانڈی پورہ میں آ بسے۔نازکی کے والد فارسی اور عربی زبانوں کے جید عالم تھے۔اس لئے نازکی کو بچپن ہی سے علمی ماحول میسر آیا۔نازکی نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔اس کے بعد بانڈی پورہ کے ایک مڈل اسکول میں داخلہ لیا۔

میر غلام رسول نازکی اردو کے علاوہ کشمیری اور فارسی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور ان زبانوں میں طبع آزمائی بھی کی ہے۔ ''نمرودٔ نامہِ'' ''آوازِ دوست'' 1985 اور '' کاوَینہ وول'' 1996 کشمیری زبان میں ان کے قابلِ قدر مجموعے ہیں۔ نازکی کا مزاج بچپن ہی سے شعروشاعری کی طرف مائل تھا۔ ابتدا میں فارسی شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے لیکن محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' کو پڑھنے کے بعد ان کے ادبی ذوق میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی اور اس طرح اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ اپنے شعری مجموعہ ''متاعِ فقیر'' میں انھوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''میں نے اسے (آب حیات) پڑھا اور آج تک مجھے یاد ہے کہ میں اسے پڑھ کر دیوانہ سا ہو گیا۔ بیسویں مرتبہ اس کتاب کو پڑھا۔ اس سے پہلے میں فارسی ادب وشعر کا دلدادہ تھا اور اردو کی چاشنی سے واقف نہ تھا۔ آبِ حیات پڑھ چکنے کے بعد میں نے اپنی رٹ بدل دی اور اردو کا عاشق ہوا۔'' (2)

میر غلام رسول نازکی کے یہاں قدیم و جدید دونوں ادوار کی شاعری کا رنگ پہچانا جا سکتا ہے، لیکن کلاسکی ادب کا اثر ان کے ہاں زیادہ نمایاں ہے جس کا احساس ان کی شاعری کو پڑھ کر بخوبی ہوتا ہے۔ نازکی کے اندر مشقِ سخن کا عنصر زیادہ تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ اکثر اوقات میں کتابوں کا مطالعہ کرنے میں منہمک رہتے تھے۔ نازکی کسی مخصوص تحریک یا رجحان سے وابستہ نہیں رہے، بلکہ جس چیز سے متاثر ہوتے تھے اسی رنگ کو اپنی شاعری میں بھر دیتے تھے۔ اس بارے میں ایک جگہ خود لکھتے ہیں۔

> ''اردو کے رجحان بدلتے گئے اور میں مسلسل مطالعے کے ذریعے اس کے بدلتے ہوئے رجحانات سے متاثر ہوتا گیا اور میرے کلام میں اس طرح تبدیلیاں آتی گئیں۔'' (3)

میر غلام رسول نازکیؔ کا پہلا اردو شعری مجموعہ ''دیدۂ تر'' کے عنوان سے 1948 میں چھپ چکا ہے۔ لیکن یہ مجموعہ اب نایاب ہے۔اس کے بعد 1989 میں نعتیہ کلام کا مجموعہ ''چراغِ راہ'' کے نام سے شائع ہوا اور 1996 میں ''متاعِ فقیر'' کے عنوان سے ایک اور شعری مجموعہ نظموں، غزلوں، نعت، مناجات، رباعیوں اور قطعات کے علاوہ آٹھ فارسی غزلوں پر مشتمل زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ہے۔اس مجموعے میں وہ کلام بھی شامل ہے جو ''دیدۂ تر'' میں چھپا تھا۔اس حقیقت کی طرف ''متاعِ فقیر'' کے صفحہ نمبر 6 پر یوں اشارہ ملتا ہے۔

> ''میر غلام رسول نازکیؔ کا پہلا مجموعہ کلام'' دیدۂ تر'' کے نام سے 1948 میں شائع ہوا تھا، یہ مجموعہ کلام اب برسوں سے نایاب ہے۔ادھر پچھلی دو تین دہائیوں میں ان کے کشمیری اور اردو کلام کے کئی مجموعے منظر عام پر آ گئے ہیں۔تاہم ان کے احباب اور قارئین کی آرزو تھی کہ ''دیدۂ تر'' دوبارہ طبع ہو۔دوستوں کے اصرار پر نازکیؔ صاحب اس کی اشاعتِ ثانی پر آمادہ ہو گئے اور ''چراغِ راہ'' 1989 کے بعد کا اردو کلام اس میں شامل کر دیا۔البتہ کچھ چیزیں ''دیدۂ تر'' کی حذف کر دی۔مقدار کے لحاظ سے یہ حذف و اضافہ خاصا معتد بہ تھا۔لہٰذا اس مجموعے کو ''دیدۂ تر'' کے نام سے شائع کرنا مناسب معلوم نہیں ہوا۔چنانچہ اب یہ مجموعہ ''متاعِ فقیر'' کے نام سے پیش ہو رہا ہے۔''(4)

مذکورہ بالا اقتباس سے نازکیؔ کی ادبی خدمات کا صحیح نشو و نما ہمارے سامنے آجاتا ہے۔میر غلام رسول نازکیؔ بہت اچھے سخن شناس تھے۔ان کا ابتدائی کلام ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتا رہا۔جن میں ہمایوں، ادبی دنیا، ساقی، کلیم وغیرہ شامل ہیں۔لیکن نازکیؔ کو بیرونی ریاستوں سے متعارف کرانے میں نظم

''ایک اندھی لڑکی کی دعا'' بنیادی وجہ بنی۔ یہ نظم جوشؔ ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہونے والے مشہور رسالے ''کلیم'' کے مارچ 1938 کے شمارے میں چھپی تھی۔ اس میں ایک معصوم لڑکی کے معصوم جذبات کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نظم میں شامل جذبات کے سبب اسے لاہور کے کئی اخباروں نے نقل کر کے شائع کیا ہے۔ یہاں میں اس نظم کے چند بند درج کرتا ہوں، تا کہ قاری کو نازؔ کی سخن فہمی کا اندازہ ہو سکے۔

تو نے تاروں کو ضیا بخشی ہے سورج کو جمال
بارشِ انوار سے دنیا کی کھیتی ہے نہال
نور پاشی میں آپ ہی اپنی ہے مثال
مجھ کو ان چیزوں کی کچھ خواہش نہیں اے ذو الجلال
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

سنتی آئی ہوں کہ کِھلتے ہیں چمن میں لالہ زار
روئے گُل پر رنگ برساتی ہے ساوَن کی پھوار
تازگی سی روح میں بھرتا ہے کلیوں کا نکھار
میں نہیں کہتی کہ یہ سب دیکھ لوں پروردگار
یہ تمنا ہے کہ اپنی ماں کی صورت دیکھ لوں

اس نظم کی قرأت ہی میں قاری کو اس کی فنی تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ شاعر نے اس میں کسی بھی علامت وغیرہ کا استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ نہایت ہی سیدھے سادے انداز میں انسانی جذبات کو پیش کیا گیا

ہے۔

میر غلام رسول نازکی کی پہلی غزل رسالہ ''ہمایوں'' میں چھپی تھی۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور شاعر نواب جعفر علی خان آثر نے لکھا ہے۔

''کہ یہ ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جس کی مادری زبان اردو نہیں مگر اس کے باوجود اغلاط سے صاف ہے۔''(5)

نازکی نے جو سب سے پہلی غزل کہی ہے، اس کے چند اشعار پیشِ خدمت ہوں۔ اس غزل میں فطرت نگاری کے نقوش ملتے ہیں۔ نازکی کو اپنے وطن کی حسین وجمیل وادیوں سے اتنا لگاؤ تھا کہ انھیں اپنے محبوب میں بھی ''کشمیر کی شادابی'' اور شیراز کی رعنائی'' نظر آتی ہے۔

اس شوخ کو کیا دیکھا آنکھوں میں سمٹ آئی
کشمیر کی شادابی شیراز کی رعنائی!

ہر شے کی حضوری میں جھکوا دیا سر میرا
اے ذوقِ جبیں سائی اے لذتِ رسوائی

سوکھا ہوا سبزہ ہوں گُل زارِ محبت کا
کب سایہ فگن ہوگا وہ سرود لارائی

نازکی کے کلام میں فکر کی گہرائی ہے۔ زندگی کے تک ودو میں نازکی نے جو کچھ پایا ہے اس کا عکس ان کے کلام کے تناظر میں پوری طرح واضح اور صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کے یہاں تخیل آرائی اور لسانی برتاؤ زیادہ نہیں ملتا۔ وہ اپنی بات کو نہ تو گہنوں سے سجاتے ہیں اور نہ ہی غازے Make up سے

انھیں مصنوعی حسن عطا کرتے ہیں ، بلکہ سیدھے سادے الفاظ میں انسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ نازکی کی سادہ بیانی کے بارے میں ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں۔

> ''نازکی صاحب ہمارے یہاں کے کہنہ مشق اور بزرگ شاعروں میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔حق تو یہ ہے کہ وہ ہمارے یہاں کے اساتذہ میں ایک اہم نام کے حامل ہیں۔اُن کی غزلیں روایت اور جدت کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔اُن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی سادگی ہے۔''(6)

نازکی کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جذبات کے بہاو میں زیادہ نہیں بہتے ، بلکہ عقلی قوتوں کو بروئے کار لاکر جذبات کو قابو میں رکھتے ہیں۔جس سے ان کی شاعری بیجا جذبات سے بچ جاتی ہے۔نازکی نے زندگی کے مختلف حالات وواقعات سے متصادم ہوکر اندرونی ردِعمل کولفظوں کا جامہ پہنایا ہے۔ان کی شاعرانہ بصیرت کے متعلق پروفیسر حامدی کاشمیری رقمطراز ہیں۔

> ''نازکی صاحب کی شاعری میں جوشعری کردار اُبھرتا ہے، وہ تحرک، پہلوداری، جذباتی رنگینی،عقلی توازن اور جمالیاتی احساس سے متصف ہے اوراپنے خالق کی بھرپوراور ہمہ جہت شخصیت کا تاثر اُبھارتا ہے۔ اس سے نازکی صاحب کے شعری ذہن کی فعالیت اور اُن کے فکری رویوں کی رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔''(7)

نازکی کے یہاں تفکراور تخلیقی صلاحیت جسکی طرف پروفیسر حامدی کاشمیری نے اوپراشارہ کیا ہے، وہ بہت اہم ہے۔نازکی فکری وتخلیقی صلاحیت کی بناپراپنے عہد میں منفرد تھے۔ان کی ساری زندگی، جدوجہد کی

ایک طویل اور پُر درد داستان معلوم ہوتی ہے۔وہ اپنی ذاتی زندگی کی سختیاں برداشت کرتے رہے اور اپنی شخصیت منتشر ہونے سے بچانے کے لئے شعر گوئی میں منہمک رہے۔ نازکی کسی ایک دور کے شاعر نہیں تھے بلکہ وہ قدیم وجدید سے نکلتے ہوئے مابعد جدید دور تک اپنا ادبی سفر طے کرتے ہیں۔ان کے تعلق سے ڈاکٹر شبینہ پروین لکھتی ہیں۔

''ان (نازکی) کا شمار اساتذہ میں بھی ہوتا ہے اور شاعری خاص کر کلاسکی شاعری سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔انہوں نے ابتدا میں قدیم اساتذہ کی پیروی کی اور ساتھ ساتھ وہ جدید شاعری کا بھی مطالعہ کرتے رہے۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے کلام میں جدت وندرت ہی نہیں، تخلیقی برتاؤ اور اندازِ بیاں کے اعتبار سے عظمت اور وسعت پیدا ہوئی، انھوں نے بعد میں اپنی قدیم رنگ کی غزلیں کہنا متروک کی۔''(8)

نازکی نے معاشرتی اور فکری دونوں سطحوں پر زندگی، مرگ، آرزو، غم، بے چارگی اور خوف کے مسائل پر غور وخوض کیا ہے۔ان حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شبینہ پروین رقمطراز ہیں۔

''ان (نازکی) کے یہاں غمِ روزگار، عشق، حسن، درد، تزکیہ نفس، درد وحسرت، بے ثباتی دنیا ملتی ہیں۔ان کے یہاں احساسِ غم سب سے زیادہ نمایاں ہے۔''(9)

مذکورہ بالا اقتباس میں جن خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُن کا احساس عام قاری کو نازکی کی شاعری کو پڑھ کر بخوبی ہوتا ہے۔ نازکی نے قدیم شعری سرمائے کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا، وہ شاعری کی کلاسکی روایت سے متاثر تھے۔اس لیے ان کی شاعری موضوع واسلوب دونوں اعتبار سے قدیم و

جدید کا ایک حسین امتزاج معلوم ہوتی ہے۔ نازؔکی کے دل و دماغ میں جو متنوع خیالات گونجتے رہیں۔ انھوں نے ان خیالات سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کی ہے اور اپنی شعری بصیرت سے کام لیکر ان کو بڑی مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نازؔکی اپنی شناخت کے لیے صرف محبت اور حساس دل نہیں رکھتے، بلکہ اپنے احساس و جذبات کے اظہار کے لیے انفرادی رویہ بھی اختیار کیا ہے۔ نازؔکی کے غم کی دنیا ان کے اپنے تجربوں سے تشکیل پاتی ہے۔ ان کے کلام میں غم کی لکیر اتنی نمایاں ہے کہ ان کی شاعری کی ایک ساخت مرتب ہو چکی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آج ہر درجہ اُداسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑو
التجا ایک ذرا سی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑو

یہ مایوسیاں ہیں کہ مجبوریاں ہیں
نہ جینے کی خواہش نہ مرنا گوارا

نہ قسمت میں حیاتِ جاوداں ہے
نہ اپنے بس میں مرگِ ناگہاں ہے

میری مجبور دنیا پہ مسلط!
اندھیرا ہے، سیاہی ہے، دھواں ہے

آج کی رات بھیانک ہے مرے ساتھ رہو
اور قیامت بھی پیاسی ہے! مرا ساتھ نہ چھوڑو

مذکورہ بالا اشعار میں شامل لفظیات، اُداسی، مایوسیاں، مجبوریاں، جینا، مرنا، مرگِ ناگہاں، اندھیرا، سیاہی، دھواں، بھیانک رات، پیاسی قیامت دراصل شاعر کی اس ذہنی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں جو زندگی کے مشکل ترین لمحات میں ان پر طاری تھی۔ کیونکہ الفاظ یوں ہی شعر میں نہیں ڈھل جاتے بلکہ اس کے پیچھے شاعر کی زندگی بھی ہے اور اس کا معاشرہ بھی۔

میر غلام رسول نازکی کے عہد میں ریاست میں علامہ اقبال کی شاعری کی شہرت بہت زیادہ تھی۔ نازکی کے ہاں بھی اقبال کے اثرات ملتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو ہمیں اقبال کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔ جس کا اندازہ ان چند اشعار کو پڑھ کر بخوبی ہوگا۔

ترا مقام، مقامِ رضا سے آگے ہے
خودی نہ بیچ، طفلی نہ بن، سوال نہ کر

خدا بھی تجھ سے جو پوچھے تری رضا کیا ہے
قلندری کا تقاضا ہے عرضِ حال نہ کر

جب سے پھینکی فکرِ انسان نے ستاروں پر کمند
زندگی دشوار تھی دشوار تر ہونے لگی

مری خلوتوں کی رونق مری جلوتوں کی زینت
تری ہر ادائے رنگین ترا حسن صاف و سادہ

مذکورہ بالا اشعار علامہ اقبالؔ کے آہنگ کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی ان کے یہاں بہت سی ایسی مثالیں ملیں گی۔

نازکیؔ کی غزلوں میں جذبۂ حسن و عشق ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ عاشقانہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کے یہاں جذبۂ عشق کی سطح قدرے مختلف ہے۔ کیونکہ وہ اس جذبے کو شہوت اور اخلاقی پستی سے دور رکھتے ہیں اور حسن و عشق کے امتزاج سے ایک جمالیاتی فضا کی تخلیق کرتے ہیں، یہ فضا انسانی جذبات کی قوس قزح سے چمکتی ہے۔

خواب تھا یا طلسم کا عالم
تیرے آنے سے تیرے جانے تک

میرے نغموں کی موسیقار تم ہو
میرا دیپک میرا ملہار تم ہو

میں فواروں میں کر لوں گا چراغاں
کہ میری شانِ شالیمار تم ہو

مچل نہ جائے کہیں یہ دل فراق پسند
خدا کے واسطے آزمائش جمال نہ کر

بن کے فردوس نظر آتی ہے سب کے سامنے
وہ صنوبر قد، سمن اندام، سلمائے بہار

آخری شعر میں جن تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے، وہ ہمارے ہاں موجود روایتی تشبیہات کے بالکل قریب ہیں۔صنوبر قد، سمن اندام، سلمائے بہار جیسی تشبیہات میں طرفین تشبیہ میں کافی مطابقت پائی جاتی ہے۔جو موضوعی نہیں بلکہ معروضی ہے اور یہ تشبیہات اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھنے کے بعد ہی شاعر کے باطن میں جنم لیتی ہیں۔

نازکی کے کلام میں کئی ایسے اشعار ملیں گے جن سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان اشعار کے خالق نے حال کو ماضی سے ملا کر مستقبل کا آئینہ دار بنایا ہے۔شاعر نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے ماضی سے رشتہ نہیں توڑا ہے، بلکہ اس کو اپنے حال سے اس طرح ملایا ہے، جیسے وہ حال کا حصہ ہو اور حال سے وہ بات کہلوائی ہے جس میں مستقبل کے نقوش واضح ہو۔اس تعلق سے یہ اشعار دیکھئے جو تقریباً پچھتر سال پہلے لکھئے گئے ہیں اوران کی مطابقت اُن حالات پر کیجئے جن سے ہم گزر رہے ہیں، یا جن سے ہمیشہ گزرنے کا اندیشہ ہے۔

موت کا نام جب سنتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں لوگ
تم نے دیکھا ہم نے دیکھا پھر بھی مر جاتے ہیں لوگ

اہلِ قلم ہوں، اہل زبان ہوں کہ اہل درد
لازم ہے احتیاط، زمانہ خراب ہے

میرے رہبروں سے پوچھو یہ کہاں کی رہبری ہے
نہ کہیں نمودِ منزل نہ کہیں نشان جادہ

زمانے کی بے التفاتی اور اپنی ذاتی زندگی کے پست و بلند مقام نے نازکی کی طبیعت میں ایک قنوطیت سی پیدا کر دی ہے۔ یہی اُلجھن نازکی کی شاعری کا سرچشمہ ہے اور یہیں سے ان کے کلام میں وہ درد اور اثر پیدا ہوتا ہے جو حقیقت نگاری کا خاصہ ہے اور اسی لیے کہتے ہیں۔

ہم نے اس دنیا سے کیا چھینا ہے دوست!
پرسشِ اعمال ہم سے، کس لیے

اگر چہ نازکی زندگی کے کچھ معاملات میں ناکام و نامراد ہی رہے ہونگے لیکن وہ عام قنوطیوں کی طرح غم کھا کر دنیا کی لذتوں سے محروم نہیں رہنا چاہتے ، بلکہ غم سے ایک نیا حوصلہ پاتے ہیں۔ نازکی کی شاعری صحیح معنوں میں ایک دُکھے دل کی پکار ہے۔ ان کی زندگی غم سے پُر ہے اور غم ان کے لیے زندگی کی ایک اہم ترین حقیقت سے عبارت ہے۔ انسانی زندگی سے غم کا جزو اگر نکال دیا جائے ، تو زندگی بے معنی سی بن جاتی ہے۔ اس اعتبار سے غم بنی نوع انسان کے لیے ایک قیمتی اَثاثہ ہے اور غم کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ غم کا یہ خوشگوار تصور جسے اردو شاعری میں میرؔ و غالبؔ کے بعد فانیؔ بدایونی نے مستقل موضوع کے طور پر روشناس کیا، قنوطیت اور یاسیات کے اُس قدیم دور سے بالکل الگ اور جداگانہ ہے۔ کیونکہ یہ غم انسان کو نہ فرار ہونے پر مجبور کرتا ہے اور نہ ہی بے عملی کی طرف مائل کرتا ہے۔ نازکی کے یہاں غم کا یہ تصور اتنا شدید ہے، کہ ان کے نزدیک غم ہی بندہ و مولا میں ’’وجہ ارتباط‘‘ یعنی Affinity ہے اور روح کی بالیدگی کے لیے صرف ’’دلِ اندوہ گیں‘‘ یعنی Sorrowful spirit کی ضرورت ہے۔ اسی لیے لکھتے ہیں۔

غم میانِ بندہ و مولیٰ ہے وجہِ ارتباط
باعث قربِ خدا ہم پایۂ روح الامین

غم کو تونے کیا سمجھ رکھا ہے میرے ہمنشیں
روح کو شاداب کرتا ہے دلِ اندوہ گیں

نازکی کے یہاں غم کی بھی ایک انفرادی جمالیات ملتی ہے۔ وہ غم سے گھبراتے نہیں ہے بلکہ اس سے مسرت اخذ کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ وہ غم کو عطائے الٰہی سمجھ کر ایک لازوال دولت تصور کرتے ہیں۔

میرے خیال میں غم لا زوال دولت ہے
میں غم نصیب کو کس منہ سے بد نصیب کہوں

غم کے متعلق متعدد اشعار ان کی غزلوں میں موجود ہے اور یہ تمام اشعار غم کی جانب شاعر کے عاشقانہ رویے کے غماز ہیں۔ یہ رویہ اُن کا اپنا اور ذاتی ہے، جو قابلِ داد ہے۔

اردو کے بیشتر شعرا کی طرح میر غلام رسول نازکی کے شعری مجموعے میں حمدیہ کلام کے علاوہ کئی نعتیہ غزلیں بھی ملتی ہیں۔ ایک مومن کے لیے اطاعت خداوندی کے ساتھ اطاعت رسولؐ بھی ضروری ہے اور اس کا دارومدار خشیت الٰہی اور محبت رسولؐ کے بغیر ناممکن ہے۔ نازکی نے حمد کے بعد نعتیہ غزلوں میں بھی طبع آزمائی کر کے ان دونوں اجزا کو ملحوظِ نظر رکھ کر اپنی عقیدت و محبت کو نعتوں میں پیش کیا ہے، ان کی ایک نعتیہ غزل کے چند اشعار دیکھئے، جن میں اللہ کے رسولؐ کے تئیں اپنی عقیدت و احترام کا اظہار ملتا ہے۔

تابندہ تر ہے خاک مری مہرو ماہ سے
وابستہ ہوں جناب رسالتؐ پناہ سے

منسوب جب سے ہوں مدنی کجکلاہؐ سے
ڈرتا نہیں ہوں میں کسی عالم پناہ سے

یہ حقیقت ہے کہ جس انسان کی نسبت رسولِ کائناتؐ سے ہوتی ہے، وہ دنیا کے کسی بھی انسان سے نہیں ڈرتا ہے، بلکہ اپنے وجود کو ایک چمکتے ہوئے ستارے کی مانند سمجھتا ہے۔ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

آپ کے در کی خاک کا ذرہ
سرمۂ دیدۂ اولولابصار

آپؐ کا نام روح کا آرام
آپؐ کی ذات مرکزِ ادوار

محمدؐ کی شانِ عظمت کو وہی انسان پہچان سکتا ہے جو صاحبِ ایمان وصاحبِ نظر ہواور وہ انسان مدینے کی مٹی کو اپنی آنکھوں کا سرمہ سمجھتا ہے اس طرح وہ محمدؐ کا ذکر کر کے اپنے روح کو سکون بہم پہنچاتا ہے۔

نازکی نے زبان و بیان کے سلسلے میں بڑے احتیاط سے کام لیا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں ثقیل الفاظ کے بجائے سیدھے سادے الفاظ استعمال کیے ہیں۔نازکی کو اپنی اردوشناسی پہ بڑا ناز تھا۔ایک شعر میں صنعتِ تعلّیٰ کا استعمال کر کے خود کو کشمیر کا سب سے بڑا سخن شناس سمجھا ہے اور اپنے آپ کے زبان داں ہونے کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

کشمیر کا رہنے والا ہوں، اردوئے معلّیٰ لکھتا ہوں
اس دیس میں مجھ سا کوئی بھی اردو کا سخنور ہو نہ سکا

مذکورہ بالا شعر سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ نازکی کو اپنی زبان دانی پر بڑا فخر تھا۔غلام رسول نازکی کی غزلوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان میں مدہوش جوانی کا وہ اُبلتا ہوا جوش نہیں ملتا، جو وقتی طور پر جذبات کو اُبھار کر پھر سرد پڑ جاتا ہے، بلکہ ایک ایسے عظیم شاعر کی پختگی اور عظمت کارفرما ہے جس نے دنیا کو کئی

زاویوں سے دیکھا اور پرکھا ہے۔حسن وعشق کی نرم ونازک کیفیات کو نازکی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آدمی پڑھتا جاتا ہے اور زبان چٹخارے لیتی جاتی ہے۔روانی کا یہ عالم ہے کہ قاری کو کسی مدو جزر یا نشیب وفراز کا احساس تک نہیں ہوتا۔باتیں تو وہی پُرانی ہیں لیکن انداز الگ ہے۔نموناً یہ چنداشعار ملاحظہ کیجئے۔

دنیائے محبت کی ہر چیز نرالی ہے
خاموش اشاروں پر بنیادِ تکلم ہے

محبوب کے ہونٹوں پر سیلابِ تبسم ہے
یا نور کے دریا کی موجوں میں طلاطم ہے

دوسرے شعر میں ''سیلابِ تبسم'' کی جو ترکیب استعمال کی گئی ہے اس پر بہت سارے لوگوں کو اعتراض بھی ہوسکتا ہے۔کیونکہ اس میں طرفین تشبیہ یعنی مشبہ اور مشبہ بہ میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی ہے۔لیکن میرے حساب سے اس میں معروضی نہ صحیح موضوعی مطابقت ضرور ہے۔اس طرح کی تراکیب اپنے ماحول کو غیر مروج طریقے سے دیکھنے کے بعد ہی پیدا ہوسکتی ہیں۔

شاعر اپنے سماج کا حساس ترین فرد ہوتا ہے ۔وہ اپنے سماج میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کا اثر دوسروں کے مقابلے میں جلد قبول کرتا ہے۔ان حالات سے واقف ہونے کے لیے وہ چلتے پھرتے انسانوں کی دنیا میں سانس لینے پر مجبور ہے۔تخیل کی کھوکھلی بلند پروازیوں کے سہارے سے اب چھپروں میں رہنے والوں کو ڈائنگ روم کے خواب نہیں دکھائے جا سکتے ہیں۔نازکی ادبیات (Literature) کے اس علامتی رجحان (symbolic trend) سے نظر نہیں چراتے ہیں، بلکہ اپنے سماج کو اور قریب سے دیکھتے ہیں۔

بغض و عداوت، رشک و رقابت، آپا دھاپی، چیخ پُکار
ابلیسوں کے چیلے چانٹے، شیطانوں کے برخوردار!

کھوٹ دلوں میں، جھوٹ لبوں پر، قول سے ان کے فعل جدا
صبح کو یزداں، شام کو شیطاں، رات سے دن کے فعل جُدا

مذکورہ بالا اشعار میں عصری حسیت کا بیان زیادہ وسعت کا حامل ہے۔ پرانے سماج میں بغض، عداوت، رشک، رقابت، جھوٹ، آپا دھاپی، چیخ و پکار جیسے بُرے اور شیطانی خصائل شاذ و نادر ہی ملتے تھے، لیکن موجودہ دور کے انسان نے ان تمام خصائل کو اپنے اندر اس طرح پیوستہ کر کے رکھا ہے کہ وہ اب انھیں چیزوں سے پہچانا جاتا ہے۔ شاعر نے اس طرح کے لفظیات سے اپنے سماج میں پھیلی برائیوں کا نقشہ کھینچا ہے جو شاعر کی وسعتِ نظر کا خاصہ ہے۔

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ نازکی کی غزل گوئی قدیم و جدید دونوں اسالیب سے مستفیض ہے۔ اس لیے وہ اپنی ادبی خدمات کی عوض دنیائے ادب میں احترام کی نظر سے دیکھے جانے کا حق رکھتے ہیں۔ نازکی نے اپنی تمام عمر ادب کی آبیاری میں گزار کر 16 / اپریل 1998 کو انتقال فرمایا۔ ان کے جسدِ خاکی کو اپنے خاندانی قبرستان بمقام ''کاٹھی دروازہ'' سرینگر میں دفن کیا گیا ہے۔

شوریدہ کاشمیری:۔

پروفیسر شوریدہ کاشمیری ریاست کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ ان کا اصل نام غلام محمد ملک تھا، لیکن ادبی حلقوں میں ''شوریدہ کاشمیری'' کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ شوریدہ نے اپنی شاعری میں کئی تخلص اختیار کیے ہیں۔ پہلے ''فلاح''، تخلص تھا، بعد میں ''شوریدہ'' اختیار کیا اور جہاں ان دو میں کوئی سما نہیں سکتا تھا

وہاں پر اپنے نام کا جُزو ''ملک'' اختیار کیا ہے۔شوریدہ کی پیدائش 18 / مارچ 1924 کو موضع پنجورہ، تحصیل شوپیان میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے خانگی اسکولوں سے حاصل کرنے کے بعد 1941 میں ریاست کے مشہور کالج ''سری پا تاپ'' سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ریاست کے بیشتر ادبا کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے اسی کالج سے رہا ہے۔یہ کالج اس وقت کا ایک بہت بڑا ادبی مرکز تھا۔شوریدہ کا ذوقِ سخن اسی کالج کی ادبی فضا میں رہ کر پروان چڑھا۔اس تعلق سے معلومات بہم پہنچاتے ہوئے شوریدہ خود لکھتے ہیں۔

> ''مارچ 1941 میں میٹرک پاس کرنے کے بعد سری پرتاپ کالج سرینگر میں داخلہ حاصل کیا۔یہیں سے شعر گوئی کا آغاز ہوا۔چند ماہ بعد پرنسپل ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے کالج کے ایک ادبی جلسے میں جب میری ایک غزل سماعت فرمائی،تو مسرت کے ساتھ میرے اچھے مستقبل کی طرف اشارہ کیا۔1943 میں ایف۔اے پاس کر کے میں نے امر سنگھ کالج میں داخلہ لیا، کیونکہ بی۔اے کی کلاسیں یہیں منتقل ہوگئی تھیں۔اب جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کالج کے پرنسپل ہوکر تشریف آور ہوئے۔کچھ عرصہ بعد ان کی صدارت میں بمقام نمائش گاہ سرینگر ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مجھے بھی اپنا کلام پیش کرنے کا موقع ملا۔میری دو غزلوں سے محظوظ ہوکر ڈاکٹر صاحب نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔اس سے پہلے یہ غزلیں جناب عبدالسمیع پال اثر صہبائی کی نظر سے گزری تھیں اور انھیں بہت سراہا تھا۔دونوں بزرگوں کی مشفقانہ حوصلہ افزائی نے مجھ میں اعتماد پیدا کیا۔کلام دیکھ کر فرمایا: ''اصلاح کی ضرورت نہیں، آگے بڑھتے رہیے۔'' بلکہ قبل الذکر نے طلبا کے ایک ادبی

مناظرے کے بعد جس میں میں بھی شریک تھا، شوریدہ کے بجائے
''انسان'' تخلص کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر بوجہِ خاص اختیار نہ کر سکا۔
پہلے میرا تخلص '' فلاح'' تھا، بعد میں بدل دیا۔ لیکن جہاں لفظ
شوریدہ سمانہیں سکتا، وہاں اپنے نام کا جُز '' ملک'' استعمال کرتا
ہوں۔ کبھی کبھی بے تخلص ہی اپنا کلام چھوڑ جاتا ہوں۔''(10)

مذکورہ اقتباس میں شاعر نے خود کے شاعر بننے کی اصلیت اور اس کے بنیادی وصف سے آگاہی تو دی ہے لیکن ان کے فن کو پرکھنا قاری کی ذمہ داری ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے شعری ادب میں شوریدہ نے ایک خاص مقام پایا ہے۔ وہ نہ صرف اردو زبان سے واقف تھے بلکہ اس کے علاوہ، فارسی، عربی اور انگریزی علوم کا گہرا شغف رکھتے تھے۔ وہ بیک وقت ایک بہت اچھے رباعی گو، قطعہ نویس، غزل گو اور نظم نگار شاعر تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے '' جوشِ جنوں'' 1980 اور '' جذب دروں'' 1988 کے عنوانات سے بساطِ ادب پر پھیلے ہوئے ہیں۔ جو مختلف اصناف نظموں، غزلوں، قطعہ اور رباعیوں پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی خطوط کا مجموعہ '' خطاب خامہ'' احادیث کا منظوم ترجمہ '' کلماتِ نبویؐ '' کے علاوہ چند مضامین اور کچھ کتابوں پر لکھے گئے تبصرے شوریدہ کی ادبی جہات کا اہم ثبوت ہے۔ شوریدہ کے کلام پر اردو کے اہم ناقدین نے تبصرہ کیا ہے اور انھیں اردو کا صاحبِ طرز اور ماہرِ فن ادیب قرار دیا ہے۔ اس تعلق سے شوریدہ نے بجا فرمایا ہے۔

سب نے شوریدہ کو دی دادِ سخن
باقی اب تیری داد ہے پیارے
(29/ اکتوبر 1960)

شوریدہ کاشمیری اردو کے عظیم شعرا میر تقی میر، غالب، میر درد اور علامہ اقبال کی شاعری سے بے حد

متاثر تھے۔ان کے یہاں ان شعرا کے استعمال کردہ بہت سے الفاظ اور تراکیب ملتی ہیں، مثلاً دیدہ ور پیدا، پیکر خاکی، سوزِ جگر، سجدہ کناں، سحر نورد، نالۂ دل، مجنوں، صحرا، زنجیر، زلف، کاکل وغیرہ۔اس حقیقت کا احساس نہ صرف قاری کو ہوتا ہے بلکہ شوریدہؔ نے خود ان کو اپنا استاد مانا ہے، جس کا اعتراف اپنے ایک شعر میں یوں کرتے ہیں۔

دردؔ و میرؔ اور غالبؔ و اقبالؔ
چاروں شوریدہؔ ہیں مرے استاد
(فروری، 1956)

شوریدہؔ نے ان شعرا کی تقلید کا نہ صرف اعتراف کیا ہے، بلکہ ان کی شاعری میں جا بجا تقلید اور اثر پذیری کے نقوش ملتے ہیں۔ان کے یہاں میرؔ کے انداز کو نئی زبان اور نئے تجربات میں جذب کر لینے کا میلان بھی نظر آتا ہے۔میر تقی میرؔ کی ایک مشہور غزل کی زمین میں لکھی گئی شوریدہؔ کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔پہلے میرؔ کا شعر دیکھیے۔

ہمارے آگے تیرا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

اب شوریدہؔ کی اسی زمین میں لکھی گئی غزل کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

لوگ جب تیرا نام لیتے ہیں
دل کو ہم تھام تھام لیتے ہیں

ان دونوں اشعار کا مضمون ایک جیسا ہے۔اس طرح یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ شوریدہؔ نے یہ مضمون میرؔ سے مستعار لیا ہے۔آگے اسی غزل کے باقی اشعار دیکھیے، جن میں میرؔ کے اندازِ بیاں کا پرتَو ملتا ہے۔

یاد آتے ہیں عشق میں اصنام
غم میں اللہ کا نام لیتے ہیں

کام کیا ہم کو اہلِ دولت سے
اہلِ دل کا سلام لیتے ہیں

عالمِ ہائے ہُو میں شورؔیدہ
جذبۂ کامل سے کام لیتے ہیں

شورؔیدہ کی شاعری با مقصد ہے، بلکہ یوں کہیے کہ ذہنی عیاشی کے قبیل کی چیز نہیں ہے۔شورؔیدہ پہلے شاعر ہے اور پھر کچھ اور، حقائقِ زندگی کا احساس اور ان کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی تمنا، روایت کی پاسداری اور ایک مخصوص شوریدہ صفت مزاحیہ لے اس شاعری کے نمائندہ خدوخال ہیں۔

جامِ آبِ حرام پی نہ سکے
چائے سے انتقام لیتے ہیں

شورؔیدہ کاشمیری وسیع النظر شخصیت کے مالک تھے۔انھوں نے انسانی زندگی کے نشیب وفراز کو اپنا موضوع بنایا ہے۔انھوں نے اپنے اردگرد رونما ہونے والے حالات کو دیکھ کر نظر نہیں چرائی، بلکہ انسانی و روحانی قدروں کی بربادی اور بے حرمتی کے شکوہ سنج رہے۔ان کی پوری زندگی اندرونی واردات اور مشاہدات کو رقم کرنے میں گزری ہے اور ان حالات کو پیش کرتے ہوئے فنی لوازمات کا بھی احترام کیا ہے۔شورؔیدہ کو اپنی شاعری کے با مقصد ہونے کا پورا شعور تھا۔اسی لیے کہتے ہیں۔

شوریدہ ہے تیری شاعری کیا
خیر و حق و حسن کی ادا بند

اس خیر وحق وحسن کا سرچشمہ، اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس کے وجود کی تائید کائنات کا ذرہ ذرہ کرتا ہے۔توحیدِ وجودی کا بنیادی تصور یہی ہے کہ حق تعالیٰ ہر شے کی اصل، ہر شے پر قادر اور ہر شے کی حقیقت ہے۔شوریدہ کے نزدیک دنیا کی ہر شے ذاتِ خداوندی کی ایک تجلی ہے۔

چاند تاروں میں بحر و بر میں ہے
ڈھونڈتے کیا ہو حجتِ اسلام

چیر لو کائنات کا سینہ
دیکھ لو اس میں فطرتِ اسلام

دینِ اسلام کا صحیح راستہ اللہ کے رسولوں نے دکھایا ہے اور محمدِ عربی نے اس مشن کی تکمیل فرمائی ہے۔ شوریدہ کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ زندگی کی تعمیر تخریبی بنیادوں پر نہیں کی جا سکتی بلکہ اس کے لیے مثبت حقائق پر پختہ عقیدہ ہونا ضروری ہے۔

پکارتا ہے زمانے کو حرف الا اللہ
جہاں میں عقدہ کشا صرف لا الاہ ہے

اس طرح شوریدہ کے یہاں رومانیت کے ساتھ ساتھ تصوف کی گل فشانی بھی موجود ہے۔شوریدہ نے ان کیفیات کو سلیقے سے بیان کیا ہے، یہاں شوریدہ نے ایک تو شاعری کا حق ادا کیا ہے اور ساتھ میں مذاقِ تصوف رکھنے والوں کی دل بستگی کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔

شوریدہ کاشمیری اردواور فارسی ادبیات (Literature) کی روایت کا گہرا شعور رکھتے تھے۔اردو اور فارسی زبان کے عظیم فنکاروں کا اثر ان کی شاعری پر واضح ہے۔وہ کلاسکی رنگِ شاعری کے رسیا تھے۔ان کی شاعری کو پڑھتے ہوئے قدم قدم پر قدیم اساتذہ کی یاد آتی ہے۔روایت کا یہ شعور اوراس کے ساتھ موافقت کی لگن ہر بڑے فنکار کی لازمی صفت ہے،مگر ایک اچھا فنکار وہی ہے جو روایت کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کا لوہا منوا سکے۔لیکن شوریدہ کی شاعری کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ روایت کی جانبداری نے انھیں جدید دور کے ادبی تقاضوں سے کافی حد تک بےفکر کر دیا ہےاور جس کے بوجھ تلے ان کی اپنی انفرادی حیثیت دب کر رہ گئی ہے۔جدید دور کی شاعری کے تعلق سے اُن کا یہ شکوہ بجا ہے۔

دورِ حاضر کی شاعری یارو
جس میں لیلےٰ نہیں وہ مہمل ہے

جدید شاعری کے نام پر جو لغویات سامنے آ رہی ہیں، حقیقی شعروادب کی پاسداری کے لیے ہر فنکار اور قاری کے لیےاس سے اجتناب کرنا ضروری ہے لیکن اسے تخلیقی سطح پر جدید عہد کے تقاضوں سے سبکدوش ہونے کا عذر نہیں بنایا جا سکتا،شوریدہ میں جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی خواہش یقیناً موجود ہے۔ورنہ وہ اس قسم کے خیالات پیش نہیں کرتے۔

بھیڑ و جنگل کی راہ لے لو
اس شہر میں بھیڑیے بہت ہیں

وہ بوڑھا عجب شعبدہ باز تھا
بالآخر شجر میں اٹکتا رہا

لیکن اس طرح کے اشعار ان کے یہاں مشکل سے ہی ملتے ہیں۔شوریدہ کاشمیری روایتی شاعری کی

تقلید میں بہت زیادہ پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں۔شوریدہ کے موضوعات متنوع ہیں اور وہ شاعری میں کلاسکی روایات کی پاسداری کرتے ہیں۔انھیں اردو زبان کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا۔اس لیے اردو زبان کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

چکبست و نسیم کی یہی ہے بھاشا
اقبال وغالب کی زبان ہے اردو

شوریدہ کے یہاں روایتی شاعری کے بہت سے نمونے ملتے ہیں اور بعض اوقات انحراف کے رویے بھی نظر آتے ہیں۔انھوں نے روزمرہ زندگی کے مختلف مسائل کو شاعری کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ساتھ ہی ان کی شاعری قدیم وجدید کا ایک حسین سنگم نظر آتی ہیں۔

غم میں یوں دل کا داغ ہے روشن
شب کو جیسے چراغ ہے روشن

ہر دم اس کا خیال آتا ہے
شوق کو کب زوال آتا ہے

شوریدہ کاشمیری نام نہاد یا شاعرانہ قسم کے مسلمان نہیں، بلکہ سچے اور شعوری معنوں میں مسلمان تھے۔اسلام کے نظام حیات کے ساتھ نہایت عقیدت رکھتے تھے اور محمدِ عربیؐ کو امامِ آزادی تسلیم کرتے ہیں۔

وہ جس نے طوق و سلاسل سے کر دیا آزاد
وہ اُمیؐ عربیؐ ہے امامِ آزادی

شوریدہ کے یہاں کئی نعتیہ غزلیں بھی ملتی ہیں۔جن سے ان کے عاشقِ رسولؐ کے ہونے کا پتہ چلتا

ہے۔ یہاں ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جو سفرِ حجاز کی روداد معلوم ہوتے ہیں۔

مکاں سے خدا کے مکاں جا رہا ہوں
میں مجذوب دار الاماں جا رہا ہوں

جہاں نور برسے جہاں طور ترسے
جہاں اور ہی ہے جہاں جا رہا ہوں

فقیرانہ ہو وضع یا عاشقانہ
بدرگاہِ شاہ شہاں جا رہا ہوں

وہاں سے میں شوریدہؔ سرشار لوٹوں
یہاں سے تو آتش بجاں جا رہا ہوں

مذکورہ بالا اشعار میں شوریدہؔ نے بڑے ہی خلوص و انکساری کے ساتھ اپنا نظرانۂ عقیدت بارگاہِ الٰہی اور رسولِ خداؐ کے دربار میں پیش کیا ہے۔

اردو شاعری میں عربی، فارسی اور ہندی زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ پہلے سے ہی ملتے ہیں۔ لیکن اردو نے انھیں اپنی طبیعت کے مطابق تراش وخراش کر کے اپنی محفل کے قابل بنایا۔ مثلاً رپورٹ کو رپٹ، لینٹرن کو لالٹین وغیرہ۔ لیکن جدید دور میں انگریزی الفاظ کو شاعری میں من وعن استعمال کیا گیا ہے۔ اس بات پر تمام محققین رطب اللسان ہیں کہ اردو غزل میں انگریزی زبان سے آئے ہوئے الفاظ

پوری سنجیدگی اور شاعرانہ تغزل کے ساتھ پہلی بار بشیر بدؔر نے استعمال کیے ہیں۔ جب انھوں نے 1961 میں لکھے گئے اپنے ایک شعر کے مصرعے میں انگریزی کا لفظ ''pullover'' لایا تھا۔ مصرعہ ملاحظہ ہوں۔

وہ زعفرانی'' پُلوور '' اسے کا حصہ ہے

لیکن مجھے اس بات پر اتفاق ہوتے ہوئے، تب بے اتفاقی ہوئی جب شوریدؔہ کے مجموعہ کلام ''جوشِ جنوں'' میں کچھ ایسے اشعار دستیاب ہوئے، جن میں باضابطہ طور پر انگریزی الفاظ۔ بلب اور بُلور کا استعمال ہوا ہے۔ جو اس بات کی ضمانت ہے کہ بشیر بدؔر سے پہلے شوریدؔہ کاشمیری نے ہی انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ لیکن بشیر بدؔر نے انگریزی الفاظ کو جس وسعت کے ساتھ اپنی غزلوں میں لایا ہے وہ صرف انھیں کا حصہ ہے۔ شوریدؔہ کی شعری مثالیں ملاحظہ ہوں۔

نہ دن کو سکوں ہے نہ آرامِ شب
عقوبت سے ہے اب کلیجہ بلب
(اگست، 1942)

سردی کے ہاتھوں بے زر کشمیر بنا اک شیش محل
پانی جما تو شیشہ بنا اور تختۂ یخ بُلور ہوا
(دسمبر، 1946)

شوریدؔہ کاشمیری کے مزاج میں ظرافت کا عنصر بھی شامل تھا۔ ان کی ایک مسلسل غزل ملاحظہ ہوں جس میں ظرافت کے نقوش ملتے ہیں۔ یہ اصل میں غزلِ مسلسل ہے۔ شوریدؔہ کے کلام میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ 16/ دسمبر 1944 میں لکھی گئی ایک مسلسل غزل کے چند اشعار دیکھیے۔

جُز میرے خریدار نہ تھا دہر میں کوئی
کیا خوب ملا بر سرِ بازار طمانچہ

اوسان خطا ہو گئے چہرہ بھی ہوا زرد
بجلی سی گری جب ملا یکبار طمانچہ

سر گھوم گیا رنگ اُڑا خون ہوا خشک
گویا کہ تھا تلوار کا اک وار طمانچہ

چنگاریاں سی اُٹھ گئیں چہرے سے پیاپے
جاڑے میں ہوا خوب شرر بار طمانچہ

سردی میں رہا گرم بہت دیر مرا مُنہ
نادار کے حق میں تھا گرمگار طمانچہ

مذکورہ غزل کے قوافی اور ردیفیں اسے غزل کی ہی سند عطا کرتے ہیں۔مگر اشعار کا یہ موضوعاتی تسلسل ذہن کے منفرد خیال کومختلف جامے عطا کرتا ہے۔ یہاں یہ غزل نہیں بلکہ نظم لگتی ہے۔اس طرح کی مختلف غزلیں ان کے یہاں نظر آئیں گی جونظم سے بہت قریب لگتی ہیں۔اصل میں ایسی تخلیقات صحیح طور پر تعین ہئیت کی ناامکانی کے باعث قاری کومتزلزل کرتی ہیں۔

شورؔیدہ کی غزلوں میں مسائلِ تصوف کے اظہار کا پہلونمایاں نظر آتا ہے۔مسائلِ تصوف غزل کے ابتدائی موضوعات میں سے ایک ہے۔لہٰذا اردو کے بیشتر شعرا نے اس چیز کی طرف توجہ مرکوز کی ہے۔شورؔیدہ

نے بھی اس موضوع کو فلسفۂ عشق الٰہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس طرح حق تعالیٰ کی بڑائی اور ہر جگہ ان کے جلوؤں کی موجودگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

ہے ذرہ ذرہ میں نور تیرا
اسی سے مشہور طور تیرا

چمن چمن میں ظہور تیرا
درونِ دل ہے سرور تیرا

شوریدہ کے اندر عشق کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس لیے اپنے دل کو بیت الصنم کہا ہے۔

دل تیرا شوریدہ ہے بیت الصنم
کفر چھوڑ اب اختیار اسلام کر

شوریدہ اپنے وطن (کشمیر) کے حسنِ فطرت سے اپنی دل بستگی کا بڑی بے ساختگی سے اظہار کرتے ہیں کہ قاری جمالیاتی طور پر محظوظ بھی ہوتے ہیں اور کشمیر کی قدرتی خوبصورتی پر رشک بھی کرتے ہیں۔ شاعر کشمیر کے حسنِ فطرت سے لطف اندوزی کی دعوت اس طرح دیتے ہیں۔

یہ گلشنِ کشمیر وہ اُن کا قدِ رعنا
فردوس میں طوبیٰ کا شجر دیکھ رہا ہوں

شوریدہ بہشت کے نظارے
میں ڈل کے کنارے دیکھتا ہوں

انسان کی فطرت میں ہے کہ اس کی خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتی بلکہ وہ ہر چھوٹی چیز کو پانے کے بعد کسی بڑی چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہیں۔شوریدہ ایک قناعت پسند انسان تھے اور وہ دوسروں میں بھی یہی تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ عقل و دانائی کی باتوں کو بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہیں۔ان کا یہ شعر دیکھیے جو سادہ زبان کے ساتھ گہرائی اور معنوی لحاظ سے بہت اہم ہے۔

بزم میں جب چراغ ہو روشن
نہ کرو آفتاب کی باتیں

شوریدہ کاشمیری اپنے عشق کی سالگرہ بھی مناتے ہیں اور عشق کی ناکامی سے دل پر لگے زخم کو تازہ کرنے کی بات کرتے ہیں۔

آج ہے عاشقی کی سالگرہ
داغِ دل پر بہار آئی ہے
(دسمبر،1947)

اس شعر سے شوریدہ کے تصورِ عشق کی ارضیت صاف جھلکتی ہے۔یہاں شوریدہ جوانی کی سرمستی اور شباب کی لغزشوں کے مرہونِ منت ہے اور گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرنے کی فکر میں مگن ہے۔شوریدہ نے اپنی تمام عمر اردو شعر و ادب کی آبیاری میں گزار کر 1991 کو انتقال فرمایا۔اگر چہ شوریدہ کو ہم سے دور چلے ہوئے اب تیس سال گزر گئے ہیں۔لیکن شوریدہ کو اپنی ادبی خدمات کی بنا پر ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔جس پر ان کا یہ شعر صحیح صادر آتا ہے۔

دیکھ شوریدہ لوگ کرتے ہیں
ہمیں خانہ خراب کی باتیں

رسؔا جاودانی:۔

رسؔا جاودانی کا شمار ریاست کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ان کی پیدائش 1901 میں جموں کے ''بھدروا'' نامی علاقے میں ہوئی۔رسؔا کا اصل نام عبدالقدوس تھا۔لیکن ادبی حلقوں میں رسؔا جاودانی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔رسؔا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد خواجہ منور سے حاصل کی، جو فارسی علم وادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔والد کے چشمۂ فیض سے رسؔا کو بھی فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔شاعری کی طرف رسؔا کا میلان بچپن ہی سے تھا۔ابتدا میں تُک بندیوں سے کام لیتے رہے، لیکن آگے جا کر اردو ادب کے قدآور شعرا، سیمابؔ اکبرآبادی اور پنڈت دتاتریہ کیفؔی کے سلسلۂ تلامذہ میں جگہ پائی۔اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے حامدؔی کاشمیری رقمطراز ہیں۔

> ''اردو شاعری میں جب ان (رسؔا) کے قدم جمنے لگے تو انہوں نے سیمابؔ اکبرآبادی اور علامہ کیفؔی دہلوی کو اپنا کچھ کلام بغرضِ اصلاح بھیجا لیکن دونوں اساتذہ نے ان کے کلام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور اصلاح سے ماورا قرار دیا۔''(11)

رسؔا جاودانی کی طبیعت کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا اس لیے جو کچھ کہا ہے، بڑے ہی ذوق وشوق سے کہا ہے۔رسؔا کے دو شعری مجموعے منظرِ شہود پر آچکے ہیں۔پہلا مجموعہ ''لالہ صحرا'' 1948 کے نام سے شائع ہوا اور اس کے چودہ سال بعد دوسرا مجموعہ ''نظم ثریا'' 1962 میں منظر عام پر آچکا ہے۔اس تعلق سے معلومات بہم پہنچاتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں۔

> ''رسؔا کے کلام کے دو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں، جن میں پہلا مجموعہ ''لالۂ صحرا'' کے نام سے 1948 میں چھپا تھا اور دوسرا مجموعہ ''نظمِ ثریا'' 1962 میں شائع ہوا۔اس پر مشہور ادیب اور

محقق ڈاکٹر زورؔ کا مقدمہ بھی شامل ہے، جو اس زمانے میں کشمیر
یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو تھے۔'' (12)

لیکن زمانے کی ناسازگاری کے سبب یہ دونوں مجموعے تلف ہو چکے ہیں۔اس لیے میں رساؔ جاودانی کے دستیاب شدہ کلام کی بنیاد پر ہی بات کرنے کی کوشش کروں گا۔

رساؔ جاودانی نے غزل اور نظم دونوں اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور دونوں اصناف میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔لیکن نظم کے مقابلے میں غزل گوئی سے انھیں زیادہ ہی لگاؤ تھا۔رساؔ جاودانی اردو کی کلاسکی شاعری سے بڑے متاثر تھے۔جس کا احساس ان کی شاعری کو پڑھ کر بخوبی ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں نہ صرف روایتی اور گھسے پٹے موضوعات کو برتا ہے، بلکہ بعض دوسرے مضامین شامل کر کے اس میں وسعت پیدا کر دی ہے۔رساؔ نے تمام تر تعصّبات، مذہبی منافرت اور تنگ نظری سے بالاتر رہنے کی کوشش کی ہے۔ان کے غزلیہ کلام کے تعلق سے پروفیسر حامدیؔ کاشمیری لکھتے ہیں۔

''رساؔ جاودانی نے غزلیں بھی لکھیں ہیں اور نظمیں بھی۔لیکن غزل سے ان کو طبعی مناسبت ہے۔وہ غزل کے اداشناس ہیں۔اردو غزل میں متنوع قسم کے احساسات و تجربات کی پیکر تراشی ملتی ہے لیکن عشقیہ محسوسات بالعموم غزل کا محور رہے ہیں۔ہر چھوٹے بڑے شاعر نے عشقیہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔رساؔ جاودانی کی غزلوں میں بھی حسن و عشق کے جذبات کا اظہار ملتا ہے جس طرح ان کی زندگی سیدھی سادی، بے تکلف اور تصنع تھی اور ان کی ساری زندگی درس و تدریس میں گزری، اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی رساؔ کی عاشقانہ شخصیت اپنی سادگی، جذباتیت، فطری پن، حسن پرستی، غم

پسندی، ہجر زدگی کے ساتھ اُبھرتی ہے۔‘‘(13)

رؔسا کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی شعری روایت کا شعور اور کلاسکی رچاؤ ہے۔ان کے کلام میں اردو کے اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے۔لیکن رؔسا نے کمالِ فنکاری سے اسے اپنے کلام میں آمیز کیا ہے۔اگرچہ رؔسا کے کلام میں مجموعی طور پر اُن کے جودتِ ذہن کا اندازہ ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے ہی شاعر تھے اور اسی صنف میں ان کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔انہوں نے بیشتر غزلوں میں چھوٹی بحروں کا استعمال کیا ہے، جن میں موضوع کے اعتبار سے فکر اور سوچ کی گہرائیاں نظر آتی ہیں۔رؔسا جاودانی کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی سادہ و پرکار اندازِ بیاں ہے۔مغلق، ثقیل و غیر مانوس الفاظ کے استعمال سے حتی المقدور پرہیز کیا ہے اور اپنے خیالات کو پیش کرنے کے لیے سہل الممتنع کی راہ اختیار کی ہے۔رؔسا اپنے دل میں ایک ایسی دنیا کا تصور لیے ہوئے ہیں، جہاں ہر ایک خوشی خوشی سے رہے، جہاں ذات پات، مذہب و ملت کی باتیں نہ ہوں۔ وہ ایک ایسی بستی کی تمنا کرتے ہیں جہاں آپسی بھائی چارہ ہو۔اسی لیے کہتے ہیں۔

ایسی بستی ہو جہاں لوگ ہوں سارے انسان
کوئی ہندو ہو وہاں اور نہ مسلمان کوئی

رؔسا جاودانی کے مندرجہ بالا شعر سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کو بغیر تصنع و تکلف کے نہایت سادگی و بے ساختگی سے نظم کرتے ہیں۔زبان و بیان کی سادگی و بے تکلفی بھی قدیم شعرا کی سی ہے۔

موجودہ دور کا انسان بُرے خصائل کا مجموعہ بنا ہوا ہے۔اس کے اندر اب انسانیت کا وہ معدہ نہیں رہا ،جس کی بنا پر وہ انسانیت کو پہچانتا اور پھر ایک انسان کی قدر و منزلت کرتا، بلکہ اس کے اندر نفرت کا ایسا معدہ بھرا ہوا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے خون کا پیاسا بنا بیٹھا ہے۔رؔسا موجودہ دور کے انسان کے بُرے خصائل کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

نسلِ آدم کو کیا ہوا ہے رسؔا
ہے درندہ بشر بشر کے لئے

رسؔا کی غزلوں میں حزن و ملال کی کیفیت نمایاں ہے لیکن وہ اس ملال کو اپنی شاعری پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ان کے اشعار میں ایک ہلکی ہلکی سلگتی آگ کا احساس ہوتا ہے، جس کا اثر قاری کو تڑپا دیتا ہے۔رسؔا کے یہاں غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ان کے کلام کے مطالعے سے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ محض آپ بیتی نہیں سناتے بلکہ ایک وسیع تناظر میں جگ بیتی کا احساس دلاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اُن کے موضوعات کی بوقلمونی ملتی ہے۔عشقیہ موضوعات پر لکھئے گئے اشعار میں شاعر کی قلبی کیفیات کا اظہار زیادہ ہوتا ہے۔رسؔا نے رنجِ انتظار اور محبوب کے نامہربان ہونے کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

ستارو رات بیتی جا رہی ہے
وہ میرا مستِ خواب آئے نہ آئے

رسؔا کا اپنے محبوب کے آنے یا نا آنے کی خبر ستاروں سے پوچھنے میں ان کے رنجِ انتظار کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔رسؔا جاودانی کو قدرت نے فنی چابکدستی بھی عطا کی تھی اور جوہرِ تخلیق سے بھی نوازا تھا۔ان کی شاعری کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی غموں سے اتنی پُر ہے کہ وہ اب خوشی کے ایک لمحے کے میسر ہونے کو ہی غنیمت سمجھتے ہیں۔رسؔا کی انفرادیت اس چیز میں ہے کہ وہ سامنے کے الفاظ اور سامنے کی باتیں کرتے ہیں،لیکن ان کے بیان کا جادو سر چڑھ کر پذیرائی پر مجبور کرتا ہے۔

ہے غنیمت اگر میسر ہو
ایک لمحہ بھی شادمانی کا

خضر مجھ سے ملیں تو میں پوچھوں
مدعا عمر جاودانی کا

رسؔا جاودانی انسانی اقدار کے پرستار ہیں۔وہ نیکی، سادگی، خلوص اور محنت کو عزیز رکھتے ہیں اور جہاں وہ انسان میں ریاکاری، جھوٹ، فریب شر اور بے یقینی دیکھتے ہیں، وہ اسے بے نقاب کرتے ہیں۔

بے یقینی ہے سُستیٔ ایمان
ضعف اوہام کا سہارا ہے

مہمل ہے اس زمانے میں صدق و صفا کی بات
البتہ سمجھی جاتی ہے مکر و ریا کی بات

موجودہ دور کا آدمی انسانیت سے اتنا گرا ہوا ہے، کہ اب انسانیت بھی اس کے کاموں سے شرماتی ہے۔اسے اچھے اور بُرے کی کوئی تمیز ہی نہیں ہے۔رسؔا انسان کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر نالاں کناں ہے۔

ہائے انسان کے کام ایسے ہیں
آدمیت ہی جن سے شرمائے

رسؔا جاودانی کے کئی اشعار میں داخلی کیفیات کی جلوہ گری ملتی ہے لیکن بہت سے ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں محض خیالات نظم کیے گئے ہیں، ظاہر ہے ایسے اشعار ان کی ذہنی تگ و تاز کے باوجود شعر و آب و رنگ سے عاری ہیں۔وہ دراصل شعر کے اس نقطۂ نظر کے حامی ہیں جس کی رو سے شعر معنی و مطلب کی ادائگی کا ذریعہ ہے۔اسی لیے خود لکھتے ہیں۔

ایسے شعروں سے ہے گریز ہمیں
جن میں فقدان ہو معانی کا

رسؔا جاودانی کے کلام کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ سے ایک تخلیقی صورتِ حال کو خلق کرتے ہیں۔ یہ کمالِ شاعری ہے اور میر و غالب جیسے قدآور شعرا کا طرۂ امتیاز ہے۔ رسؔا جاودانی نے اپنے طرزِ بیاں کے لیے سہل الممتنع کا خوب استعمال کیا ہے۔ رسؔا کے کئی اشعار اس خوبی سے پُر ہیں۔ ایسے اشعار میں کفایتِ لفظی سے سادہ و پُرکار تصویر اُبھرتی ہے۔ مثلاً۔

کسی کا نام کیوں ہو جائے بدنام
چلو ہم کو قضا نے مار ڈالا

زلف و عارض کے سب کرشمے ہیں
ورنہ یہ شام کیا سحر کیا ہے

دامن بچا کے ہم سے وہ سیدھے نکل گئے
ہم ان کو دیکھتے ہی سر رہگذر رہے

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ رسؔا کی شاعری میں قنوطیت اور غمگینی کے تاثرات بھی ملتے ہیں۔لیکن مریضانہ غم پسندی ان کے یہاں نظر نہیں آتی ہے، بلکہ وہ غم کو زندگی کے لیے لازم سمجھتے ہیں۔

غم کا شکوہ کسی کو کیوں ہو رسؔا
غم سے زینت ہے زندگانی کی

رسؔا فن کی عظمت کے ساتھ ساتھ زمانے کی قدر شناسی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔انھیں غمِ حیات اور

کشاکش زندگی سے زیادہ سامنا پڑا ہے۔ رسؔا جاودانی غم کو ''برائے شعر گفتن خوب است'' کے مصداق بنا کر ظاہر نہیں کرتے ، بلکہ یہ ان کے لیے ذاتی اور شخصی واردات کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں ان کی دستیاب شدہ ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

وعدہ کبھی وفا نہ ہوا پھر بھی ہم جیئے
وہ صدق آشنا نہ ہوا پھر بھی ہم جیئے

ناوک فگن کے سامنے سینہ سپر رہے
تیرِ نظر خطا نہ ہوا، پھر بھی ہم جیئے

چھوڑا نہ عشق، نہ ہی کبھی زندگی کا ساتھ
غم عشق سے جدا نہ ہوا پھر بھی ہم جیئے

وہ کون سا ستم ہے جو توڑا نہ دوست نے
ہم سے سلوک کیا نہ ہوا پھر بھی ہم جیئے

ہم دشتِ شوق میں بھی بھٹکتے رہے رسؔا
مجنوں بھی رہنما نہ ہوا پھر بھی ہم جیئے

تھا قید زلف میں ہی یہ کیا زندگی کا راز
دل دام سے رہا نہ ہوا پھر بھی ہم جیئے

(ہمارا ادب، شمارہ 1963)

مذکورہ غزل میں ربط اور سما باندھنے والی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ رسؔا کے اشعار میں اگرچہ تشبیہات و استعارات کا بہت کم استعمال ہوا ہے، مگر پھر بھی کلام دلچسپ اور موثر ہے۔ ان کے کلام میں وہی سوز و گداز اور زور و تاثیر ہے، جو قدیم دور کے شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ رسؔا نے محض انتخابِ الفاظ سے اپنی شاعری کو دلآویز اور پُر اثر بنا دیا ہے۔ انھوں نے اپنی تمام عمر تنگ دستی میں گزار کر 27 رمئی 1979 کو اٹھہتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ بقول رسؔا ؎

میری شاعری میری ساحری ہے خیالِ الفت سے بھری
نہیں یہ رجز کی فسوں گری مگر آتشی کا پیام ہے

شہ زورؔ کاشمیری:۔

شہ زورؔ کاشمیری وادیِ کشمیر کی شعری فضا کے پروردہ ہیں۔ ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ شہ زورؔ کا اصل نام غلام قادر تھا، لیکن ادبی حلقوں میں شہہ زورؔ کاشمیری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ شہہ زورؔ کی پیدائش 27 رفروری 1915 کو کشمیر کے دار الخلافہ، سرینگر کے ایک محلّہ ''چوٹہ بازار'' میں ہوئی۔ وہ ایک صاحبِ ثروت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم سرینگر کے ایک خانگی اسکول سے حاصل کرنے کے بعد سری پرتاپ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد ان کا تقرر محکمۂ حسابیات میں اکاونٹس آفیسر کی حیثیت سے ہوا، پھر ترقی کرتے ہوئے چیف اکاونٹ آفیسر سے فائنانشل ایڈوایزر کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ شہ زورؔ شعر و سخن کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا مزاج

بچپن ہی سے شعر وشاعری کی طرف مائل تھا، اس لیے ان کے والد غلام محمد خان انھیں ''شعر پرودہ'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ شہہ زورؔ موسیقی کے اسرار و رموز سے بھی خوب واقف تھے۔ ان کے تعلق سے معلومات بہم پہنچاتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب لکھتے ہیں۔

''شہ زورؔ کا اصلی نام غلام قادر ہے اور ان کا تعلق کشمیر کے ایک خوش حال گھرانے سے ہے۔ ان کی ولادت سرینگر میں 1915 میں ہوئی۔ تعلیم بھی یہیں پائی اور سری پرتاپ کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔ اس وقت وہ محکمہ حسابیات میں چیف اکاونٹ آفیسر اور فائنانشل ایڈوایزر کے عہدہ پر مامور ہیں۔ شعر وادب سے شہہ زورؔ کا لگاؤ بچپن سے رہا اور موسیقی سے بھی انہیں شغف ہے۔ بچپن میں وہ شعر گنگناتے پھرتے تھے تو ان کے والد نے مزاجاً انہیں ''شعر پرودہ'' کے لقب سے مخاطب کرنا شروع کیا تھا۔'' (14)

شہ زورؔ نے دسویں جماعت سے باقاعدہ طور پر شاعری کرنی شروع کی، لیکن سری پرتاپ کالج کی طالبِ علمی کے دوران ان کے اس فن کو تقویت ملی۔ ان کا ابتدائی کلام اسی کالج کی میگزین ''پرتاپ'' میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے بعد ان کا کلام ہندوستان کے معیاری رسالوں کی زینت بنتا رہا۔ شہ زورؔ نے اردو ادب کے مشہور شاعر سیمابؔ اکبر آبادی کی شاگردی میں رہ کر فنِ شاعری کے اصول سیکھے ہیں۔ وہ اپنے شاگردانہ تعلقات پر فخر کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ! اے شہؔ زور ہے سیمابؔ کے فیض کا صدقہ
ملا الہام میں حصہ مرے قلبِ غزل خواں کو

شہ زورؔ کا فطری مذاق اوراس پر ایک کہنہ مشق، زود گو، جدت پسند اور استاد گر شاعر کی زبان دانی کے سہارے نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا ہے۔ شہ زورؔ کے اندازِ بیاں میں دلکشی اور طرزِ تخیل میں ایک الگ طرح کی انفرادیت پیدا ہوئی۔ انھوں نے لفظوں کا انتخاب اور ان کی ترتیب سے کلام میں وہ موسیقیت پیدا کردی، جو ایک اچھے شاعر کے یہاں ہونی چاہئے۔ شہ زورؔ کو اردو زبان کے نکات اور اسالیب پر اس قدر قدرت حاصل ہوئی کہ سیمابؔ اکبر آبادی نے انھیں کشمیر اور اس سے متصل علاقوں کے لیے استادی کی سند تفویض کی اور اس طرح شہزورؔ اردو شاعری میں اُستادی کا لقب پا گئے۔ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شفیقؔ سوپوری لکھتے ہیں۔

> ''مولانا مسعودی کی رائے پر علامہ سیماب اکبر آبادی سے مشورہ سخن لینا شروع کیا۔ چنانچہ علامہ سیمابؔ کی تربیت سے شہزورؔ کو وہ رتبہ حاصل ہو گیا کہ استاد نے کشمیر اور ملحقہ علاقوں کے لیے انہیں استادی کی سند عطا کی۔''(15)

شہ زورؔ کاشمیری فنِ شاعری کے اصولوں سے پوری طرح واقف تھے اور اس بنا پر انھیں استادی کی سند تفویض کرنا بھی بجا ہے۔ شہ زورؔ نے اردو کی مختلف اصناف مثلاً قطعہ نویسی، رباعی گوئی اور نظم نگار میں قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ لیکن انھیں ایک بڑا غزل گو شاعر تسلیم کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ کیونکہ ان کی غزلیہ شاعری کا کوئی بھی مجموعہ شائع نہ ہو سکا یا اگر ہوا بھی ہوگا، مگر بڑی جستجو اور انہماک کے بعد بھی راقم کو کوئی ثبوت میسر نہ ہو سکا۔ تاہم ان کے جو اشعار ہاتھ لگے ہیں، وہ سرمایۂ ادب ہیں۔ یہاں یہ قیاس آرائی بھی کی جا سکتی ہے کہ سیمابؔ اکبر آبادی کے سلسلۂ تلامذہ میں رہنے کے سبب انھوں نے زیادہ تر نظمیں ہی کہیں ہوگی۔ اس تعلق سے پروفیسر ایاز رسول نازکیؔ اپنے ایک مضمون ''تذکرہ شعرائے کشمیر'' میں لکھتے ہیں۔

> ''شہہ زورؔ کشمیری کا شمار علامہ سیماب اکبر آبادی کے فارغ

الاصلاح تلامذہ میں کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں سیمابؔ اکبر آبادی نے کشمیر اور ملحقہ علاقوں کے لیے استادی کی سند بھی عطا کی تھی۔ شہ زورؔ نے تمام مروجہ اصناف اور شعری ہیتوں میں طبع آزمائی کی۔ مگر ان کے تخلیقی جوہر صحیح معنوں میں نظم ہی میں کھل کر سامنے آتے ہیں۔ شہ زورؔ کا شیوۂ گفتار، کلاسکی رچاؤ، شائستگی اور سلیقہ مندی سے عبارت ہے اور ان ہی اوصاف کی بنا پر وہ نہ صرف دبستانِ کشمیر بلکہ دبستانِ سیمابؔ میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔'' (16)

جیسا کہ مذکورہ اقتباس میں لکھا گیا ہے کہ ان کے اصل تخلیقی جوہر نظم نگاری میں کھلے ہیں۔ ایسا ہونا ممکن بھی تھا کیونکہ سیمابؔ کے تلامذہ کی شعری تربیت میں نظم نگاری پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور غزل سے زیادہ نظم کی طرف راغب کیا جاتا رہا۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو دوسری اصنافِ سخن کے مقابلے میں ایک نظم نگار کی حیثیت سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ کیونکہ ان کی 96 نظموں پر مشتمل مجموعہ ''کیفِ عزم'' کے عنوان سے 2003 میں طبع ہو چکا ہے اور جس کا ایک نسخہ راقم کی نظروں سے گزرا ہے۔ اس مجموعے میں شامل بیشتر نظمیں کشمیر کے دلآویز مناظر کی تصویر پیش کرتی ہیں، جن سے شاعر کے فکر و نظر کی گہرائی کا ثبوت ملتا ہے۔ چونکہ مجھے اس مضمون کی حد تک صرف ان کی غزل گوئی سے واسطہ ہے، اس لیے یہاں پر صرف اُن غزلیہ اشعار کا جائزہ پیش کیا جائے گا، جو بڑی جستجو سے بعض رسالوں اور ادبی تاریخوں سے مل گئے ہیں۔

شہ زورؔ کا تصورِ شعر جامد نہیں، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا پذیر ہوتا رہا۔ انھوں نے اپنے عہد کے سماجی شعور و عصری آگہی کو شاعری کے سانچے میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ شہزورؔ کے یہاں تلمیحاتی ڈھنگ کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ اتفاقی طور پر قاری اگر چہ اسے کسی خاص واقعہ سے مربوط کرنے لگتا ہے یا واقعی قاری

کا شک وشبہ ہی شاعر کا ایما ہو کچھ پتہ نہیں چلتا۔شاعر اس کارگاہ شیشہ گری میں نہ جانے کس سے مخاطب ہونا چاہتے تھے۔ان کے اس شعر سے کیا تعبیرات قائم کی جاسکتی ہیں۔

مرا گوہرِ سخن جو ترے کان تک نہ پہنچا
مرے کم نصیب فن کا وہی شاہکار کیوں ہو

شہ زورؔ کا مطالعہ کافی وسیع تھا،ساتھ ہی ان کے کلام میں گہرائی و گیرائی بھی ہے۔ان کا کلام قدیم و جدید اسالیبِ سخن کے ایک ایسے امتزاج سے معمور ہے جو ایک فطری اور بے لوث شاعر ہی کے موئے قلم کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔شہ زورؔ اپنی شاعری کے ذریعے افسردہ لبوں کو تبسم عطا کرتے ہیں۔

ہر ایک قلب کو شہزورؔ شعلہ بار کیا
ترے تکلمِ جادو اثر میں آگ لگے

شہ زورؔ اپنے وقت کے سماجی،معاشرتی وتمدنی حالات سے نبرد آزما رہے ہیں۔ان کی شاعری کا خاصا وقت ترقی پسندی کے دور میں گزر چکا تھا۔یہ وہ تحریک تھی جو انسانوں کو طبقوں میں نہیں بانٹتی تھی یا جو مشرقی و مغربی، ہندو اور مسلم کا امتیاز نہیں جانتی تھی، بلکہ صرف انسان اور انسانیت کو دیکھتی تھی۔شہ زورؔ نے بھی اس تحریک کے رجحانات کا اثر قبول کیا ہے اور ساتھ ہی اس کے تجربات کو بھی اپنانے کی کوشش کی ہے۔وہ اس تحریک کے آئینے میں حیات کا عکس دیکھتے ہیں اور اسی کے مقرر کردہ اصولوں پر گامزن ہونے میں آسودگیِ ذہن تلاش کرتے ہیں۔چنانچہ ان کا نظریۂ زندگی اسی محور پر گردش کرتا دکھائی دیتا ہے اور اپنی محسوسات کو دنیا کے لیے پیام بنا کر اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔

خواجہ پرست آج بھی مزدور ہے یہاں
پائے خدائے زر پہ گدا سجدہ ریز ہے

حاکم سیل جبر ابھی تند و تیز ہے
ہر اک دیار آج بھی محکوم خیز ہے

شہ زورؔ کے دور میں کشمیر میں علامہ اقبال کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا۔اس لیے ان کے یہاں اقبال کے فکر وفن اور پیغام کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔اس خوبی کو دیکھ کر انھیں سید سلیمان ندوی نے ''کشمیر کا اقبال'' کہا ہے۔وہ شہ زورؔ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> ''آپ کے کلام میں اقبال کی روح بولتی ہے۔اس لیے آپ کو کشمیر
> کا اقبال کہا جا سکتا ہے۔لیکن جہاں اپنا ذوقِ نظر گم ہو جاتا ہے
> وہاں اقبال کی آواز کی صدائے بازگشت اُبھرتی ہے۔جو دل کو تار
> تار کرنے کی قوت سے محروم نظر آتی ہے۔'' (17)

علامہ سید سلیمان ندوی کی اس مخلصانہ اور دیانتدارانہ رائے سے شہ زورؔ کی قابلیت کے متعلق اندازہ کیا جا سکتا ہے۔شہ زورؔ نے زبان و بیان کی صفائی اور شائستگی کا گہرا ثبوت پیش کیا ہے۔ان کا اسلوبِ نگارش تصنع اور تکلف سے بری ہے،ساتھ ہی اس میں سادگی اور شگفتگی ہے۔شہ زورؔ طبقاتی کشمکش کے شعور سے پوری طرح واقف تھے۔وہ اپنے عہد کی عظیم ترین ترقی پسند تحریک کی اگرچہ نمائندگی نہیں کرنا چاہتے تھے،اس کے باوجود طبقاتی کشمکش اور غربت وامارت میں فرق کو محسوس کرنا شعور کی بیداری کی دین سمجھ کر ضرور ان حالات سے متاثر ہوئے ہیں۔

ہیں بلند اتنے عزائم ترے دیوانوں کے
خود جنوں سیتا ہے چاک ان کے گریبانوں کے

بیج یہ اغیار نے بویا ہے کیا نفرتوں میں الفتیں بدلی گئیں
دہر میں کیا خاک ہو امن و امان مصلحتوں کی نیتیں بدلی گئی

شہ زورؔ نئی علامتوں اور ترکیبوں کی مدد سے اپنے تاثرات کو شعری جامہ پہنانے میں بڑے کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں غم جاناں کے ساتھ غمِ دوراں بھی ہے۔وہ نئی غزل کے اساتذہ کی طرح غزل کی رمزیت سے پوری طرح کام لیتے ہیں۔ان کی ایک مرصع غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

دامانِ گلستان پر ہے خزاں پھر سایہ فگن اب کیا ہوگا
آغوشِ محسن اور سر و سمن، یارانِ چمن اب کیا ہوگا

میخانہ نیا، ساغر بھی نئے، ساقی بھی نیا، میکش بھی نئے
تجھ سے اک کیف نیا حاصل صہبائے کہن اب کیا ہوگا

آتی ہے عروسِ منزل کی زلفوں کی مہک پیہم، لیکن
محسوسِ عزائم ہونے لگی بے طرح تھکن اب کیا ہوگا

تقریر کی حسرت کیا کیجیے، تحریر پہ بھی جب قدغن ہو
بد خواہِ وطن ہیں اہلِ وطن، اے حبِ وطن اب کیا ہوگا

شہ زورؔ کاشمیری کے ہاں رومانی اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔وہ خارجی حقائق کا مشاعدہ بڑی باریک بنی سے کرتے ہے۔جہاں انہیں مایوسی ومحرومی کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔لیکن فطرت پرستی، جذبۂ آزادی، جمالیاتی رنگارنگی وغیرہ انہیں رومانیت کے دائرے میں بند کر دیتے ہیں۔

جانے کیوں مرے دل میں جھانکتی ہیں پھر تیری
مدتوں کی یادیں اور مدتوں کی تصویریں

اگرچہ شہ زورؔ کا غزلیہ کلام محفوظ نہیں رہ سکا، تاہم وہ اپنی شعری خدمات کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور جب بھی ریاست کی اردو شاعری کا ذکر کیا جائے گا، شہ زورؔ ہمیشہ یاد آئیں گے۔ ان کا انتقال جون/1990 میں ہوا ہے۔

عابدؔ مناوری:۔

عابدؔ مناوری کا شمار اُن چند گنے چنے شاعروں میں ہوتا ہے۔ جنھیں ان کی شعری زندگی کے اوائل میں ہی قبولِ عام حاصل ہوا۔ عابدؔ کا نام ریاست کے نمائندہ شاعروں میں لیا جاتا ہے۔ ان کا اصل نام گوری نندن سنگھ بالی تھا اور ''عابدؔ'' تخلص کرتے تھے۔ عابدؔ کا آبائی گاؤں ''مناور''، تحصیل اکھنور ہے۔ ان کی پیدائش 27/ مئی، 1938 میں اسی مقام پر ہوئی۔ عابدؔ نے طالبِ علمی کے زمانے سے ہی شعر کہنا شروع کیا اور پھر مسلسل مشقِ سخن سے کلام میں پختگی بھی آ گئی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 1961 میں ''بہارِ غزل'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو اور شعری مجموعے ''شمیمِ گُل'' اور ''برجستہ'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ تینوں مجموعے ادبی حلقوں سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ عابدؔ نے اپنی ابتدائی شاعری میں دوسرے نوجوان فنکاروں کی طرح، اپنے محبوب کا وصل، معاشی بدحالی اور فرسودہ سماجی نظام پر طنز کیا ہے، لیکن جب ہم ان کے تیسرے مجموعہ کلام ''برجستہ'' پر نظر دوڑاتے ہیں، تو اُن کا ذہن، اُن کا شعور اور اُن کا قلم یکا یک تبدیل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عابدؔ نہ صرف غزل کے شاعر ہیں بلکہ نظم گوئی میں بھی قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ لیکن ایک غزل گو کی حیثیت سے ان کی حیثیت مسلم ہے۔ عابدؔ کی شاعری میں غمِ زمانہ کے ساتھ ساتھ غمِ جاناں کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ عابدؔ کے تعلق سے ڈاکٹر گیان چند جین صاحب لکھتے ہیں۔

''عابدؔ کی شاعری کے مضامین محض روایت کی پیداوار نہیں۔ یہ مجھے اس سے اندازہ ہوا کہ ان میں دو مطالب بار بار سامنے آتے ہیں۔غمِ دوراں اور غمِ جاناں۔ عابدؔ کی شاعری کے محبوب موضوع یہی دو ہیں۔وہ بار بار معاشی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں۔''(18)

عابدؔ مناوری کی شاعری میں قدیم وجدید رنگ کا سنگم ملتا ہے۔ان کی غزلوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے، کہ وہ مختصر بحروں میں شعر کہنے کے عادی ہیں۔ عابدؔ کا شمار ابوالفصاحت جناب جوشؔ ملسیانی کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔ جوشؔ صاحب کو اپنے اس ہونہار طالبِ علم پر بڑا ناز تھا۔ عابدؔ کی ادبی زندگی اور شعر وشاعری کی نشو ونما میں جوشؔ ملسیانی کا اہم کردار رہا ہے۔لیکن جوشؔ ملسیانی کا اثر زیادہ تر زبان کے پُرشکوہ انداز تک ہی محدود رہا ہے۔ عابدؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں پر داد دیتے ہوئے جوشؔ ملسیانی لکھتے ہیں۔

''عابد صاحب میرے ہی عزیز اور میرے ہی دامنِ ادب سے وابستہ ہیں۔ میں ان کے حسنِ طبیعت اور ذوقِ شعری کا مداح ہوں۔ جو کچھ کہتے ہیں، کافی سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ چھوٹی بحروں میں تو اُن کی شگفتہ بیانی ہر شعر کو شاخِ گُل بنا دیتی ہے۔''(19)

عابدؔ کو بھی اپنے استاد جوشؔ ملسیانی سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اپنے شاگردانہ لگاؤ پر شرف کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

دھوم ہے جو کلامِ عابدؔ کی
جوشؔ صاحب کا فیضِ پیہم ہے

عابدؔ کے لیے جوشؔ ملسیانی کی شاگردی سرمایۂ افتخار ہے۔اسی لیے تو کہتے ہیں۔

کیوں نہ عاؔبد پاؤں میں دادِ سخن
فیض ہے مجھ پر جنابِ جوشؔ کا

عاؔبد بنیادی طور پر رومان پرور شاعر تھے۔ان کا بیشتر شعری سرمایہ رومانیت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔جس کا اندازہ اِن کی غزلوں کو پڑھ کر بخوبی ہوتا ہے۔عاؔبد کی شاعری میں رومانیت کے غلبے کے تعلق سے پروفیسر مجید مضمؔر رقمطراز ہیں۔

''عابد مناوری بہت پہلے سے لکھ رہے ہیں اور ان کے دوشعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔گذشتہ آٹھ نو برسوں سے انھوں نے روایتی رومانی اور عشقیہ شاعری کے دائرے سے نکلنے کی کوشش کی ہے ۔مگران کی شاعری کا اصلی رنگ رومانیت میں ہی نظر آتا ہے۔انہوں نے نئی حسیت کا اظہار کرنے والے نئے شعرا میں خود کوشمار تو کروایا ہے لیکن ان کے یہاں معاصر شعور کا انفرادی اور تخلیقی اظہار نہیں ملتا۔''(20)

عاؔبد مناوری اگر چہ جدید دور سے تعلق رکھتے تھے۔لیکن انھوں نے جدید غزل کے مزاج کو قبول نہیں کیا، بلکہ وہ عشقیہ خیالات کو ہی اپنے تخیل کے ذریعے پیش کرتے رہے اور اپنے مذاقِ فکر کے خلاف اس طرح عمارت کھڑی کرتے ہیں۔

تنگ ہے دامنِ خیال اپنا
بے کراں وسعتِ جہانِ غزل

گو عاؔبد کو بھی اپنی شاعری کی تنگ دامنی کا خیال تھا۔اصل میں عاؔبد کی غزلوں میں عصری آگہی کی عدم موجودگی ہے۔کیونکہ عاؔبد نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا اُس وقت آج کا سا زمانہ نہیں تھا، بلکہ اس وقت ریاست کے بیشتر شعرا میں روایت پرستی کی ایک عام روش تھی۔حسن و عشق کے موضوعات ،

حیات کی بے قدری و بے ثباتی، محبوب کی بے التفاتی وغیرہ شاعری کے محور تھے۔ عابدؔ کے پہلے مجموعے کی فضا انھیں موضوعات سے رچی بسی ہے۔ عابدؔ آزاد طبیعت کے مالک تھے، وہ جس چیز کو پسند کرتے تھے یا جو کچھ اُن کے تخیل میں آتا تھا، اس کو صفحۂ قرطاس پر اُتار دیتے ہیں۔ لیکن عابدؔ نے اپنا عزمِ سفر نہیں چھوڑا۔ اسی لئے اتنا کچھ کہہ گئے۔

قدم چومے ہے آکر منزلوں نے
رہے کچھ اس طرح گرمِ سفر ہم

عابدؔ مناوری نے مقصدی شاعری بھی کی ہے۔ جس میں اصلاح کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ پند و نصائح کی باتیں بڑے لطیف طریقے سے ادا کرتے ہیں۔ وہ بھی نہایت سیدھے سادے اندازِ بیاں میں۔ یہاں پر اصلاحی شاعری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

جو بشر خود کو بھی نہ پہچانے
وہ رموزِ حیات کیا جانے

زندگانی کی ہے توہین بڑی
زندگانی سے گریزاں ہونا

جو کسی کی بُرائی کرتا ہے
کبھی اُس کا بھلا نہیں ہوتا

غمہائے روزگار سے جو لوگ ڈر گئے
وہ بد نصیب موت سے پہلے ہی مر گئے

جو کسی بے کس کا غم کھاتا نہیں
وہ بشر انسان کہلاتا نہیں

ان اشعار کا مضمون نیا نہیں ہے، لیکن سلاست اور بیان کی سادگی کے ساتھ اخلاق و اصلاح کی ایسی تاثیر پیدا کر دی ہے جس سے دنیا کا ہر شخص واقف ہے۔ لیکن ان مضامین کو اس طرح ادا نہیں کر سکتا ہے۔ عابدؔ نے ان موضوعات کو سہل الممتنع انداز میں ظاہر کر دیا ہے۔

عابدؔ کی حب الوطنی کے نہایت جاوداں نقوش ان کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ عابدؔ صورتِ حال کی سنگینی سے خائف نہیں، یہ اصل میں تقاضائے بشریت ہے، کہ ایک انسان اپنے وطن کو کبھی بھول نہیں سکتا ہے۔ بلکہ اپنے وطن کو بنانے اور سنوارنے کا عزم اس کی مثبت فکر کا عطیہ ہوتا ہے۔ عابدؔ کی حب الوطنی کو ان اشعار سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

دل پہ لگتی ہے چوٹ سی عابدؔ
جب ''مناور'' کی یاد آتی ہے

چشمِ عابدؔ سے لہو ٹپکا ہے
جب ''مناور'' سا وطن یاد آیا

اس طرح عابدؔ اپنی جائے پیدائش ''مناور'' کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہے۔ عابدؔ بہت اچھے شاعرِ

غزل ہے۔وہ خارجی حالات کا سامنا کر کے اپنے باطن میں پیدا ہونے والے تاثرات کی نہایت بلیغ اور رمزیہ مصوری کرتے ہیں۔عابؔد کے ہاں عشقِ مجازی کا غلبہ ہے۔ان کے عشقیہ جذبات عموماً محبوب کے قد و پیکر، دست و بازو، لبِ زنداں، زلف و عارض تک محدود ہیں۔ان کی عشقیہ شاعری میں جذبے کی شدت اور اثر انگیزی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں جسم کی جمالیات کا بیان بھی خوبصورت انداز میں ہوا ہے۔

گلشنِ دل میں مہک پھیل گئی
جب تیرا پھول سا تن یاد آیا

عابؔد کی غزلوں میں کہیں کہیں محبوب کے تغافل کا شکوہ، رقیب کی دراز دستی اور عاشق کی بے چارگی و محرومی کا اظہار بھی ہے۔ایسے موضوعات کی پیش کش میں ایک سلیقہ ملتا ہے۔اظہار و اسلوب کا حُسن برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔

جانبِ دشت دیکھ اے غافل
آج پھر تیرے بے قرار چلے

ایسے چُپ ہے وہ سُن کے بات میری
جس طرح اس نے کچھ سنا ہی نہیں

اس قسم کے عشقیہ تجربوں میں کہیں کہیں غم انگیز جذبہ و احساس کی وہ کسک بھی ہے جو گرفتاریٔ دل کی دلیل ہے۔عابؔد کے اشعار میں تصنع یا آرائش نہیں ہے، بلکہ سیدھے سادے خیالات کو سیدھی سادی زبان میں مترنم آہنگ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔جو ان کے فطری مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔

عابؔد مناوری کی شاعری اور ان کے اسلوب کا انسان کے انفرادی وجود اور سماج کے اجتماعی وجود سے

بہت ہی گہرا رشتہ ہے اور یہی وہ رشتہ ہے، جس نے عابدؔ کی شاعری کو عوام کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا ہے۔ عابدؔ کی شاعری میں ایسے انسانی جذبات و تجربات موجود ہیں جن کو پڑھ کر اپنے احساس و جذبات کا عکس نظر آنے لگتا ہے۔ غزل کو انھوں نے رومانی حسن سے بخوبی سنوارا ہے۔ ان کے اشعار کا سفر نظر سے ذہن اور ذہن سے دل کی طرف جاتا ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شعر کو سمجھنے اور یاد کرنے کے لئے ذہن کو مشقت نہیں کرنی پڑتی ہے۔ عام بول چال کی زبان میں بڑی سی بڑی بات کو سیدھے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ عابدؔ کے یہاں عشقیہ مضامین کا بیان محض اُن کے زورِ قلم کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ انہوں نے محبت کی راہوں سے گزر کر بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ محبت کا نتیجہ جانتے ہیں۔ اس لیے ضبطِ غم کے ساتھ یہ بات کہی ہے۔

عشق میں رنج و مصیبت کے سوا کیا ہوگا
ہم کو یہ زہر بھی ہنستے ہوئے پینا ہوگا

عابدؔ کے اشعار بڑے خوبصورت ہیں۔ لیکن ان میں خیال بھی محدود ہے، ساتھ ہی اندازِ سخن میں بھی نہ پھیلاؤ کا کوئی امکان ہے اور نہ کسی تقلید کا۔ اصل میں عابدؔ عشق و محبت کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ایسا کہہ سکتے ہیں کہ وہ عشق و محبت کے ہی شاعر تھے۔ کہیں وہ اپنی زبونی بخت اور شوخیٔ حشمت کا گلہ بھی زبان پر لے آتے ہیں اور محبوب کی بے اعتنائی کی شکوہ سنجی کرنے لگتے ہیں۔

سب کے ہونٹوں پہ تیرے جور کا شکوہ ہوگا
دیکھنا حشر کے دن حشر تیرا کیا ہوگا

عابدؔ کے کلام میں روانی، سادگی و سلاست اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ اپنے معشوق کی جفا اور اپنی وفا کی بات کہنے کا ان کے ہاں نرالا انداز ہے۔ عاشق کو گرویدہ کر کے اور اس کا دل چھین کر محبوب دلیر ہو جاتا ہے۔ لیکن شاعر اسے استفہامیہ انداز میں پوچھتا ہے کہ تم کیوں میرے اس نوآموز دل کو دُکھاتے ہو۔

کیوں میری محبت کو مٹانے پہ تُلے ہو
اس تاج محل کی ابھی تعمیر ہوئی ہے

جاتے جاتے یہ بتاتے جاؤ
پھر کبھی ہوگی ملاقات کہاں

مندرجہ بالا اشعار میں وہی جدائی کے کرب کا بیان ہے۔لیکن یہاں شاعر کے لہجے میں ایک طرح کا اعتماد آ گیا ہے۔اور یہ اعتماد اس لیے ہے کہ اب محبوب کے کرب سے وہ ایک انوکھی لذت کشید کرنے لگا ہے۔عابدؔ کا اپنا ایک انفرادی رنگ ہے جو ہر جگہ نمایاں ہوتا ہے۔ان کا یہ شعر جس میں انہوں نے وادیٔ کشمیر کو اپنی شاعری کا گرویدہ قرار دیا ہے۔

عابد ترا ہر شعر ہے رشک گُلِ رعنا
مداح تری وادیٔ کشمیر ہوئی ہے

(ہمارا ادب،انتخاب نمبر،1978۔1979)

اس شعر میں صنعتِ تعلیٰ کا استعمال کیا گیا ہے۔یہ وہ صنعت ہے،جس میں شاعر اپنی تعریف آپ کرتا ہے۔عابدؔ کے کلام میں ایسے قبیل کے متعدد اشعار ملتے ہیں۔جن سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنی تعریفوں کے راگ الاپ رہا ہے،جن میں ان کی انفرادیت یا خودی بطورِ خاص درخشاں ہے۔عابدؔ کے کلام سے ایسی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

یہ غزل بھی تمہاری عابدؔ
ہر کسی نے پسند کی ہے

معبدوں میں بھی مجھ کو اے عاؔبد
میکدوں سے سلام آتے ہیں

میرے حسنِ خلوص کی عاؔبد
ہر کوئی مجھ کو داد دیتا ہے

تیرے شعروں پر مرحبا عاؔبد
کیا فصاحت ہے کیا بلاغت ہے

ہر کوئی معتقد ہے عاؔبد کا
خُوش بیانی کی دیکھئے تاثیر

طنز ومزاح کی شاعری کا ایک اہم ترین موضوع خود شاعر کی ذات ہے۔عاؔبد کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنی تعریف کرتے ہیں، بلکہ اپنی ذات کو مرکزِ طنز بھی بناتے ہیں۔

تمہاری یہ خُو عاؔبد اچھی نہیں
ذرا سوچ کر مسکرایا کرو

عاؔبد مناوری کی غزلیں تغزل کی بہترین مثالیں ہیں۔جن میں شاعر اپنے جمالیاتی احساس، جذبۂ عشق اور ہجر و وصال کی داستانیں پیش کرتا ہے۔یہ روایتی انداز ان کے کلاسکی شاعری سے لگاؤ اور مطالعہ کی وجہ سے ہے۔عاؔبد کے یہاں تغزل کی کمی نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی ابتدائی دور کی غزلوں میں روایتی انداز پایا جاتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی غزلوں میں رعنائی اور دلکشی آ گئی ہے۔جو کہ غزل کی دنیا سے مٹتی جا رہی

تھی۔عابدؔ کی غزلوں میں تغزل کے ساتھ ایک طرح کی نغمگی بھی ملتی ہے۔ان غزلوں میں بلا کی تاثیر، دلکشی اور رعنائی پائی جاتی ہے۔ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اُٹھا ساز الفت بجاتا چلا جا
محبت کے نغمے سُناتا چلا جا

کچھ اس رنگ سے گیت گاتا چلا جا
زمانے کے دل میں سماتا چلا جا

محبت مسرت، محبت حقیقت
محبت کے سکے بٹھاتا چلا جا

یہ اشعار تغزل کی نہایت پاکیزہ مثالیں ہیں۔جن میں بیاں کی سادگی بھی ہے اور شعریت بھی۔عابدؔ کے شعری رویے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ہاں مذاقِ عام کی ہم نوائی اور عصری ماحول کے مطابق کلاسکی غزلیہ شاعری کی کامیاب تقلید ہے۔مضامین وموضوعات، اساطیر و کنایات،لفظیات واسالیب اور تکنیک ہر سطح پر ان کی غزلیں کلاسکی روایت اور رواج سے ہم آہنگ ہیں۔چونکہ کلاسکی دور کے مخصوص مزاج کی وجہ سے صنفِ غزل کا محور عشق تھا۔اس میں عشق ہی کے ذریعے حیات وکائنات کے رموز ونکات تک رسائی ہوتی ہے۔اس لیے عابدؔ نے بھی اس طرزِ فکر سے گہرا تاثر قبول کیا ہے۔ان کی غزلوں میں عشق کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔عابدؔ کو عشق ہی کے ذریعے تخلیقی تحرک ملتا ہے،لیکن ان کا تصورِ عشق شائستہ اور منجھا ہوا نہیں ہے۔محبوب سے چھیڑ چھاڑ اور معمولی عشقیہ جذبات اور رندانہ بانکپن جا بجا ملتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تو نہیں تیرا انتظار تو ہے
شبِ غم ایک غمگسار تو ہے

اُس کے دیدار کو ترستا ہوں
جس کی تصویر ہے میرے دل میں

گو ہمیں لاکھ بھول جائیں آپ
کیا کریں ہم جو یاد آئیں آپ

عابؔد مناوری کے بارے میں یہ معلوم کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ وہ کب اور کس سن میں انتقال کر گئے ہیں یا ابھی حیات ہیں۔لیکن ریاست کے اردو ادب کا جب بھی جائزہ لیا جائے گا، عابؔد کو اپنی ادبی جہات کے عوض ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔الغرض اب تک عابؔد کی شاعری کی جن خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ان کے علاوہ بھی عابؔد کے یہاں موضوع و مواد اور اسالیب کے مختلف تجربے ملتے ہیں۔جس کا احساس نہ صرف قاری کو ہوتا ہے بلکہ اس کا احساس عابؔد کو خود بھی تھا۔اسی لیے لکھتے ہیں۔

آپ کی کس کس بات پر تبصرہ عابؔد کرے
بندہ پرور ! آپ کی تو ہر ادا پُر لُطف ہے

سید قیصر قلنؔدر:۔

سید قیصر، نام اور قلندؔر تخلص ،ریاست کے ایک اہم شاعر گزرے ہیں۔ان کی اہمیت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ غزل کی جو روایت انھیں اپنے پیش روشعرا سے ملی تھی،قلندؔر نے انہیں پورا پورا برتا اور پھر اس میں کچھ تبدیلی اور اضافے بھی کیے کہ جن کے طفیل ان کی فنکارانہ انفرادیت واضح ہوئی۔قلندؔر نے نہ

صرف غزلیں لکھیٔ ہیں بلکہ نظم نگاری میں بھی قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ پرچھائیاں، ساقی نامہ، استفسار، دفن کون ہے، وغیرہ جیسی نظمیں ان کی شعری صلاحیتوں کی مظہر ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات سے شاعر کا اپنے وطن (کشمیر) کی تہذیب وثقافت سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن قلندؔر کا اصل میدانِ سخن غزل ہے۔ یہاں یہ بات افسوس کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ رسالہ ''شیرازہ'' کے کئی کئی شمارے مطالعہ کرنے کے بعد بھی مشکل ہی سے قیصر قلندؔر کی کوئی غزل یا ان کے متفرق اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ صرف ان کے غنائیوں کا ایک مجموعہ ''سازِ جمال'' کے نام سے ملتا ہے۔ قلندؔر کی شعری خوبیوں کے تعلق سے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی لکھتے ہیں۔

> ''قیصر قلندؔر ایک ایسے شاعر گزرے ہیں جن کی شاعری کو خواب اور حقیقت کا ایک حسین امتزاج کہا جاسکتا ہے۔ وہ اس لئے کہ اُن کی مساعیٔ جمیلہ سے اردو شاعری ''غنایئے'' اور ''تصوریئے'' سے روشناس ہوئی۔ ''سازِ جمال'' کے عنوان سے اُن کے غنائیوں کا مجموعہ چھپ چکا ہے۔''(21)

قیصر قلندؔر کے دستیاب شدہ کلام کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے نظموں کے مقابلے میں زیادہ تر غزل کو ہی اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر رومانی ذہن رکھتے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ وہ چند ہمعصر ادبی رجحانات سے بھی واقف رہے۔ اصل میں اُن کے دل ودماغ کو جس تجربے سے تحریک ملتی تھی وہی ان کا پسندیدہ موضوع ہوتا تھا۔ قلندؔر کی شعری بصیرت کے تعلق سے پروفیسر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں۔

> ''قیصر قلندؔر چند ہم عصری رجحانات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ حساس دل کے مالک ہیں، چونکہ ان کی تربیت شعری اصولوں

کے روایتی ماحول میں ہوئی ہے۔اس لیے وہ روایت کے گہرے
اثرات سے دامن کش نہیں ہو سکے ہیں۔وہ کافی ریاضت سے
الفاظ کو سجاتے اور سنوارتے ہیں۔تاہم ان کے موضوعات میں
واضح تبدیلی آ رہی ہے اور جدید آہنگ کے بعض عناصر جگہ پا رہے
ہیں۔''(22)

قیصر قلندؔر کا ایک امتیازی وصف ان کے موضوعات کی رنگا رنگی اور ان کی عصری آ گہی ہے۔ان کے یہاں خوابِ افسردگی اور آرزومندی کے احساسات ملتے ہیں۔قلندؔر کے کلام میں ندرت بھی ہے اور شگفتگی بھی،انھیں خوبصورت الفاظ سے اپنے کلام کو موثر بنانے کا ہنر آتا ہے۔قلندؔر کے ابتدائی دور کا کلام رومانیت کے مختلف عناصر بے چارگی، دردمندی، افسردگی،احساسِ حسن وغیرہ میں گھرا ہوا ہے۔وہ روایتی لفظیات، شمع، زلفِ یار، آغوشِ تمنا، چاندنی، احساسِ طرب، رنگِ حیا جیسے مناسب الفاظ اور تراکیب استعمال کرتے ہیں۔لیکن ایسا کرتے ہوئے اکثر اوقات ان کے محسوس تجربات لفظوں میں کھو گئے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہ کوئی شاخِ سمن ہے نہ کوئی پارۂ سنگ
یہ میرا دل ہے تیرے غم کا سہارا تنہا

جب درد کی شمعیں جلتی ہیں، احساس کے نازک سینے میں
اک حسن سا شامل ہوتا ہے پھر تنہا تنہا جینے میں

آغوشِ تمنا چھو آئیں جب زلفِ یار کی خوشبوئیں
آنکھوں میں ساون لہرایا، دیپک سے سلگے سینے میں

قیصر قلندرؔ کی شاعری میں افکار کا ایسا خزانہ ہے جو انھیں عوام و خواص کی محفلوں کی رونق بڑھانے کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے غزل کی شائستگی کو دوبالا کرنے میں بڑے انہماک سے کام لیا ہے، جس سے ان کے یہاں جدید ڈھنگ کے متعدد عناصر جگہ پا گئے ہیں۔ قلندرؔ کی غزلوں میں زندگی کے مختلف تجربے ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دل کے صحرا میں کسی یاد کا بادل بھی نہیں
کوئی پیکر، کوئی گیسو، کوئی آنچل بھی نہیں

اپنے چہروں پہ کئی خول چڑھا لیتے ہیں لوگ
جھانک کر دیکھو جو سونا ہے پیتل بھی نہیں

کیا دور ہے ہر چیز کا بازار لگا ہے
کندن سے بدن، نغمے یہاں داو پہ سب ہے

مذکورہ بالا اشعار میں روایت کے ساتھ ساتھ بہت لطیف اور واقعیت پسندانہ سلوک ملتا ہے۔ ساتھ ہی ان میں سادگی اور صفائی ہے۔ قیصر قلندرؔ ماضی و حال میں کسی ایک کے ہو کر رہ جانے کے برعکس اپنی شاعری میں زبان اور حالت کے مابین ایک ایسے لمحۂ خود آگہی کی جانب بڑھتے ہیں، جو بالآخر عصری شاعری ہی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ کہیں کہیں ان کے ہاں افسردگی، تنہائی اور کرب کے احساسات کی شدت بھی ملتی

ہے۔

آنکھوں میں تمناؤں کا ہے شہرِ خموشاں
ہونٹوں سے مرادوں کی یہ میت تو اُتاروں

جادۂ درد ہے، تنہا سفری ہے یارو
دشتِ اُمید ہے شوریدہ سری ہے یارو

ہر سانس سے ڈر لگتا ہے، سناٹا ہے کیسا
لمحوں کی یہ کٹتی ہوئی زنجیر ہلادوں

ہم سے کیا پوچھتے ہو شہرِ وفا کا عالم
اک عجب طور کی بے داد گری ہے یارو

قیصر قلندر نے غزل کو عشق کی وادیوں سے نکال کر زندگی کی سنگینی اور حیات کی ناہمواری کا ترجمان بنایا ہے۔ وہ اظہار و بیان اور اسالیب میں نئے نئے شاعرانہ الفاظ کے استعمال سے اسلوب کے امکانات میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ عصری طرزِ اظہار کے لیے قلندر نے چند نئے الفاظ کو علامتی انداز میں استعمال کر کے اشارتی مفاہیم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ جادہ، صحرا، کانٹے، دشت، سناٹا، آندھی، پیڑ، برف وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی بہت سی غزلوں میں ابہام کا حسن ہے اور لفظوں کے اندر اشارتی معنی جاگتے نظر آتے ہیں۔ گویا لفظ ان کے ہاتھ میں ایک فعال اور توانا قوت میں تبدیل ہو رہا ہے۔

کوئی نہ دیکھ سکا رقصِ آبلہ پایاں
ہزار حادثے گزرے صدا کے رستے میں

رعنائیوں میں ڈوب گئی ہے تمام رات
جلوے دمک رہے ہیں ابھی سبز گھاس پر

جلتے ہوئے چہرے ہیں سلگتے ہوئے لب ہیں
ارمانوں کے صحرا کے مسافر بھی عجیب ہیں

قیصر قلندؔر ایک باہمت شخص تھے۔ وہ گھاٹیوں سے گزر کر چوٹیوں پر پہنچے تھے، اس لیے وہ دوسروں کو بھی رفعتوں کا راستہ دکھاتے ہیں۔ انھیں خیالات سے پُر قیصؔر کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیں جو ''ہمارا ادب'' کے دسمبر 1979 کے شمارے میں طبع ہوئی ہے۔

اس تیرہ سرزمین سے مثالِ قمر چلو
دیکھو فرازِ نور و نشیبِ سفر چلو

باہیں اُٹھائے یاد کوئی دلنواز یاد
تجھکو پکارتی ہے سرِ رہگزر چلو

نکہت کے گیسوؤں کو سمیٹو سحر ہوئی
خوشبو بدن کی لے کے نسیم سحر چلو

دیکھو وہ کربلائے تمنا ہے اُس طرف
صحرا لہو لہو ہے یہاں بے خطر چلو

آنکھوں میں آرزو کے جلاتے رہو چراغ
تاریکیوں میں نور اُگاؤ، مگر چلو

زلفوں کی شام سے چلو صبح بدن تلک
سیلِ بہارِ شوق میرے ہم سفر چلو

کہرام خواہشوں کا بپا ہے قدم قدم
اپنی متاعِ درد لیے سوچ کر چلو

(ہمارا ادب شمارہ 1979)

یہاں پر اس طویل مثال کا صرف ایک مدعا ہے کہ قیصر قلندؔر کی غزل کو خصوصیت کے ساتھ دیکھا جائے کیونکہ اس طرح کی غزلیں اردو ادب میں کم ہی نظر آتی ہیں۔ الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ قلندؔر نے غزل کے میدان میں نئے تجربات اور پُر کیف خیالات اور قدیم وجدید دونوں روایات سے معقول استفادہ کرتے ہوئے اردو غزل میں اچھی کوشش کی ہے۔

ہیم راج ٹھپہ انیسؔ ہیرانگری:۔

ہیم راؔج ٹھپہ انیسؔ ہیرانگری 1947 کے بعد کے شعرا میں ایک اہم نام ہے۔آپ 1930 کو

لاہور میں پیدا ہوئے۔اپنے وطن میں ابتدائی تعلیم کے مراحل طے کرنے کے بعد تقسیمِ ہند سے پہلے ہی جموں کے ایک علاقہ کوٹہ میں آ کر آباد ہوئے۔ یہاں کی ادبی و علمی فضا ان کے لئے قدرت کا ایک انعام ثابت ہوئی اور ذکاوت و فطانت کے جو جوہر انھیں قدرت نے عطا کیے تھے وہ چمکنا شروع ہوئے۔ چنانچہ علما و فضلا سے مروجہ تعلیم کے حصول کے بعد شعر و شاعری کی طرف راغب ہوئے۔انھوں نے ریاست کے مشہور شاعر جناب برق پونچھوی کے سلسلۂ تلامذہ میں رہ کر اکتسابِ فیض حاصل کیا اور جلد ہی شعر گوئی کی اس منزل تک پہنچے جہاں فن اپنی تکمیل کا اعلان کر دیتا ہے۔انیسؔ کا کلام اس وقت کے مختلف اخبارات و رسائل میں چھپنے کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کے جموں اسٹیشن سے نشر ہوتا تھا۔اس بارے میں معلومات بہم پہنچاتے ہوئے عرشؔ صہبائی لکھتے ہیں۔

> ’’ہیمراج کا کلام آل انڈیا ریڈیو کے جموں اسٹیشن سے نشر ہوتا رہتا ہے۔آپ سیاست سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور جموں و کشمیر یوتھ کانگریس کی ایڈہاک کمیٹی کے اہم رکن تھے۔‘‘(23)

انیسؔ کے تعلق سے ہمیں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتی، لیکن ان کی دستیاب شدہ چند غزلوں کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ انیسؔ کو اردو کی تمام اصنافِ سخن میں غزل سب سے زیادہ محبوب صنف تھی۔اس طرح وہ فطرتاً غزل کے ہی شاعر تھے اور اسی صنف میں ان کی طبیعت کے جوہر کھلے۔انھوں نے کثیر تعداد میں غزلیں کہی ہونگی، لیکن ان میں سے اکثر زمانے کی کج اَدائی کی بدولت ان کی زندگی ہی میں تلف ہوئی ہیں۔ مجھے عرشؔ صہبائی کے مرتب کردہ تذکرے ’’جانے پہچانے لوگ‘‘ سے ان کی تین غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ایسی صورت میں ان کی غزل گوئی کے تعلق سے اظہارِ خیال کرنے کے سلسلے میں اسی متاعِ سخن کو پیشِ نظر رکھا جا سکتا ہے۔ان غزلوں کے مطالعے سے شعر و شاعری پر انیسؔ کی گرفت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

انیسؔ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی زبان و بیاں کی سلاست و سادگی ہے۔وہ ایک سیدھی سی بات

کو سیدھے الفاظ میں کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ اس چیز کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ کہیں شعریت کا دامن نہ چھوٹ پائے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں بے پناہ سادگی وسلاست کے باوجود بھی ایک طرح کی تازگی وشگفتگی محسوس کی جاتی ہے۔ندرتِ بیاں بدعاتِ اسلوب کے لحاظ سے کچھ اشعار فنکاری کے کامیاب نمونے کہے جاسکتے ہیں۔الفاظ کے انتخاب میں وہ ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔جوان کی غزلوں کی لطافت وجاذبیت میں اضافہ کرتی ہے۔ان کے اشعار سادہ ہوتے ہوئے بھی دل میں اُتر جانے کا ہنر رکھتے ہیں۔

جو اُن کو بنا دے رلانے کے قابل
وہ شکوے نہیں لب پہ لانے کے قابل

انہیں سے ہے قائم وقارِ محبت
یہ آنسوں نہیں ہیں، بہانے کے قابل

ہمیں آسماں یوں ستاتا ہے جیسے
ہمیں رہ گئے ہیں ستانے کے قابل

یہ پُر کیف منظر یہ رنگین فضائیں
یہ موسم ہے پینے پلانے کے قابل

جسے ہو کچھ احساس الفت کے غم کا
وہی دل ہے ہنسنے ہنسانے کے قابل

نہ چھیڑ اے انیسؔ اپنے غم کی کہانی
یہ قصہ نہیں ہے سنانے کے قابل

انیسؔ کے یہاں ایک غزلِ مسلسل بھی ملتی ہے۔جس کا ہر جزو ایک علیحدہ غزل نظر آتا ہے لیکن غیر محسوس طور پر تمام اشعار ایک ساتھ جُڑے ہوئے ہیں، بالکل ڈرامے کے مختلف ابواب کی طرح جو ایک دوسرے سے مختلف مناظر کو پیش کرتے ہیں لیکن بالآخر یہ تمام مناظر باہم آمیز ہو کر ڈرامے کا انجام تشکیل دیتے ہیں۔ پہلا جز ومحبوب سے پہلی ملاقات کے تاثر کا مظہر ہے۔جس دلنشین انداز سے اس جزو میں محبوب کی تشبیہاتی سراپا نگاری کی گئی ہے۔وہ محبوب کو بہت قریب سے اور بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہی کی جا سکتی ہے۔اس طرح اسے ملاقات کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔

گلوں کا بانکپن تم ہو چمن کی دلکشی تم ہو
بہارِ عشق میں کھلتی ہوئی رنگین کلی تم ہو

تمہاری مست آنکھوں کے اشارے کوئی کیا سمجھے
جو سمجھی ہی نہیں جاتی وہ رمزِ آگہی تم ہو

ہزاروں لذتیں جس غم میں ہیں وہ غم تمہارا ہے
ہزاروں راحتیں قربان جس پر وہ خوشی تم ہو

یہ مانا مجھ کو بھی زورِ قلم پر ناز ہے لیکن
حقیقت کی اگر پوچھو تو میری شاعری تم ہو

صبا تیرا گزر ہو ان کے کوچے سے تو یہ کہنا
انیسؔ جاں بہ لب کہتا ہے میری زندگی تم ہو

مذکورہ اشعار میں ایک طرح کا مکالماتی انداز پایا جاتا ہے۔ یہ انداز ان کی نظروں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور جب یہ انداز اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے تو ان مضامین میں بھی رنگینی و رعنائی پیدا ہوتی ہے اور فرسودہ خیالات بھی ایک نئی آب و تاب کے ساتھ آئینۂ الفاظ میں جلوہ نمائی کرتے ہیں۔

انیسؔ اساتذۂ فن میں غالبؔ کے معتقد تھے اور غالبؔ کے کلام سے زیادہ ہی متاثر تھے۔ حسنِ بیاں اور لطافت زبان میں غالبؔ ہی کی اتباع کرتے ہیں جس کا احساس اُن اشعار کو پڑھنے کے بعد بخوبی ہوتا ہے، جو غالبؔ ہی کی زمین میں کہے گئے ہیں۔ یہاں غالبؔ کے طرز کی پیروی میں پہلے غالبؔ کا شعر پیشِ خدمت ہو۔

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے

اب اسی شعر کے موضوع اور زمین میں لکھا ہوا انیسؔ کا یہ شعر دیکھیے۔

تمہیں پر منحصر ہے دل کی آبادی و ویرانی
جو میری زندگی تم ہو تو میری موت بھی تم ہو

بلالعموم ایسا ہوتا ہے کہ ایک شاعر کی قلبی کیفیت کا اظہار غزل کے کسی ایک شعر میں ہی ہو پا تا ہے اور اسی بنیاد پر اسے حاصلِ غزل شعر کہا جا تا ہے اور اس کی بنا پر ساری غزل کو کامیاب قرار دیا جا تا ہے۔ جو راقم کی نظر میں یہ مناسب رو یہ نہیں ہے، بلکہ ایک غزل کو اسی صورت میں کامیاب قرار دیا جانا چاہئے جب اس کے تمام اشعار عمدگی کے حامل ہوں۔ اس سلسلے میں انیسؔ کی اس غزل کو دیکھئے۔

حیاتِ غم کی ہر مشکل کو آسان کر لیا میں نے
جو اپنی موت سے ملنے کا پیماں کر لیا میں نے

جہانِ رنگ و بُو میں اک گل تر کے لئے ہمدم
الجھ کر خار سے ٹکڑے گریباں کر لیا میں نے

دل پر درد کے نغمے کچھ ایسے ڈھنگ سے چھیڑے
کہ ہر تارِ نفس کو ہی غزل خواں کر لیا میں نے

لڑکپن کا زمانہ کیا نشاط افزا زمانہ تھا
جواں ہو کر عبث دل کو پریشاں کر لیا میں نے

کچھ اس انداز سے سجدے گزارے انکے قدموں میں
کہ اپنے ساتھ قدموں کو بھی حیراں کر لیا میں نے

تری فُرقت میں اے ساقی غموں کے اشک پی پی کر
ہزاروں بار شغل بزمِ رنداں کر لیا میں نے

زمانے کی ہوائیں جب کہ راس آئیں مرے دل کو
انیسؔ اپنے غموں کا پی کے درماں کر لیا میں نے

مندرجہ بالا غزل میں شاعر کی قلبی کیفیات کا بلاکم وکاست اظہار ہوا ہے۔اس غزل کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کا ہر شعر یکساں تاثر اور فنی حسن کا حامل ہے۔الغرض ان چند غزلوں کی روشنی میں انیسؔ کی شعری صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اس قادرالکلامی کے باوجود ان کی گمنامی وعدم مقبولیت کے اسباب کو زیرِ بحث لانے کے بجائے حیدر علی آتش کی زبان سے نکلا ہوا مجھے یہ مصرعہ یاد آتا ہے۔

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اشتیاق خورشیدؔ کاظمی:۔

نام،اشتیاق حسین کاظمی اور خورشیدؔ تخلص کرتے تھے۔خورشیدؔ کی پیدائش 1937 میں ضلع جموں کے ''رنبیر سنگھ پور'' علاقے میں ہوئی۔وہ ایک معزز،خوشحال،تعلیم یافتہ اور شعروادب کے شائق خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے والد کا نام سید فتح حسین شاہ ظفر کاظمی تھا۔جوخود بھی ایک خوش فکر شاعر تھے۔اشتیاق خورشیدؔ نے اپنی ابتدائی تعلیم جموں سے حاصل کی،اس کے بعد خالصہ کالج امرتسر میں بی۔ایس سی،زراعت میں داخلہ لیا اور یہاں سے بی۔ایس سی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انڈین فارسٹ کالج ڈیرہ دون سے فارسٹری (Forestry) کی ٹریننگ حاصل کی۔یہ ٹریننگ ختم کرنے کے بعد ان کا تقرر محکمہ جنگلات میں

اسسٹنٹ فارسٹ آفیسر کے عہدے پر ہوا اور آخر تک اسی محکمے سے وابستہ رہے۔

اشتیاق خورشید کو بچپن ہی سے علمی و ادبی ماحول میسر ہوا۔ ساتھ ہی باپ کی صحبت میں رہنے کے سبب شعر و شاعری کی طرف رجحان ایک عام سی بات ہے۔ اس طرح ذوقِ شاعری انھیں ورثے میں ملا تھا۔ والد کے اثرات اور ہمہ وقت شعر و شاعری کے چرچے نے اشتیاق خورشید کو بھی بچپن ہی میں شعر و شاعری کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے شاعری کی کسی خاص صنف میں طبع آزمائی نہیں کی ہے، بلکہ قطعہ نویسی، نظم نگاری اور غزل گوئی میں قابلِ تحسین نمونے چھوڑے ہیں۔ شعر و شاعری کی طرف ان کے رجحان کے تعلق سے عرش صہبائی اپنے تذکرے ''جانے پہچانے لوگ'' میں لکھتے ہیں۔

> ''شاعری کے ابتدائی دور میں جموں کے ایک گمنام شاعر جناب حسن محمد منہاس (مرحوم) نے رہنمائی کی۔ امرتسر میں رہائش کے دوران ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ سے حوصلہ افزائی ہوئی۔ ڈیرہ ڈون سے جناب جوش ملسیانی صاحب کی خدمت میں لکھا کہ وہ اپنے حلقہ تلامذہ میں شامل کر لیں۔ لیکن ان کی طرف سے بہت حوصلہ شکن جواب ملا ''میری مخلصانہ رائے ہے کہ آپ اس سے باز آئیں۔ شاعری آپ کے بس کا روگ نہیں۔'' (24)

جوش ملسیانی نے کن وجوہات کی بنا پر یہ رائے دی ہے۔ اس تعلق سے کچھ کہنا بعید از قیاس ہوگا، لیکن ان کا جو ادبی سرمایہ دستیاب ہوا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شعر و سخن کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ اگرچہ دوسرے کئی شعرا کی طرح اشتیاق خورشید کا ادبی سرمایہ زمانہ برد ہو چکا ہے، لیکن عرش صہبائی کے تذکرے ''جانے پہچانے لوگ'' 1966 سے ان کی دو غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن کا انتخاب کرنا یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں۔

﴿غزل نمبر 1﴾

نگاہِ مست سے مجھ کو پلانے کون آیا ہے
مجھے یہ راہِ میخانہ دکھانے کون آیا ہے
یہ خوابیدہ محبت کو جگانے کون آیا ہے
وفا کی داستان پھر سے سنانے کون آیا ہے
جو مٹتی جا رہی تھی میرے دل سے اے جفا پیشہ
تری تصویر وہ پھر سے بنانے کون آیا ہے
میں دانستہ کنارہ کر گیا تھا، بے تعلق تھا
یہ پھر سے راہِ مے خانہ دکھانے کون آیا ہے
یہ کون آیا ہے لے لے دعوتِ مے اپنی آنکھوں میں
مرے جذباتِ خوابیدہ جگانے کون آیا ہے
دلِ خورشید کی تاریکیوں میں آپ ہی کہہ دیں
مثالِ شمع پھر سے جگمگانے کون آیا ہے

﴿غزل نمبر 2﴾

ترسے گا عمر بھر ہی یہ دیدارِ یار کو
آئے گا خاک چین دلِ بے قرار کو
ہر گل کو اک شعلۂ عُریاں بنا گئی
لگ جائے آگ ایسی نسیمِ بہار کو

گلشن ہی اس کو راس نہ صحرا ہی اس کو راس
لے جاؤں اب کہاں میں دلِ بے قرار کو
اُڑتی رہے گی نیند یونہی خوابِ حور میں
سمجھائے کون زاہد شب زندہ دار کو
خورشید رو رہا ہے شب ماہتاب میں
کس کا ہے انتظار اس اختر شُمار کو

اشتیاق خورشیدؔ کی ان دو غزلوں کو زیرِ تحریر لانے میں میرا یہی مقصد ہے کہ ایک تو ان کے کلام کو محفوظ کیا جائے، دوسرا یہ کہ آنے والی نسلیں ان کے نام سے واقف ہو کر ان کے بارے میں اور زیادہ جاننے کی کوشش کریں گی۔

سید فتح حسین شاہ ظفرؔ کاظمی:۔

سید فتح حسین شاہ ظفرؔ کاظمی کی پیدائش صوبہ جموں کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ ان کے خاندان کی شرافت اور بزرگی کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ظفرؔ کاظمی کا گھر علم و ادب کا گہوارہ رہ چکا ہے اور کتابوں کا ایک بہت بڑا سرمایہ ان کے گھر پر موجود تھا جس کے سبب ان کے اندر ذوقِ سخن طالبِ علمی کے زمانے ہی سے شروع ہوا۔ ظفرؔ کا پورا خاندان عشقِ رسولؐ سے سرفراز تھا، اس لیے انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا اسلام ہی سے کیا اور یہ مذہبی رنگت ان کی غزلوں پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ عرشؔ صہبائی اپنے تذکرے ''جانے پہچانے لوگ'' میں ظفرؔ کی شعری خوبیوں کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

> ''ظفرؔ صاحب نے قدرت سے طبیعتِ شاعرانہ پائی اور طالبِ علمی
> کے زمانہ سے شعر کہنا شروع کیا۔ چونکہ تمام خاندان مدحِ رسولؐ

اور آلِ رسولؐ کو ذریعۂ نجات تصور کرتا تھا۔ لہٰذا اسی اثر کے تحت
جناب ظفر نے سلام کہے اور اپنی ابتدائی غزلوں میں بھی اس صنف
کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ظفؔر کا کلام سرمایۂ شعروادب میں ایک
گراں قدر اضافہ ہے اور اضافہ بھی کیسا، جو اپنے دامن میں بحرِ
عرفان کے گہر ہائے آبدار سمیٹے ہوئے ہیں۔''(25)

ظفؔر کاظمی اگرچہ ایک مذہبی شخصیت کے حامل تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے شعری مزاج کو صرف سلام اور مناقب لکھنے تک محدود نہیں رکھا، بلکہ نظم نگاری اور غزل گوئی میں بھی قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ ظفؔر کاظمی کے دور میں صوبۂ جموں میں مشاعروں کا سلسلہ زوروں پر رہا، لیکن ظفؔر کو مشاعرے پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ مجبور کر دیے جاتے تو اپنا کلام سنا دیتے تھے۔ عرشؔ صہبائی نے اپنے تذکرے'' جانے پہچانے لوگ'' کے صفحہ 202 پر لکھا ہے۔''26/دسمبر 1964 کو جموں میں بزم اردو ادب کے زیر اہتمام کُل ہند مشاعرہ ہوا، میری خاص گزارش اور مودبانہ التماس پر آپ نے خاص کرم فرمایا اور یہ غزل سنائی۔

یاروں کو شکایت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
خود مجھ کو بھی حیرت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

موزوں ہے مری طبع پئے شعر و لیکن
افتادِ طبیعت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کہنے کو زبان ایک ہے سننے کو ہیں دو کان
یہ حسنِ سماعت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

لکھتا ہوں کبھی میں تو سلام اور مناقب
جُز اس کے حقیقت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

خاصانِ خدا کی جو محبت میں ہوں سرشار
یہ پاسِ مودت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

آج عرشؔ کے کہنے پہ ظفرؔ میں نے کہا کچھ
ورنہ مری عادت ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

الغرض ظفرؔ کی یہ واحد غزل فرمائش کی مرہونِ منت ہے۔ اپنے شوق سے سخن سرائی کرتے تو ان کے کلام میں تنوع بھی پیدا ہوتا اور موضوعات وسعت اختیار کر جاتے۔ اصل میں ظفرؔ کاظمی نے بہت کچھ کہا ہے لیکن وہ کسی ستائش کی تلاش میں کبھی نہیں رہے۔

مختصر یہ کہ 1947 سے 1960 کے درمیانی عرصے میں اردو شاعری میں تجربوں کا جو رجحان نمایاں رہا ہے، ریاستی شعرا نے اپنے مزاج کے مطابق ان تجربوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ ان تجربوں کے تحت آگے بڑھنے کا رجحان جن شعرا کے یہاں ملتا ہے، اُن کو صرف مذکورہ بالا ناموں تک ہی محدود کیا جا سکتا ہے۔ ان ادیبوں نے باشعور شعرا کی حیثیت سے ان رجحانات کو اپنی استطاعت کے مطابق فروغ دیا ہے، اگرچہ ان کے تجربوں کی تعداد کم ہے، لیکن ان میں فنکارانہ توانائی اور تازگی ضرور ہے۔ ان شعرا کے تجربات اور خیالات سے آگے آنے والے شعرا نے تحریک پائی اور شاعری میں جدید موضوعات و

تجربات کو اپنا کر اردو غزل میں قابلِ قدر اضافے کیے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ تقسیمِ ہند کے بعد اردو ادب میں جو نئے رجحانات تیزی سے جنم لے رہے تھے۔ان کی نشاندہی کا کام اگلے ابواب میں کیا جائے گا۔اس لیے کہ 1960 کے بعد میں جو نوجوان شعرا ریاست کی شعری اُفق پر جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ان کی تخلیقات کے مطالعے سے جدید رجحانات اور نئی قدروں کا ملنا زیادہ ممکن ہے۔ کیونکہ اس دور میں نئی قدریں واضح صورت اختیار کر رہی تھیں نیز اُن شعرا نے صحیح میں جدید عہد کے تقاضوں کو اپنی غزلوں میں نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔

☆☆☆

حوالے

(1) ڈاکٹر برج پریمی، کشمیر کے مضامین (ادب اور ثقافت)، اشاعت 1989۔ صفحہ 10

(2) میر غلام رسول نازکی، متاعِ فقیر (شعری مجموعہ) مطبع، شالیمار آرٹ پریس (سرینگر)، اشاعت 1996، صفحہ 10

(3) میر غلام رسول نازکی، شعری مجموعہ۔ متاعِ فقیر، اشاعت۔ 1996، مطبع، شالیمار آرٹ پریس (سرینگر) صفحہ 11

(4) میر غلام رسول نازکی، شعری مجموعہ۔ متاعِ فقیر۔ مطبع۔ شالیمار آرٹ پریس (سرینگر) اشاعت۔ 1996۔ صفحہ 6

(5) شیرازہ نمبر۔ 006۔ 004۔ صفحہ نمبر 157

(6) ڈاکٹر برج پریمی۔ جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما (تنقید وتحقیق)۔ مطبع، رچنا پبلی کیشنز، جموں۔ صفحہ 182

(7) بحوالہ، متاعِ فقیر از میر غلام رسول نازکی۔ صفحہ 7

(8) ڈاکٹر شبینہ پروین، مضمون۔ کشمیر کی اردو غزل کی ثقافتی بنیادیں۔ مشمولہ۔ اردو غزل کی ثقافتی اساس۔ مصنف، ڈاکٹر شبینہ پروین، صفحہ 114۔ اشاعت۔ 2008۔ مطبع۔ ینگ پبلشنگ ہاوس (دہلی)

(9) ڈاکٹر شبینہ پروین، مضمون۔ کشمیر کی اردو غزل کی ثقافتی بنیادیں۔ مشمولہ۔ اردو غزل کی ثقافتی اساس۔ مصنف، ڈاکٹر شبینہ پروین، صفحہ 114۔ اشاعت۔ 2008۔ مطبع۔ ینگ پبلشنگ ہاوس (دہلی)

(10) شورؔیدہ کاشمیری۔ شعری مجموعہ، جوشِ جنوں۔ اشاعت، 1980۔ مطبع۔ جمال پرنٹنگ پریس (دہلی)، صفحہ 15

(11) حامدی کاشمیری، ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب۔ مطبع، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز (سرینگر) اشاعت 2010 صفحہ 102

(12) ڈاکٹر عبدالقادر سروری۔ کشمیر میں اردو، جلد دوم، اشاعت 1982، صفحہ 333

(13) حامدی کاشمیری، ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب۔ مطبع، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز (سرینگر) اشاعت 2010 صفحہ 104

(14) عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو (حصہ سوم)۔ اشاعت، 1984۔ مطبع، جے کے آفیسٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔ صفحہ 31

(15) ڈاکٹر شفق سوپوری، غ۔م۔طاؤس ''فن اور شخصیت''۔ مطبع۔ عفیف پرنٹرز (دہلی)، اشاعت، 2012۔ صفحہ 38

(16 پروفیسر ایاز رسول نازکی، تذکرہ شعرائے کشمیر۔ مشمولہ، شیرازہ، جموں وکشمیر میں اردو شاعری نمبر۔ صفحہ 77

(17) حامدی کاشمیری، ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب، صفحہ نمبر 140

(18) میری نظر میں۔ از، گیان چند جین، مشمولہ۔ مجموعہ، شمیمِ گل، از عابؔد مناوری صفحہ ۱۰، اشاعت، دسمبر/ 1967 مطبع، بالی

پبلکیشنز (جموں)

(19)عابدؔ مناوری، مجموعہ، بہار غزل، اشاعت۔ جون۔ 1961 مطبع۔ چاند پریس (جموں) صفحہ 4

(20)شیرازہ جلد 21 نومبر 1983۔ نوجوان نمبر شمارہ 11۔ جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز (سرینگر)

(21)ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، جموں وکشمیر میں اردو شاعری 1947ء کے بعد۔ مشمولہ، رسالہ، شیرازہ۔ جموں وکشمیر میں اردو شاعری نمبر، صفحہ 189

(22)ہمارا ادب، شیرازہ انتخاب نمبر، 1979 نگراں، محمد یوسف ٹینگ، اداریہ۔ جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز (سرینگر)

(23)عرشؔ صہبائی۔ تذکرہ، جانے پہچانے لوگ، مطبع، ٹائٹل وفوٹو بلاک قانون پریس (امرتسر)، اشاعت 1966، صفحہ 58

(24)عرش صہبائی، تذکرہ'' جانے پہچانے لوگ''صفحہ نمبر 89

(25)عرشؔ صہبائی۔ تذکرہ، جانے پہچانے لوگ، مطبع، ٹائٹل وفوٹو بلاک قانون پریس (امرتسر)، اشاعت 1966، صفحہ 198

باب سوم

جموں و کشمیر میں جدید اردو غزل کا فنی و فکری مطالعہ

''1960 سے 1980 تک''

خوف، تنہائی، ہلاکت، بے یقینی ، انتشار
آج کے ہر فرد کا یہ حاصلِ تقدیر ہے
(منشور بانہالی)

بقول آل احمد سرور:۔

''فکر سے فن کو آب وتاب ملتی ہے۔''(1)

جہاں فکر سے فن کو آب وتاب ملتی ہے، وہیں فن سے فکر کو تاب وتوانائی ملتی ہے، یعنی فکر وفن ایک دوسرے کے لئے لازم وملزم ہے اور جب یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ مل جاتی ہیں، تبھی ایک اچھا فن پارہ وجود میں آسکتا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں جدید اردو غزل کے فنی وفکری پہلوؤں پر بات کرنے سے پہلے ہم جدید شاعری کی اصلیت اور اس کے امتیازی پہلوؤں کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کریں گے اور پھر انھیں پہلوؤں کو مدِ نظر رکھ کر ریاست کی غزلیہ شاعری کو جانچنے اور پرکھنے کی سعی کریں گے۔

ہر دور میں بدلتے ہوئے حالات وواقعات کے تحت ایک نئے شعری مزاج کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ شعری مزاج چند بنیادی خصوصیات، جن کا علاماتی اظہار اس عہد کی شاعری میں ہوتا ہے' کی بنا پر پہچانا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ اردو شاعری میں بلاشک 1960 کے بعد چند نئے رجحانات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس وقفے کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں جو شاعری معرضِ وجود میں آئی ہے، اس کی چند بنیادی خصوصیات کی بنا پر اسے ایک نئے دور سے موسوم کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدید دور کی انفرادی خصوصیات کیا ہیں اور وہ کون سے حالات ہیں جو اس عہد کو گذشتہ ادوار سے الگ کر دیتے ہیں۔ اس تعلق سے پروفیسر آل احمد سرور کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''جدیدیت صرف انسانی تنہائی، مایوسی، اس کی اعصاب زدگی کی داستان نہیں ہے۔ اس میں انسانیت کی عظمت کے ترانے بھی ہیں۔ اس میں فرد اور سماج کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا گیا ہے، اس میں انسان دوستی کا جذبہ بھی ہے، مگر جدیدیت کا نمایاں روپ آج آئیڈیالوجی سے بیزاری، فرد پر توجہ، اس کی نفسیات پر

تحقیق، ذات کے عرفان، اس کی تنہائی اور اس کے موت کے تصور سے خاص دلچسپی ہے۔اس کے لیے اسے شعروادب کی پرانی روایت کو بدلنا پڑتا ہے۔اسے نیا رنگ وآہنگ دینا پڑتا ہے۔اس کے اظہار کے لیے اسے علامتوں کا زیادہ سہارا لینا پڑتا ہے۔‘‘(2)

مذکورہ اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ جدید دور کی فکری تہوں کی اصلیت کیا ہے۔جدید دور کی ایک انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ خودآ گہی کی ایک اہم منزل پر پہنچ چکا ہے۔اس دور کا شاعر اپنے عہد کا بھرپور شعور رکھتا ہے اور ساتھ ہی شعورِ ذات بھی۔جدید سائنسی انکشافات نے ، خاص طور پر خلاء کی دریافت نے زمینی سیارے کی مرکزی اہمیت اور انسان کی اشرف المخلوقیت کے روایتی تصور کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔اس کائناتی شعور نے نئے فنکار کو روایتی تصورات کے خوش آئند سہاروں سے بیزار و مایوس کر کے ذات کے کرائسس crises اور کرب میں مبتلا کر دیا ہے۔اس لیے کہ انسان مادے کا ایک معمولی جُز ہونے کے باوصف، ارتقائی سفر میں ایک ایسی منزل پر آ گیا ہے، جہاں وہ ذہنی طور پر خودآ گاہ ہو گیا ہے۔وہ زندگی ، موت، کائنات، خلا، ستاروں اور سیاروں کی اصلیت جاننے کے لیے نقشِ فریادی بن چکا ہے۔اس ضمن میں میں اپنے دعوے کے لیے ایک دلیل خلیل الرحمٰن اعظمی کی اس تحریر سے پیش کروں گا۔

’’جدید شاعری کی ایک نسل ایسی پیدا ہوئی ہے، جو انکار واثبات کے دوراہے پر اپنی شخصیت اور اپنے ذہن کو پارہ پارہ ہوتے دیکھ رہی ہے۔ یہ نسل جو نہ کافر ہے نہ مومن۔ زندگی، زمانہ، انسان، تہذیب اور کائنات کی ہر آن بدلتی ہوئی متحرک اور تغیر پذیر حقیقت کو سمجھنا چاہتی ہے۔ اس نسل نے مقررہ نظریوں، خانوں،

فارمولوں اورنعروں سے اپنا دامن چھڑا لیا ہے اور کسی وقتی اور ہنگامی
مسلک یا نصب العین سے وابستگی کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ نہیں
کیا ہے۔‘‘(3)

اس طرح جدید دور میں نوجوان شعرا کا ایک مجمع (Concourse)ہمارے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔اس مجمع کے پہلو میں نئی تدبیریں، نئے موضوعات اور نئے اندازِ بیاں ایک کشمکش پیدا کرتے رہے۔ شاعری میں ان چیزوں کی آمد ایک خارجی اور داخلی ضرورت کی پابند ہوتی ہے۔ جسے شعری، ہیتی اور لسانی تجربات کہا گیا ہے۔ادب میں ان چیزوں کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے، کیونکہ اس میں نئے تجربات کے بعض خاص اسباب ہوتے ہیں جن کے تحت کبھی کبھی یہ تجربات ناگزیر ہو جاتے ہیں،جس کی پہلی وجہ سیاسی و سماجی تبدیلیاں ہیں، ہر بڑی سیاسی وسماجی تبدیلی انسانی زندگی، اس کے رہن سہن، اس کی تہذیب اور اس کی فکر کو متاثر کرتی ہے جس کا واضح اثر اس کے مجموعی برتاوٴ behavior اور نقطۂ نظر پر دکھائی دیتا ہے۔ یہ نئے تجربات ادب میں نئے علوم کی واقفیت کی بنا پر بھی ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو قدیم دور کے انسان کی ضروریات محدود تھیں ۔یہی وجہ ہے کہ اُس دور کی شاعری بھی محدود راہوں ہی پر چل سکی۔ بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک شاعر کی نگاہیں اپنی ضروریات کے دائرے ہی میں شعریت کی تلاش کر سکیں۔لیکن جوں جوں انسانی زندگی ترقی کرتی گئی اور تہذیب وتمدن کی الجھنوں سے واسطہ پڑا۔ایک انسان کے تخیل کا ستارہ اور زیادہ چمکنے لگا، اس نے اُن چیزوں پر بھی سوچنا شروع کیا جو آج تک اس کی نگاہوں کے سامنے ہونے کے باوجود بھی اس کے تخیل میں نہ آسکی تھیں۔تہذیب وتمدن کی اس آمد سے نہ صرف احساس وجذبات کی ادبی تشفی ہوئی بلکہ اس کے بعد انسانی ذہن ہر طرح کے فطری اور غیر فطری راستوں پر گام زن ہونے لگا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچنے لگا کہ اب کون سے نقطے کو اپنی منزل بنایا جائے۔

چونکہ جدیدیت ایک انتہائی تفصیل طلب موضوع ہے۔اس لئے اس کے تعلق سے مزید کچھ کہنے

سے گریز کرتے ہوئے میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ یہاں یہ بھی کہتا چلوں کہ جدید دور کی اس عمومی صورتِ حال کو پیش کرنے سے میرا مدعا یہی تھا کہ قاری کو ریاست جموں وکشمیر کی جدید غزل کی نوعیت اور اس کے فنی وفکری پہلوؤں کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں، کہ اردو غزل آج تک سب سے زیادہ شازشوں اور مخالفتوں کا شکار ہوئی ہے۔ اردو میں جب سے تنقید کی شروعات ہوئی، تبھی سے غزل کی مخالفت کا ڈھونگ رچا ہوا ہے۔ سب سے پہلا سوال اس کی تنگ دامنی پر اُٹھا، کہا گیا کہ عشق و عاشقی کے سوا اس میں رکھا کیا ہے۔ عشق کی بات تو وہ شخص بھی کر سکتا ہے کہ جس نے کبھی عشق ہی نہ کیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی مولانا الطاف حسین حاؔلی کو غزل میں سنڈاس کی بُو نظر آئی۔ عظمت اللہ خان نے اس کی گردن اُڑا دینے کا مشورہ دیا اور کلیم الدین احمد نے نیم وحشی صنفِ سخن کہہ کر اس کے معیار کو کم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان سازشوں اور مخالفتوں کے باوجود غزل کی مقبولیت پر کوئی بھی اثر نہیں پڑا بلکہ یہ پہلے سے بھی زیادہ اُبھر کر سامنے آنے لگی۔ اس صنف نے ہر دور کی طرح جدید دور میں بھی ادب کا ساتھ نبھایا اور ملکی حالات و واقعات کو اپنے دامن میں جگہ دے کر آگے کا سفر طے کیا۔ اردو ادب کی تمام شعری اصناف میں غزل اپنی ہیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ کٹر صنفِ سخن تسلیم کی جاتی ہے۔ چنانچہ دورِ قدیم سے لیکر دورِ جدید تک ہیت کے اعتبار سے اس میں کوئی بھی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ البتہ مواد کے اعتبار سے کبھی کبھی نمایاں تبدیلیوں کا سامنا کرنا پڑا، جسے زمانے کا تقاضا سمجھا جا سکتا ہے۔ حسن و عشق کا تصور اس کا محورِ اعظم ہے۔ مگر ساتھ ہی اس پر گردش کرتے ہوئے یہ ارد گرد کے اُن حالات و واقعات سے بھی نابلد نہ رہ سکی جو دنیائے عشق کے باہر زندگی سے دوچار تھے۔ غزل میں ایک ایسی کشش اور اپنا پن چھپا ہوا ہے، کہ دنیائے ادب سے وابستہ کوئی بھی شخص اس کی چاشنی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

اردوغزل کی مقبولیت کی ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ یہ صنف اردو ادب کی دوسری اصناف ۔مثنوی، مرثیہ،قصیدہ اور رباعی کے شانہ بہ شانہ سفر کرنے کے باوجود بھی اپنا ادبی سفر طے نہ کرسکی، جب کہ دیگر مذکورہ اصناف اپنا ادبی سفرختم کر چکی ہیں۔اس کی بنیادی وجہ موضوعات کی قید ہے۔برعکس اس کے غزل میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔غزل میں اتنی گنجائش ہے کہ ایک انسان اوراس کے اردگرد رونما ہونے والے داخلی وخارجی حالات و واقعات کوغزل کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جدید دور میں بھی یہ صنف شاعروں کے تخلیقی تقاضوں کو بڑے ہی موثر طریقے سے اپنی گرفت میں لینے کا ہنر رکھتی ہے۔

دیکھا جائے تو جدید دور کے بیشتر شعرا نے نظم کے مقابلے میں غزل ہی کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے جو دراصل ترقی پسندی کی مخالفت تھی۔کیونکہ ترقی پسند دور میں غزل کی جگہ نظم اور آزاد نظم نے لے لی تھی۔اردو غزل چونکہ کلاسکی شاعری کی سب سے مقبول اور نہایت نفیس صنف رہی ہے اوراس کا احیا بھی جدید دور میں فراریت(Escapism) کی تلاش ہی کے سلسلے میں ہوا ہے۔اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔غزل اظہار و بیاں کی نسبتاً آسان صورت ہے۔ایک شاعرکوغزل کہنے میں کچھ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی ہے کیونکہ اس کا ہر شعرایک مکمل اکائی ہوتا ہے اوراس کا تعلق غزل کے اگلے یا پچھلے شعر سے نہیں ہوتا ہے۔چنانچہ دیکھا جائے تو 1960 کے بعد ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے بیشتر شعرا نے نظم کی مقبولیت کے باوجود غزل ہی میں اپنے خیالات کو پیش کیا ہے اور ایسے غزلیہ اشعار تخلیق کیے ہیں، جوان کی تخلیقی بازآفرینی کا اعادہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ اشعار معنوی ابعاد کی تجسیم کرتے ہیں۔

ہرفن کی اپنی ایک فضا ہوتی ہے۔کسی بھی زبان اوراس کے ادب سے وابستہ مختلف اصناف کسی خاص ماحول کی پروردہ ہوتی ہیں۔یہاں مجھے اس بات کو کہنے میں کوئی ہیبت نہیں ہوتی کہ ریاست جموں وکشمیر میں جدید دور سے تعلق رکھنے والے شعرا نے اپنی شکستہ اُمیدوں اور پامال شدہ جذبات واحساسات اور مایوس

تمناؤں کے سہارے شاعری کی ہے۔اگر چہ ان شعرا نے اظہار و بیاں کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق انفرادی اسلوب اختیار کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی سب کے سب محرومی اور ناکامی کے موضوع ہی میں کھوئے رہے۔اس ذہنی انتشار اور احساسِ محرومی کی جڑیں دراصل اپنے وطن کے پریشان کُن حالات میں مضمر تھیں۔

ریاست جموں وکشمیر کی غزلیہ شاعری پر غالب ترین رجحان جدیدیت کا نظر آتا ہے۔اردو ادب میں جدیدیت کا اطلاق 1960 سے شروع ہوتا ہے۔اگر چہ اس کے ابتدائی نقوش ہمیں ریاست جموں وکشمیر کی ابتدائی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں، لیکن تقسیم ہند کے المیے نے اس رجحان کو اور زیادہ بڑھاوا دیا۔اس دور میں سائنسی اور مشینی معاشرے نے انسانیت کے چہرے کو مسخ کر دیا تھا۔جس نے ہمارے شعرا کے اندر تنہائی، بے چینی، بے یقینی، شکست وریخت کے احساسات کو اور زیادہ اُبھارا۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری اردو غزل جو آج تک صرف انسان کے خارجی احساسات کی ترجمان تھی وہ اب داخلیت کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس تعلق سے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی رقمطراز ہیں۔

> ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا دوسرا گروہ 1960 کے بعد ایک نئے ادبی وشعری رجحان یعنی جدیدیت کی تحریک سے وابستہ ہو جاتا ہے، جس نے خارجیت کے بدلے داخلیت پر اپنی توجہ مرکوز کی۔اس تحریک کے زیرِ اثر ادیبوں اور شاعروں نے انسانی اقدار کی شکست وریخت، مذہبی حقائق کا بطلان، سائنسی، صنعتی اور تکنیکی میدان میں ہوئی پیش رفت کے علاوہ کربِ ذات، احساسِ محرومی، احساسِ تنہائی، ذہنی الجھنیں، فلسفہ، اخلاق، سیاست اور مذہب کی گرفت سے مکمل آزادی اور حیات وکائنات

کی افہام وتفہیم کے بدلے اپنی ذات کے عرفان کی سعی ایسے
موضوعات ہیں جنہیں یہاں کے شاعروں کے دوسرے گروہ نے
اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔''(4)

اس طرح اگر دیکھا جائے تو جدید دور سے تعلق رکھنے والے دوسرے عظیم شعرا کی طرح ریاستی شعرا نے بھی نظریاتی طور پر ترقی پسندی کی مخالفت کی ہے۔ یہ اختلاف نہ صرف نظریاتی بنیادوں پر شروع ہوا تھا بلکہ ترقی پسندوں نے اردو شاعری کی ہیت اور اسلوب میں جو توڑ پھوڑ کی تھی اس کے خلاف بھی ایک طرح کا ردِ عمل تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ملکی سطح پر شعر وادب کی دنیا میں نئے نئے موضوعات جنم لے رہے تھے۔ ساتھ ہی نئے تجربات بھی کیے گئے۔ اس دور کو جدیدیت (MODERNISM) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی فکری، نفسیاتی اور تہذیبی زندگی میں جو تبدیلیاں آ رہی تھیں اُن کی گہری پرچھائیاں ریاست کے شعری مزاج پر بھی پڑتی رہیں۔ یہاں کے شعرا مختلف عصری رجحانات کی حسبِ توفیق نمائندگی کرتے رہے اور اپنے فعال ذہن اور عصری آگہی کا ثبوت دیتے رہے۔ اس بارے میں پروفیسر حامدی کاشمیری کی شریکِ حیات، مصرہ مریم لکھتی ہے۔

''ریاست میں اردو شاعری کا تیسرا دور 1960 کے بعد کا دور
ہے۔ اس دور کے شعرا میں بھی ملک کے اردو شعرا کی طرح فکری
اور ذہنی تبدیلی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ وہ بھی ترقی پسندی کے
اثرات سے نکل کر جدیدیت کے رجحان کے تحت داخلیت کی
طرف آ گئے۔ ان کے یہاں قدروں کی پامالی، محرومی اور تنہائی اور
فطرت کے جبر کے احساسات کا اظہار ملتا ہے۔''(5)

تقسیمِ ہند کے بعد ریاست میں جو حالات رونما ہو رہے تھے، اُس کا براہِ راست اثر یہاں کے ادب

پر بھی پڑا۔ ریاست کے شعرا کے کلام میں جگہ جگہ سیاسی غلامی کے خدو خال نظر آتے ہیں۔ ان شعرا نے صحیح معنوں میں اپنے وطن کے حالات و واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ساتھ ہی روز مرہ زندگی کے مسائل کو اپنی شاعری کے ذریعے اُجاگر کیا ہے۔ ایک حساس شخص کے لیے یہ ناممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی حالات سے بیگانہ رہ سکے۔ بلکہ ان حالات کے اثرات اس پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ ادب چونکہ حال کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، جب مولانا الطاف حسین حالؔی کو غزل کی بے ہنگام نغمہ سرائی نے چونکایا اور اس طرح ''مسدس مدو جزر اسلام'' لکھ کر وقت کے تقاضے کو پورا کیا۔ اس کے بعد اقبال نے قوم کے دل سے موت کا خوف نکالنے کی کوشش کی۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ جو ادب ملکی حالات و واقعات کا ضامن نہیں ہوگا، وہ ادب زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امریکہ کے مشہور فلسفی و شاعر رولف والڈو ایمرسن (Ralph waldo Emerson) کے حوالے سے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں۔

> ''ہر دور کو خود اپنا قومی ادب (classic) پیدا کرنا چاہئے۔ یعنی ہر ادبی کارنامے میں ان عصری میلانات و خصوصیات کا ہونا ضروری ہے جن کے لیے جرمن زبان میں (zeitgiest) کی اصطلاح کی جاتی ہے اور جس کے معنی ''روح عصر'' کے ہیں۔ آج محض حسن کاری کو ادب نہیں کہتے۔ ادب اگر ملک اور زمانے کے تازہ ترین فکریات (ideology) یعنی اجتماعی خیالات و افکار کا حامل نہیں ہے تو وہ صحیح معنوں میں ادب نہیں ہے۔''(6)

قصہ مختصر یہ کہ جدید دور میں اگر ریاست جموں و کشمیر کی غزلیہ شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو ہر شعری کارنامے کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہاں کی جدید اردو غزل، ملک بھر کی جدید غزل کی طرح روایت

کی ضد نہیں ہے بلکہ روایت میں نئے فاصلوں کی جستجو کی کوشش ہے۔ایک شاعر یا ادیب کے پاس روایت سے انحراف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ایک انسان کتنا بھی بُت شکن اور باغی ہی کیوں نہ ہو، روایت سے سو فیصدی دامن چھڑا نہیں سکتا، بلکہ اس کی تخلیقات میں ماضی یعنی روایت کے زندہ عناصر ضرور شامل ہوتے ہیں۔اگر چہ فکری سطح پر انحراف کی تھوڑی بہت گنجائش رہتی بھی ہوگی لیکن فنی سطح پر ایک شخص کتنی بھی کوشش کرے، روایت کے پَر اسے اپنی آغوش میں باندھے رکھتے ہیں۔شمیم حنفی نے اپنی کتاب ''غزل کا نیا منظر نامہ'' کے صفحہ 13 پر مظفر سید کے ایک مضمون ''غالب کی بغاوت'' کے حوالے ایک برمحل بات کہی ہے۔

> ''اردو ادب کی جدید تحریک جس کا آغاز ہی غالبؔ سے ہوتا ہے،اب اپنی فکری نہج اور فنی اظہار کے سانچوں کے سلسلے میں غالب سے بہت دور جا چکی ہے، پھر بھی غالب کی رہنمائی کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔تاکہ ہم نت نئے تجربوں کی دھن میں اپنی تہذیب اور اس کے کمالات سے بالکل ہی لاتعلق ہو کر ہوا میں معلق نہ ہو جائے۔''

اس اقتباس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ روایت سے قطعی طور پر انقطاع کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔مثال کے طور پر، مرزا غالبؔ یا میر تقی میرؔ کی شاعری میں جو احساسِ شکست پایا جاتا ہے، وہ بہت سے جدید شعرا کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔جدید شعرا نے غزل میں کسی حد تک غالبؔ اور میرؔ کی لفظیات سے الگ لفظیات استعمال کر کے انھیں موضوعات کو ایک نئے طرزِ فکر کے ساتھ دوبارہ جنم دیا ہے۔ایسی ہی نہ جانے کتنی مثالیں ملے گی، جن کا بیان کرنا یہاں ضروری نہیں ہے کیونکہ اردو ادب کا سنجیدہ قاری ان حقائق سے واقف ہو گا۔یہاں مجھے ریاست کے ہی ایک شاعر محمود الحسن محمودؔ کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

شعر گوئی پہ جنہیں ناز ہے اتنا سُن لیں
میؔر و غالبؔ کی زمیں ہو تو غزل ہوتی ہے
(شعری مجموعہ، متاعِ خیال)

اس حقیقت کی طرف ٹی۔ ایس۔ ایلٹ نے بھی اشارہ کیا ہے۔ ''ہمارے حال کے اندر ماضی بھی نئے انداز سے ہمیشہ موجود رہتا ہے''۔ لیکن ان تمام حقائق کے باوجود ایسے شاعر پیدا ہوئے ہیں، جو روایت سے نئے دور کی طرف منتقلی کے لیے اپنے دائرہ فکر وفن میں رہتے ہوئے، شعوری یا لاشعوری طور پر ساز گار فضا قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر کے جن شعرا نے جدیدیت کو اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ان میں، خورشیدؔ کاظمی (پیدائش 1937) دیا رتن عاصیؔ (پیدائش 1938) شبیب رضویؔ (پیدائش 1935) مظفر ایرجؔ (پیدائش 1943) محمد زماں آزردہؔ (پیدائش 1945) ہمدمؔ کاشمیری (پیدائش 1937) حسام الدین بیتابؔ (پیدائش 1932) اقبال عظیم چودھریؔ (پیدائش 1940 سجاد پونچھیؔ (پیدائش 1946) شہبازؔ راجوری (پیدائش 1940) تنویر بھدرواہیؔ (پیدائش 1940) صابر مرزاؔ (پیدائش 1947) بلراج بخشیؔ (پیدائش 1949) فداؔ راجوری (پیدائش 1941) میرؔ حسام الدین (پیدائش 1938) محمود الحسن محمودؔ (پیدائش 1937) حسن ساہوؔ (پیدائش 1934) عشاقؔ کشتواڑی (پیدائش 1942) شام طالبؔ (پیدائش 1941) پیارے ہتاشؔ (پیدائش 1948) بشیر احمد بشیرؔ (پیدائش 1938) گلشن خطائیؔ (پیدائش 1946) اور فاروق نازکیؔ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تمام شعرا اپنی ذات کے تعلق سے زندگی کی معنویت کو تلاش کرنے میں جڑے ہوئے ہیں۔ ان شعرا کے تعلق سے اپنی آرا پیش کرتے ہوئے پروفیسر مجید مضمرؔ لکھتے ہیں۔

''1965 تک آتے آتے وطن پرستی اور انقلاب پسندی کا انگارہ
سرد ہوا اور یہاں (ریاست) کے شعرا اس کی راکھ میں کُرید کر اپنی

ذات کے تعلق سے زندگی کی معنویت کو تلاش کرنے لگے۔ اس
وقت تک ملکی سطح پر جدید شاعری کا آغاز ہو چکا تھا اور ایک نیا رجحان
واضح شکل میں سامنے آ چکا تھا۔1965 کے بعد کشمیر کی اردو
شاعری میں بھی اس رجحان کے اثرات مرتسم ہونے لگے اور یہاں
کے شاعروں نے ایک نئے شعری اور فکری مزاج کو اپنانے کی
کوشش کی۔"(7)

تقسیمِ ہند نے ریاست کے شعرا کے سامنے نئے نئے مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ وہ بھی ایک بہت بڑا تاریخی سبب بنا جس کی وجہ سے ریاست کی شاعری کی پرانی عشرت گاہیں منہدم ہوتی گئی۔1960 کے بعد کا دور، اس دور کی بشارت لے کر آتا ہے، کہ جب ایک شاعر کا مرکزِ نگاہ اپنے عروج کو پہنچا تھا۔ اس کا اندازِ بیاں، اس کی تشبیہیں واستعارے اور غور وفکر کا انداز سب کچھ بدل گیا تھا۔ ساتھ ہی فن میں سادگی وسلاست کے علاوہ، خوش اندازی، رنگینی وپُر کاری بھی پیدا ہوئی۔ لیکن ان خصوصیات کو صرف الفاظ کی بازی گری نے پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اس میں ان کے تخیل کی جادوگری کا بڑا دخل ہے۔ ان شعرا نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بات کی ہے۔ زندگی کے ان پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے وہ جذبات کے چشمے ہی نہیں بہا لیتے ہیں، بلکہ ان تمام باتوں کو فکری اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے ان کے خیالات میں محض تہدید یعنی للکار کا آہنگ ہی نہیں بلکہ غور وفکر کے عناصر بھی موجود ہیں۔ ان شعرا نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو فکر وشعور کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے زمانے کی آواز کو اپنی آواز بنا کر پیش کیا۔ اس طرح اپنی ذات کے اظہار کے ساتھ ساتھ زمانے کی کج ادائی، سماجی نابرابری، بے راہ روی وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھنے لگے۔ یہ شعرا شخصی سطح پر شعور اور لاشعور کے عمل اور ردِ عمل کے تحت نایاب اور رواں دواں تجربوں کی تخلیقی بازآفرینی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ساتھ ہی ان کے یہاں صنائع بدائع کی جادوگری کے

بجائے فکر کی گہرائی ملتی ہے۔

ریاستی شعرا کے کلام میں سوز اور درد ہے اور متاعِ درد اس لیے بھی ان کے مقسوم ہو گئی کہ جس بد نصیب خطۂ ارض سے یہ تعلق رکھتے ہیں وہاں کی عوام کئی دہائیوں سے ظلم و جبر کی چکی میں پس رہی ہے۔اس طرح ان کا معاشرہ ایک خستہ مزار کی مانند ہے۔اس معاشرے میں انصاف کی باتیں کرنا فضول ہے۔یہاں کے منصف گھمنڈی ہیں، یہاں ہر وقت محشر سا سما چھایا رہتا ہے، یہاں کا آسماں ہر وقت سیاہ چادر اوڑھے رہتا ہے۔اس شہر کے آسماں کی اُفق ہر شام کو لال ہوتی ہے کیونکہ یہ وہ شہر ہے، جہاں ہر دن کسی نہ کسی بے گناہ کا قتل ہو ہی جاتا ہے۔اب جہاں ایسا سماج ہو وہاں کے ادب میں لب و رخسار کی باتیں کھوجنا فضول ہے۔وہاں مقتل کے قصوں اور دَھار کی باتوں کا ملنا بجا ہے۔کیونکہ ادب ہوتا ہی ہے اپنے سماج کا آئینہ!اپنے اس دعوے کے سلسلے میں چند شعری مثالیں ملاحظہ ہوں۔

نظر میں جو بھی ہے منظر، غُبار جیسا ہے
مرا معاشرہ خستہ مزار جیسا ہے
(عرشؔ صہبائی)

مدتوں سے کوئی محشر سا بپا ہے مجھ میں
میں سمجھ پایا نہیں ہوں کہ یہ کیا ہے مجھ میں
(عرشؔ صہبائی)

یہ کون سی کدورتیں ہیں شہر کی نگاہ میں
ہمارے گھر کے آئینے خراب ہو کے رہ گئے
(شبیبؔ رضوی)

جلتی ہوئی اُجاڑ زمینوں کی کوکھ سے
یادوں کا کوئی پھول کِھلے گا، نہ سوچئے
(مظفؔر ایرج)

اُداس لمحوں میں یہ زندگی سنورتی ہے
نہ گنگناؤ فضا کو اُداس رہنے دو
(عرشؔ صہبائی)

آنکھیں جلنے لگیں اب گھر بھی نہ جل جائے کہیں
خشک منظر کو دریچے سے اُٹھایا جائے
(شبیبؔ رضوی)

اجنبی تنہا اکیلا دن میں تھا
شب کو میں اک بھیڑ میں پھر کھو گیا
(پریمیؔ رومانی)

مفرور کناروں سے وہ سیماب طبیعت
خاموش کسی جھیل میں اب آبِ رواں ہے
(سجادؔ حسین)

زمیں کیوں تنگ ہوتی جا رہی ہے
کریں گے کیا یہاں، جائیں کہاں لوگ
(حسن ساہوؔ)

دریچہ کھول کر کس کو صدا دوں
میں اپنے کرب کو کیسے نوا دوں
(شاہبازؔ راجوری)

جو ستم بھی ہے وہ مخصوص ہے میری خاطر
زندگی! تو ہی بتا ایسا بھی کیا ہے مجھ میں
(عرشؔ صہبائی)

عجیب خار ہیں ہر سمت راہ رستے میں
دُکھوں کی دھول ہے گرد و غبار ایسا بھی
(صابرؔ مرزا)

مذکورہ اشعار ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں، جس میں زندگی ریزہ ریزہ اور کٹی پھٹی ہے۔ اس معاشرے کو کسی ایسے مسیحا کی تلاش ہے جو اس کے زخموں کا مداوا کر سکے اور اس کا تار تار دامن بھی سی سکے۔ ان اشعار کا لہجہ کہیں کہیں غیر تمند اور کھردرا بھی ہے اور یہ عمل ان کے ذاتی تجربوں کا نتیجہ ہے، جس میں مانوس اجنبیت، بیان کا حسن اور زبان کی توانائی شامل ہے۔ ایسے مضامین کے برتاؤ میں ان شعرا نے سلاست اور نغمگی کا خیال رکھا ہے، ٹوٹتے رشتوں کا کرب، ذاتی اور داخلی ہیجان اور ان سے پیدا شدہ اذیتیں ان کی شاعری کو نیا پن بخشتی ہیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے ریاست کی غزل میں اپنے اردگرد کے ماحول کی عکاسی پوری طرح موجود ہے اور جو نئے تقاضوں اور شعور کی ترجمان ہے۔ ایسے مضامین کو وہی انسان جنم دے سکتا ہے۔ جو کربناک حالات سے خود گزرا ہو۔ جس نے مصیبتیں دیکھی اور سہی ہو۔ جس انسان کی زندگی ہر وقت توپوں کے سائے میں رہتی ہوگی، اگر وہ ان چیزوں کو بیان نہ کرے گا، تو کون کرسکتا ہے۔ یہاں مجھے

ریاست کے ہی ایک شاعر عرشؔ صہبائی کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

اُسے پڑا ہی نہیں واسطہ مصائب سے
اِس لئے وہ غموں کا مزاج داں بھی نہیں

یہ شعر اصل میں جرمنی کی ایک مشہور کہاوت کا منظوم ترجمہ ہے۔ کہاوت دیکھئے۔

"One who has not tasted the bitterness of adversity,Does not know where the shoe pinches."

یعنی جس شخص نے مصیبت نہ دیکھی ہو، وہ دوسروں کے درد کو محسوس نہیں کرسکتا ہے۔ ان اشعار میں تنہائی اور اجنبیت کا جو احساس پنہاں ہے، وہ صرف جدید دور کی دین ہے۔ اس طرح ان شعرا نے اپنے دور کے حالات کے ساتھ ساتھ جدید دور کے شعری تقاضوں کو بھی پورا کیا ہے۔ جدید دور کے اس احساس کے تعلق سے قمر رئیس رقمطراز ہیں۔

''تنہائی آج کے انسان کا ذہنی مقدر ہے۔ جس نسبت سے شہروں کی بھیڑ بڑھ رہی ہے، انسان کے ایک حساس ذہن کا احساسِ تنہائی بڑھ رہی ہے، پہلے وہ پُر رونق بازاروں اور پرچھائیوں کی طرح گزرتے ہوئے جلوسوں میں تنہا ہوتا تھا اب وہ گھر میں بھی تنہا ہوتا ہے۔''(8)

اس تنہائی اور اجنبیت کے احساس کو ما بعد جدید دور میں بھی محسوس کیا گیا، لیکن شہریاری (urbanisation) نے اس احساس کو اور بھی گہرا کر دیا ہے۔ جدید غزل موجودہ دور کے انسان کے احساس وادراک سے تعلق رکھتی ہے جو سائنسی، مادی، اخلاقی اور روحانی زوال کے سنگم پر کھڑی ہے۔ اصل

میں شاعری نام ہی ہے اُن تجربات واحساسات کے اظہار کا، جن سے ایک شاعر دوچار ہوتا ہے۔ جدید دور کے انحطاط اور شکست خوردگی کی وجہ سے پیدا ہونے والی تباہی و بربادی کے بہت سے مناظر جدید شعرا کی شاعری میں ملتے ہیں جس سے ان کے کلام میں بڑی تر وتازگی اور خوشگوارسی فضا پیدا ہوئی ہے اور اس سے ان کے شعور کی گہرائی اور فکر کی بلند پروازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ریاست جموں وکشمیر میں بھی جدیدیت اسی احساسِ بے چارگی، غیر یقینیت، تنہائی، بیزاری و بے اعتنائی کے ساتھ داخل ہوئی ہے۔ ریاستی شعرا اپنے تجربات کو خوش اسلوبی سے پیش کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں درد وغم کے ایسے مربوط سلسلے ملتے ہیں کہ قاری کا دل مغموم ہو جاتا ہے۔ نموتناً چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مگر ان آنکھوں میں کس صبح کے اُجالے تھے
ہمارے نام کے سارے حروف کالے تھے
(فاروق مضطرؔ)

بھٹکتا پھر رہا ہوں لے کے سر اپنا میں ہاتھوں میں
درِ مقتل پہ لکھ دے میرے قاتل کا پتہ کوئی
(سید مبشرؔ رفاعی)

صرف جینا ہی نہیں مرنا بھی دشوار کیا
وقت نے یوں ہمیں رُسوا سرِ بازار کیا
(امینؔ بانہالی)

تقدیر کے لکھے پہ گرفتار ہوا ہوں
نا کردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہوں
(بشیر داداؔ)

اس زمین کی پستیاں ہیں معتبر میرے لئے
میرے سر سے کیا پتہ کب آسماں چھن جائے گا
(بشیر دادا)

ایک لمحہ ”میں ہوں میں“ افسردہ دل
ایک لمحہ” میں ہوں میں“ چہرہ فغاں
(اقبال فہیم)

میں زمین کی سرحدوں کا جب نہیں قائل تو پھر
وہ میرے حصے کا کیسے آسماں لے جائے گا
(زاہد مختار)

ہمارا کیا ہے ہم تو ہر گھڑی مرمر کے جیتے ہیں
قفس کے ان پرندوں کا کوئی ماتم نہیں ہوتا
(فاروق آفاقی)

متن میرے رقیبوں کے لئے تحریر کر لیکن
کبھی تو خط کی پیشانی پہ میرا نام لکھ دینا
(بشیر دادا)

جدیدیت میں انفرادیت کا تحفظ ایک اہم چیز تھی، ساتھ ہی ترقی پسندی اور روایت سے انحراف کر کے ایک نئی شعری صورتِ حال کو تشکیل دینا اس کا مقصد تھا۔لیکن ہوا اس کے برعکس، کہ شعرا نے نہایت ہی تیزی کے ساتھ عظمتوں کے ہفت خواں یعنی کارِ دشوار سر کرنے میں ساری قوت صرف کر دی، جس کی وجہ

سے بہت سے شعرا کو انفرادی تخلیقی ہنر مندی کا حوالہ نہ مل سکا۔ چنانچہ انفرادی رجحان، اجتماعی تصور کے حامل ہی رہا۔ ان شعرا کے کلام میں ایک تفکرانہ انداز تو ملتا ہے لیکن ان کے اشعار میں اتنی گہرائی نہیں ہوتی جتنی بظاہر محسوس یا معلوم ہوتی ہے۔ بہت سارے اشعار کو الفاظ بدل بدل کر پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان شعرا کے کلام میں طرز زیادہ اور مواد کم ہے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے بلکہ جدید دور کی غزل پر اگر نظر دوڑائی جائے تو کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ تقلید و تکرار کی بنا پر یکسانیت کی فضا قائم ہوئی ہے۔ جس کی بنیادی وجہ علامتوں کا حد سے زیادہ استعمال ہے۔ اس بنا پر یہ فرق کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے کہ کون سی تخلیق کس شاعر کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ریاست کے شعرا اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان شعرا نے کائنات کبریٰ کے اسرار کی تلاش کائنات صغریٰ کے حوالے سے کی ہے۔ ریاست کی اردو غزل میں ایک خاص علامتی رجحان، قرآن اور اس کے متعلقات کو شعری استعارہ کے طور پر استعمال میں لایا گیا ہے۔ اس مذہبی طرزِ فکر میں نہ ہی بیرونی حالات کو ہمارے اوپر تسلط جمانے کا موقع ملا اور نہ ہی ذات کے بحران میں گم ہونے کا راستہ حاصل ہوا۔ یہ وہ رجحان ہے، جسے اسلامی ادب کی توسیع کی صورت میں ہر زمانے کے شعرا نے استعمال کیا ہے، وہیں ریاست کے شعرا نے بھی اسے تخلیقی صلاحیتوں کے مطابق اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔

ہوئی محشر میں جو محسوس شدت پیاس کی نیّرؔ
کرم فرما جنابِ ساقی کوثر وہاں نکلے
(سید لیاقت نیّرؔ)

میں ایک حرفِ رواں مجھ کو بے زباں تو نہ رکھ
مرے خدا مرے سر پہ یہ آسماں تو نہ رکھ
(مظفر ایرجؔ)

خضر جیسا ہے راہ بر مجھ میں
مجھ کو در پیش ہے سفر مجھ میں
(عبدالغنی جاگل)

اک کربل ہے میرے اندر ایک فرات
ایک یزیدی لشکر بھی ہے اللہ ھو
(خورشید کرمانی)

نہیں جانتا اُس سے مانگو میں کیا
حسینی ہوں بس چشمِ نم چاہئے
(محمد زماں آزردہ)

سُن کے پیہم لن ترانی کی صدا
تیرا آنگن طور سا لگنے لگا
(حسام الدین بیتاب)

مذکورہ بالا اشعار میں موضوعاتی تنوع کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ان اشعار میں جو تنوع پایا جاتا ہے اس کے باوصف ریاستی شعرا کی غزلیہ شاعری کو پڑھ کر جو مجموعی تاثر ہمارے ذہن پر مرتسم ہوتا ہے۔وہ یہی ہے کہ ان شعرا نے اپنے معاشرے میں پائی جانے والی سیاسی منافقت کو موضوع بنایا ہے۔

اس دور کے شعرا اپنی تہذیبی روایات اور قومی تشخص کے مسائل سے بھی نبرد آزما ہیں۔اسی طرح شعور کی بیداری اور تحرک کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا، چنانچہ اس کے موثر اظہارات یہاں کی شاعری میں ملتے ہیں۔ان شعرا کی غزلیہ شاعری میں اس وقت کے سیاسی، سماجی، معاشی اور انسان کے ذاتی حالات و نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔عہد بہ عہد بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی نظریات کے

اثرات کو جتنی آسانی سے غزل اپنے دامِ خیال میں لے لیتی ہے، شاید ہی کسی صنف میں رونما ہونے والے واقعات کے اثرات اتنی تیزی سے رونما ہوتے ہونگے۔اس طرح غزل کا مزاج تہذیبی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ دوسری زبانوں میں غزل کی مطابقت (ajdustment) نہیں ہوسکی کیونکہ غزل کو اپنی تہذیبی قدروں سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔غزل کی تعریف کرتے ہوا لکھا گیا ہے کہ یہ ''سخن با معشوقِ گفتن'' ہے۔غزل کا عاشق بہر حال انسان ہی ہوتا ہے،لیکن معشوق خدا بھی ہوسکتا ہے،نظریہ بھی ہوسکتا ہے،انسان کی اپنی ذات بھی ہوسکتی ہے، اپنا وطن بھی ہوسکتا ہے اور محض احساسِ جمال بھی ہوسکتا ہے۔لیکن ریاست جموں وکشمیر کے شعرا کی شاعری میں وطنیت کا غلبہ زیادہ نظر آتا ہے۔وہ ہر وقت اسی کی ستم ظریفی کا رونا روتے ہیں۔ان کے ہاں اس تبدیلی کا ملنا بجا ہے کیونکہ جدید دور میں عشق کا تصور بالکل ہی بدل چکا تھا۔اس دور میں انسانی زندگی کی تیز روی نے اس جذبے کو بڑی حد تک تبدیل کیا تھا۔جدید دور میں وہ روایتی جذبۂ عشق مفقود ہوتا گیا جس کو لیکر ایک عاشق اپنے معشوق پر جان نچھاور کرتا تھا۔اس دور میں عشق کے آداب بدل گئے۔جدید دور کی شاعری میں ارضیت یعنی زمین سے وابستگی آ گئی ہے۔شمیم حنفی نے جدید دور کے عشقیہ تصور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''اس یعنی ''عشق'' کی حیثیت نئی غزل میں زندگی کے عام لیکن توانا اور مستحکم جذبے کی ہے۔جو تمام مسائل کے ہجوم میں خود کو متحرک رکھتا ہے اور اس کی تصویریں عشق کے مثالی یا سماجی تصور کی روایت سے نہیں اُبھرتی، بلکہ روزمرہ زندگی کے ایک جیتے جاگتے ،خون کی حرارت سے معمور تجربے کی بنیاد پر مرتب ہوتی ہیں۔''(9)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جدید دور میں عشق کا روایتی تصور بالکل ہی بدل چکا ہے۔حسن و عشق کا رجحان جو اس سے پہلے اردو غزل کا غالب ترین رجحان سمجھا جاتا تھا۔اس کی اہمیت جدید دور میں بے

نام ونشان ہوتی گئی بلکہ اس کا درجہ اب وہ نہیں رہا، جتنا کہ کلاسکل دور میں تھا۔عشقیہ مضامین سے اُکتاہٹ کا رجحان ریاست کے کچھ شعرا کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔جن میں خاص طور پر عرشؔ صہبائی، ودیا رتن عاصیؔ، شبیبؔ رضوی اور ہمدمؔ کاشمیری کے نام لیے جاسکتے ہیں۔چند اشعار دیکھیے۔

کبھی بپا تھے یہاں آرزو کے ہنگامے
دلِ شکستہ میں اب یادِ رفتگاں بھی نہیں
(عرشؔ صہبائی)

اُداس لمحوں میں یہ زندگی سنورتی ہے
نہ گنگناؤ فضا کو اُداس رہنے دو
(عرشؔ صہبائی)

مسرت چیز کیا ہے رنج کیا ہے
یہ سارا کھیل اک احساس کا ہے
(ودیا رتن عاصیؔ)

سحر کہاں کہ رنگِ شب بھی آج روٹھنے لگے
جو خواب پہلے دیکھتے تھے خواب ہو کے رہ گئے
(شبیبؔ رضوی)

مذکورہ بالا اشعار میں جذبے کی جو سچائی جھلکتی ہے وہ تصنع آمیز یا روایتی شاعری میں نظر نہیں آتی ہے۔کیونکہ جدید دور میں عشق کے تجربے کو صحیح انسانی تناظر میں دیکھا اور پرکھا گیا ہے۔اس طرح جدید دور میں روایتی عشق و عاشقی کا اظہار ایک نئی آگہی کے ساتھ ہو رہا ہے اور یہ ایک رجحان کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

ریاستی شعرا زندگی کی تلخ حقیقتوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ان شعرا نے سماجی زندگی میں بہت

سی ناکامیوں کا سامنا کیا ہے۔انھوں نے اپنی زندگی میں بہت ساری مصیبتیں دیکھی ہیں،لیکن وہ ان سے ڈریں نہیں بلکہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔مگران حالات کی وجہ سے انھیں کبھی مایوسی بھی ہوتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کی ان کے کلام میں جگہ جگہ استفہامیہ انداز جگہ پا تا گیا۔اصل میں ان شعرانے غزل کی عمومی منطق یعنی دلیل بازی سے انحراف کر کے لسانی اور موضوعاتی دنیا بسانے کی کوشش کی ہے، جو عصری غزل کے تئیں نئے تعارف اور نئے تجربے کا حکم رکھتی ہے۔ان کے لب و لہجے میں گرم جوشی کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کا لگاؤ بھی ملتا ہے۔ان شعرا کے یہاں استفہامیہ انداز کی ایک ایسی صورت ملتی ہے،جس سے ایک طرف وہ اپنی ستم ظریفی کا احساس دلاتے ہیں اور دوسری جانب اس سے ایک قسم کا احتجاج بھی برآمد ہوتا ہے۔یہ انداز نہ صرف ان کے ذہنی تجسس کا نتیجہ ہے بلکہ یہ وہ اشعار ہیں،جن سے استفہامیہ کلمات جیسے۔کون، بتاؤ، کیسے، کیا، کس، وغیرہ سے شعرا کی ان قلبی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے، جسے عام طور پر جذبۂ حزن و یاس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کون دیتا ہے یہ ہر وقت گواہی میری
کون یہ میرا طرف دار ہے میرے اندر
(لیاقتؔ جعفری)

کیوں جگر جگر ہے چھلنی کیوں ہے دن بہ دن اُداسی
کیوں جلیں یہ آشیانے رہے انتشار کب تک
(غضنفر علی شہبازؔ)

اوروں کا بھی حق ہے اس پر غور کریں
ہم ہی اس موضوع پر صابرؔ سوچیں کیوں
(صابرؔ مرزا)

کیوں چراتا ہے نگاہیں بار بار
ہے وفا دشوار تو اقرار کر
(شام طالبؔ)

انکار، پیاس، آگ، لہو، تن دریدگی
کُوفے سے ہو نصیب پلٹنا تو کیا لئے
(سید رضاؔ)

بام پر چاند تھا مگر پھر بھی
چاندنی میں جمال کس کا تھا
(ایاز رسول نازکیؔ)

کس کا ذکرِ خیر چھڑا یہ میرے دل کے کعبے میں
کس کے نور سے لگتے ہیں محراب و منبر آئینہ
(تنویر بھدرواہیؔ)

علامت نگاری یوں تو ہمیشہ غزل کی جان رہی ہے۔ اردو میں علامت کے لغوی معنی ''نشان یا شکل'' کے ہوتے ہیں اور انگریزی میں اس کے لیے SYMBOL کا لفظ مستعمل ہے۔ علامت ہمارے ذہن کو معنی کی کئی جہتوں کی طرف منتقل کرتی ہے اور اس کی خوبی یہی ہے کہ ان میں سے وہ ہر جہت کے لیے موزوں قرار پائے۔ علامت نگاری نے مغرب میں جنم لیا ہے اور آہستہ آہستہ اس نے پورے عالمی ادب کو متاثر کیا۔ انگریزی لغت وبسٹرز نیو انٹرنیشنل ڈکشنری WEBESTER,S NEW INTERNATIONAL DICTIONARY میں علامت کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"SYMBOL IS THAT WHICH STANDS AND SUGGESTS SOMETHING BY REASON OF RELATIONSHIP, ASSOCIATION, CONVENTION OR A VISIBLE SIGN FOR SOMETHING INVIABLE, AS AN IDEA, A QUALITY OR A TOTALITY SUCH AS A STATE OR A CHURCH"

ظاہر ہے کہ شعر کی تخلیق زبان سے ہوتی ہے اور زبان کی خوبصورتی میں علامت کا ایک اہم مقام ہے۔ اردو میں علامت نگاری کے ابتدائی نقوش ہمیں متصوفیانہ شاعری میں نظر آتے ہیں۔ صوفیا کو جب اپنے وقت کے حاکم سے کوئی گلہ یا شکوہ ہوتا تھا تو وہ اس کا اظہار علامتوں کے ذریعے کرتے تھے۔ کیونکہ بادشاہِ وقت کے خلاف کسی کو بھی بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ قدیم شعرا کے یہاں عام طور پر زاہد اور ناصح کی علامتیں ملتی ہیں جو بنیادی طور پر اس دور کے حاوی طبقے کی علامت تھی۔ اس کے بعد ہر دور کے شاعروں نے اپنے علاقے کے حالات و واقعات کی مناسبت سے مختلف علامتیں استعمال کی ہیں۔ مثلاً۔ اقبال کا مردِ مومن، روحانی فلسفیانہ اساس کی علامت ہے۔ اس طرح ہمارے قدیم اردو شعرا کے یہاں اس رنگ میں کچھ نہ کچھ ضرور ملتا ہے۔ مثلاً میر کا یہ شعر دیکھئے۔

تیز رکھیو ہر سرِ خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

اس شعر میں قابلِ دید منظر یہی ہے کہ مناظرِ فطرت کوشعر میں اس طرح لایا گیا ہے کہ ان کا وجود زندگی کے قریب ہوتا چلا گیا ہےاوراس طرح ہرلفظ علامت کی شکل میں اُبھرتا ہے۔

لیکن جدید دور میں علامت نگاری کوجس وسعت اور تابنا کی کے ساتھ استعمال میں لایا گیا، ویسا کسی بھی زمانے یا دور میں نہیں دیکھا گیا۔علامت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس سے عصری زندگی میں پیش آنے والے مختلف حالات و واقعات کی فنکارانہ ترسیل کرنا ہوتا ہے اور کچھ علامتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا تعلق اپنے علاقے کی آب و ہوا، وہاں کی تہذیب، رسم ورواج، سیاسی وسماجی آگہی اور قلمکار کی ذاتی افتاد سے بھی ہوتا ہے، ساتھ ہی یہ علامتیں انھیں فکری جہات پر تشکیل پاتی ہیں۔علامت نہ صرف قاری کے ذہن میں یکساں ردِعمل پیدا کرتی ہے بلکہ یہ مختلف قارئین کے ذہنوں پر مختلف ردِعمل پیدا کرسکتی ہے۔علامت کا بنیادی مقصد واقعات اور زندگی کے مزاج و مذاق کو مختلف انداز میں پیش کرنے کا نام ہے۔ایک انسان کی زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کا تعلق اس کی اپنی خلقت اور محسوسات پر ہے۔علامت کے پردے میں کسی بھی قسم کی ذاتی خوشی یا غم کے جذبے کی عکاسی ہوتی ہے۔

جدید دور نے جہاں ایک ادیب کو آزادی فراہم کی، وہیں اس دور کے شعرا کے پاس کچھ کھل کر بولنے کی اجازت نہیں تھی۔کیونکہ تقسیم ہند کے بعد جو حالات رونما ہورہے تھے،اس کا براہ راست اثر اردو شاعری پر بھی پڑا۔اس طرح شاعری میں ماحول کے عام حالات کا بڑا دخل رہا ہے۔چنانچہ اس صورتحال کے پیشِ نظر شاعروں نے اپنی باتیں اشاروں اور کنایوں میں کہی ہیں اوراس طرح کم کہہ کر بہت کچھ مراد لیا ہے۔ان شعرا نے علامتوں اوراشاروں سے بہت بڑا کام لیا ہے،جس سے ان کے کلام میں بڑی مانوس سی

فضا قائم ہوئی ہے۔انھوں نے ۔گل وبلبل، قفس، آشیانہ، صیاد، گلچیں، شمع، پروانہ، محفل، مجلس، صحرا، جنوں، باغبان، فردوس وغیرہ بہت سی علامتیں استعمال کر کے اپنے شاعرانہ تجربوں کے نشیب وفراز کو واضح کیا ہے۔علامت کے پہلو میں سب سے اہم پہلو جو سامنے آتا ہے وہ یہی ہے کہ ہر لفظ علامت ہوتا ہے۔کسی شعری علامت پرغور کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ علامت کوئی منجمد اور منضبط شےنہیں ہے بلکہ کسی شے یا خیال کی نمائندگی کے لیے کسی چیز کا انتخاب کرنا ہے۔جدید شاعروں کے یہاں کچھ نئی علامتیں، مثلاً۔ سحر، رات، زنجیر، آگ، دھواں، شعلہ، شر روغیرہ بھی نظر آتی ہیں۔جن سے یہ اپنی معنویت اپنے آپ ظاہر کرتی ہے اوراس طرح حسن و جمال کی اقدار بھی رونما ہو جاتی ہے۔ساتھ ہی ان کے افکار وخیالات اپنے اندرایک آہنگ رکھتے ہیں۔ ریاستی شعرانے معاصر حالات کوعلامتی پیرائے میں پیش کرنے کی ایسی کوشش کی ہے کہ اس سے انسان کا داخلی کرب وسعت پا کر لافانی کرب کے حدود کو پار کر لیتا ہے۔ساتھ ہی اس سے غیر یقینی حالات وواقعات کوابہام کے دائرے میں لا کر مختلف مفاہیم سے آراستہ کرنا بھی تھا۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک احساسِ شکست زیست دامن گیر ہے
زرد پتوں پر خزاں کی داستان تحریر ہے
(منشور بانہالی)

کس نے صحرا میں بچھادی ہے یہ کانٹوں کی بساط
چہرۂ دشت پہ یہ نقش و نشاں کیسا ہے
(کاچواَسفندیارخان)

زیب تن کر لیجئے گا خود شناسی کا لباس
ہو اگر تم کو مٹانی زندگی بھر کی یہ پیاس
(پریمی رومانی)

دل شکستوں کو خمِ زُلفِ بُتاں کافی تھا
اور اُلجھائے گئے خاک و خلا میں ہم لوگ
(سید رضا)

کیا رنگ لائے گا وہ سبھی محوِ ہوش ہیں
اس شہر آفتاب میں دشتِ عصا نہ ڈھونڈ
(اقبال فہیم)

نہ وادیاں، نہ گلستاں نہ سر سبز صحرا
عجب اَلاؤ میں صابرؔ یہ عندلیب رہا
(صابر مرزا)

شام تمازت، روپ اُجالا، چاند شراب
کب سب کچھ بن بدلے موسم رکھے گا
(مظفر ایرج)

ان اشعار میں قابلِ دید نظارے یہی ہیں کہ مناظرِ فطرت مثلاً۔ زرد، صحرا، دشت، وادیاں، عندلیب، گلستان، اُجالا، چاند، خلا وغیرہ کو شعر میں اس طرح استعمال کیا گیا ہے کہ ان کا وجود زندگی کے نہایت قریب ہوتا چلا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک قاعدہ بن چکا ہے کہ شاعری میں مظاہرِ فطرت ہی مظاہرِ فطرت کی معنوی تہہ

داری کے آئینہ دار ہیں اور زندگی کی معنوی کیفیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، تو پھر صحیح معنوں میں ہر لفظ علامت ہے۔ان چند شعری نمونوں کے علاوہ نہ جانے ایسی کتنی مثالیں ملیں گی، جن میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو علامت کا جامہ پہنا کر مفاہیم کے دفتر سجائے گئے ہیں ۔ساتھ ہی ان شعرانے سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ زندگی کے وجودی مسائل کو بھی اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے، جو کہ ترقی پسند شعرا کے ہاں ناپید ہے۔ان شعرانے وجودی مسائل کو ذاتی تجربات اور مشاہدات کی انفرادیت کے ساتھ بڑے ہی دلکش انداز میں نظم کیا ہے۔

غیروں کی نکتہ چینیاں کرنے سے پیش تر
اپنے عیوب پر بھی نظر کر لیا کرو
(محمودالحسن محمود)

اب تو اڑنے کی بھی ہمت نہیں رہی
کیا کروں توڑ کے پنجرہ اپنا
(حسن ساہو)

خطا اس میں تیری کوئی نہیں میرا مقدر ہے
کہ پرچھائیں بھی میری مجھ سے اکثر دور چلتی ہے
(مجید عاصمی)

فریضہ رہا آئندہ نسل پر
یہ افسوس ہے ہم نہ مانے گئے
(بلراج بخشی)

ریاست جموں وکشمیر کے شاعروں کی زندگی کے حالات اوران کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا ایک حلقہ سا عکس ان کی غزلوں میں ملتا ہے۔انھوں نے اپنی عمر کشمکشِ زندگی کو جھیلنے اوراس کو خوشگوار بنانے میں گزاری ہے۔یہ اور بات ہے کہ وہ اکثر اس میں ناکام ہی رہے۔زمانے کی ٹھوکروں نے انھیں زندگی کے مختلف چہروں سے آشنا کیا۔لاکھوں انسانوں کی تباہی و بربادی نے ان کے حساس ذہن کو ایک عظیم معاشرتی تغیر اور انسانی غم سے پُر کیا ہے۔لیکن وہ ان ناکامیوں اور نا تمامیوں سے گھبرائے نہیں بلکہ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔غرض جو کچھ ان پر گزری اس کو وہ بیان کرتے چلے گئے۔اس طرح ان اشعار میں سچائی اور خلوص ملتا ہے۔جذبات کی فراوانی اور لاشعور میں گُھل مل کر پیدا ہونے والے لہجے نے ان اشعار کو ایک منفرد رنگ میں رنگ دیا ہے۔

مر کر بھی آرام کہاں
دیواروں پہ لٹکے ہیں
(ودیارتن عاصیؔ)

ہائے ہم اس کا مقدر کیا کہیں
ایک دِل ہے اور غم ہیں بے حساب
(ودیارتن عاصیؔ)

بڑی دیر سے منتظر میں یہاں ہوں
کسے میں کہوں، میں کہاں تھا، کہاں ہوں
(محمد زماں آزردہؔ)

ورق ورق گزشتہ باب ہو کے رہ گئے
سفر میں ہم پڑھی ہوئی کتاب ہو کے رہ گئے
(شیبؔ رضوی)

خبر سے اشتہاروں تک بھیانک موت ہوتی ہے
لہو کے رنگ سے خالی کوئی البم نہیں ہوتا
(فاروق نازکیؔ)

کب، کیسے مسخ ہو گئی کردار کی کتاب
یہ بھید اب کسی پہ کُھلے گا نہ سوچئے
(مظفر ایرجؔ)

ریاستی شعرا نے اپنے تخیل سے تشبیہات، استعارات و اشارات کی ایک نئی دنیا پیدا کی ہے جو کہ رمزیت کی شان کو دوبالا کر دیتی ہے اور جذبے کی بے ساختگی کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی تجربوں کو ایک عام انسان کا تجربہ بنا دیا ہے۔ان کے اشعار میں عشق ایک پاک جذبے اور زندگی کا مقصد بن کر سامنے آتا ہے۔ان کے کلام میں افسردگی اور اضمحلال کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ساتھ ہی ان کے اشعار کو پڑھتے ہوئے ایک ہلکی سی کسک اور دردمندی کا احساس ہوتا ہے۔ان شعرا نے اپنی زندگی کے تجربات کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے، کیونکہ انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو دیکھا اور جھیلا ہے۔ان کے بہت سے اشعار میں ایک اجتمائی رنگ و آہنگ کی لہر پائی جاتی ہے۔ان شعرا کی استعمال کردہ تشبیہات و استعارات میں ایک طرح کی ندرت پائی جاتی ہے۔یہاں پر صرف جمالیاتی استعارہ کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

لے آئیں الفاظ و معانی میٹھی باس
رمز کی خوشبو چشمِ غزالہ دے جائے
(صابرؔ مرزا)

اس شعر میں ''میٹھی باس'' ''رمز کی خوشبو'' اور ''چشمِ غزالہ'' تینوں شعری و جمالیاتی استعارے ہیں اور جمالیاتی معنویت کے مظہر ہیں۔اس کے علاوہ ان شعرا کے ہاں بڑی دلکش تشبیہات ملتی ہیں۔ایک اور مثال ملاحظہ ہوں۔

اپنی آنکھوں میں رکھو برف کی کاشیں محفوظ
کہیں رستے میں دہکتا ہوا منظر ہوگا
(سید رضاؔ)

اس شعر میں شاعر نے ''برف کی کاشیں'' اور ''دہکتا ہوا منظر'' جیسی تراکیب استعمال کر کے کشمیر کے spirit یعنی ''روح'' کو غزل میں سمونے کی کوشش کی ہے اور اپنی جڑوں سے گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔

جدید غزل کی ایک اور انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے موضوعات کے اعتبار سے نئی ہے۔ بلکہ اس میں لفظیات بھی نئے اور انوکھے استعمال کیے گئے ہیں۔اس طرح جدید غزل نے لفظیات کے خزانے کو وسعت دے دی ہے۔اس دور کی شاعری میں اردو کے کچھ ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو آج تک ہمارے شعرا کے لئے ایک مخصوص معنویت کے حامل تھے یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ الفاظ شاعر کے تخیل میں اس تابناکی کے ساتھ نہیں آتے تھے، جس تابناکی اور وسعت کے ساتھ جدید دور میں آنے لگے مثلاً۔ دریچہ، اُجالا، حصار، سمندر، سناٹا، تنہائی، ظلمات، شجر، برگ وغیرہ الفاظ ایک نئی معنویت کے ساتھ استعمال میں لائے گئے ہیں۔ساتھ ہی اس دور میں غیر ملکی زبانوں کے کارآمد الفاظ کا استعمال بھی حسبِ ضرورت کیا گیا ہے، وہ

الفاظ جو اس سے پہلے غزل کے لئے غیر موزوں اور نا مناسب سمجھے جاتے تھے اُن کا خوبصورت اور پُر معنی استعمال جدید غزل میں ہوا ہے۔ یہاں میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جدید دور کے شعرا میں انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال کرنے والے پہلے شاعر بشیر بدؔر ہیں۔ان کا یہ شعر 1960 میں رسالہ ''کتاب''، لکھنو میں شائع ہوا ہے۔

وہ زعفرانی پلوور اسی کا حصہ ہے
کوئی جو دوسرا پہنے تو دوسرا ہی لگے

بہت سارے لوگوں کو اس پر اعتراض بھی ہوا تھا کہ بیجا انگریزی کا لفظ (pullover) لا کر غزل کے مزاج کو مجروح کیا ہے۔حالانکہ اس کے چند ہی برس بعد اردو غزل میں انگریزی کے بے شمار الفاظ استعمال کئے گئے۔اس طرح غزل میں نئی لفظیاتِ شعری کے استعمال کے نتیجے میں بریک، برتھ، بلب، بک اسٹال، ریلوے کراسنگ، کار، اسٹیشن، وغیرہ جیسے لاتعداد الفاظ آئے ہیں اور اس طرح جدید دور نے شاعری میں لفظیات کا ایک انبار بھر دیا ہے۔جدید دور کے وہ شعرا جن کے ہاں یہ تبدیلی نمایاں ہوئی ہے۔اُن میں، ابن انشاؔء، محمد علویؔ، ناصؔر کاظمی، بشیؔر بدر وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جہاں ان شعرا نے نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ کو عصری حسیت کے ساتھ استعمال کیا ہے وہیں ریاستی شعرا نے بھی اردو کے ان عظیم شاعروں کے شعری مزاج اور شعری آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے حسبِ ضرورت انگریزی الفاظ۔البم، کالر، فٹ پاتھ، شوکیس، فیڈر وغیرہ کا استعمال کر کے اپنے احساسات اور تجربات کو نئی زبان فراہم کی ہے۔ریاست کے جن شعرا نے انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔اُن میں ایاز رسول نازکیؔ، مظفر ایرج اور زاہؔد مختار خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے۔

حق تو یہ ہے کہ نہیں ملے اُن سے
پھر یہ کالر پہ بال کس کا تھا
(ایاز رسول نازکیؔ)

فٹ پاتھوں کی دُھول سے نکلے تو ایرجؔ
شو کیسوں کی مانگ میں عالم رکھے گا
(مظفر ایرجؔ)

اُس کو کاٹا، اُس کو مارا، اپنا گھر بھی لوٹ لیا
ہم ہی درندوں نے بچوں کے منہ کا فیڈر لوٹ لیا
(مظفر ایرجؔ)

میں گل کو توڑ کے کالر سجانے کا نہیں قائل
مجھے گلشن میں اکثر تتلیاں آواز دیتی ہیں
(زاہدؔ مختار)

شعر میں ان غیر زبانوں کے الفاظ کے استعمال سے قاری کا ذہن جلد ہی شعر کی طرف مبذول ہوتا ہے۔ یہ کوئی آسمانی الفاظ نہیں ہیں، بلکہ یہ وہی الفاظ ہیں جنہیں ہم روزمرہ زندگی میں بولی جانے والی زبان میں استعمال کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار میں غیر زبانوں کے الفاظ کے استعمال میں یہ راز پنہاں ہے۔ کہ نئی حسیت اپنے قاری کے پختہ ذہن پر زیادہ بھروسہ کرتی ہے۔ سیدھے سادے اندازِ بیاں کے بجائے آڑے ترچھے کچھ کہہ کر نکل جاتی ہے۔ کچھ یہ بھی ہے کہ تجربہ اب اتنا سادہ نہیں رہا کہ دو اور دو چار میں سمٹ جائے، بلکہ فکر اور جذبے کی اتنی سمتیں ہیں، جتنی انسان کے اندر خود اتنی دنیائیں آباد ہیں۔ تجربے کی اس بے انتہائی نے غزل کے روایتی لفظیات کی حد ہی بدل دی ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کا ماحول ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں قدرے مختلف ہے۔ یہاں کے فلک بوس پہاڑ اور برفانی منظروں میں ڈوبی ہوئی فضا، انفرادی شخصیت کو معاشرتی سرگرمیوں سے کسی قدر محدود رکھتی ہے۔ ریاست کی غزلیہ شاعری کا سب سے بڑا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں کچھ ایسے الفاظ آئے ہیں، جن کا تعلق صرف کشمیر کی اپنی آب و ہوا سے ہے۔ یہاں کے شعرا نے اپنے اشعار میں مقامی رنگ سے ادب کا ایک نیا رنگِ سخن پیدا کیا ہے۔ مثلاً، چنار، جھیل، دیودار، عکسِ کوہ، شکارا، برف وغیرہ۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو صرف کشمیر کے گرد و نواح سے وابستہ ہیں۔ یہ الفاظ اپنا اصلی معنی لئے استعمال نہیں ہوئے ہیں بلکہ یہاں کے شعرا نے ان الفاظ کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ''چنار'' کشمیر کی ایسی علامت ہے، جو ریاست کی غزل کے لسانی ماحول پر چھائی ہوئی ہے۔ جس میں پرچھائیں، اُونچائی، حفاظت، فراخی اور غیرت مندی کے معنی پوشیدہ ہیں۔ یہ کشمیریوں کی بردباری کا بھی ضامن ہے اور ان کی رحم دلی کا استعارہ بھی ہے۔ کشمیر کی اردو شاعری میں اس کی بازگشت گونج کی صورت میں سنائی دیتی ہے۔ یہاں کے شعرا ''چنار'' کی جسامت پر اِتراتے بھی ہے اور اس کے زوال پے نالاں بھی ہیں۔ زبان و بیاں کے لحاظ سے ریاستی شعرا کا یہ رویہ بالکل نیا اور قابلِ ستائش ہے۔ اشارتاً چند اشعار دیکھئے۔

دستِ دعا کی طرح کٹے میرے سب چنار
خوابوں کی طرح کون وہ دیودار لے گیا
(نذیر آزاد)

چنار چھاؤں، گلوں کی خوشبو ہے اجنبی سی
چمن کی آ ب و ہوا میں اب کے ہے برہمی سی
(فاروق آفاقی)

مست چناروں کی سر گوشی کون سنے
ہم کشمیر کا درد سمجھنا سیکھیں گے
(اقبال عظیم چودھری)

اب تو یوں لگتا ہے جیسے ہو پرانا سانحہ
جھیل، عکسِ کوہ، ہم تم اور شکارا سوچنا
(شبیب رضوی)

ساتھ ہی ان اشعار میں عکسِ کوہ، جھیل، شکارا، برف وغیرہ جیسے مقامی الفاظ کے استعمال سے جہاں ایک طرح سے کشمیر کے مناظرِ فطرت کا اظہار ہوتا ہے، وہیں دوسری جانب ان اشعار میں یہ بات بھی پوشیدہ ہے، کہ شعرا نے مناظر کی اظہاریت سے اپنی ذہنی ہم آہنگی اور اپنے وطن کی سیاسی غلامی کو موضوع بنایا ہے۔ بس اسی طرح کے خیالات ان کی حب الوطنی کے ضامن ہیں۔جدید دور میں ریاست کے کسی بھی شاعر کے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں کی ہر زبان کا شاعر سیاسی حالات سے متاثر ہوا ہے۔ ہر شاعر نے کم و بیش اسی طرح کے خیالات پیش کیے ہیں اور اسی قسم کے احساس و جذبات کی عکاسی کی ہے، جس سے وطن کے تئیں ان کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ان شعرا نے اپنے وطن کی عظمت کے گیت بھی گائے ہیں اور ساتھ ہی جدید فکر کے تقاضوں کے تحت موضوعات کو کشادہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے غزل کو عصری طرزِ احساس سے ہم آہنگ کرنے کے لیے الفاظ کے ضمن میں ہر طرح کے مناسب اور نا مناسب تجربات سے کام لیا ہے۔ان کے اشعار میں کسی بھی طرح کی مبالغہ آرائی نہیں ملتی، بلکہ ایک ایسی عقیدت اور سنجیدگی ہے جس سے ہر وہ شخص متاثر ہوسکتا ہے جو ان حالات سے واقف ہوں۔

ریاستی شعرا نے اپنے وطن کی سیاسی غلامی کے ظلم و جبر اور اس کے نتیجے میں یہاں کے نوجوانوں کا عین دورِ شباب میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا اظہار بھی کیا ہے۔ پوری دنیا عرضِ کشمیر کی سیاسی غلامی سے

واقف ہے۔ یہ وہ بستی ہے جہاں ہر یعقوب سے اس کا یوسف رخصت ہو چکا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت یعقوب کا بیٹا یوسف ایک دن لوٹ آیا۔لیکن اس بستی میں ہزار ہا یوسف گُم ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی نہیں آتے۔اس سرزمین کا ہر شخص صحرا میں بھٹکے ہوئے اس مسافر کی طرح ہے، جسے دور دور تک کہیں زندگی نظر نہیں آتی ہے۔اس سلسلے میں شہباز راجوروی کا یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

وہی حالات کا صحرا مسافر
یہاں خضر ہی اُترا نہ ہوگا

''خضر'' کے ایک معنی سبز یا ہرا رنگ کے ہیں۔یعنی اس سرزمین میں کبھی بہار نہیں آئی ہے۔''خضر'' کے دوسرے معنی ایک فرشتہ صفت انسان کے ہیں،اس انسان کا گزر صرف صحراؤں سے ہوتا ہے۔جس انسان سے اس کی ملاقات ہوتی ہے،اُسے لمبی عمر عطا کی جاتی ہے۔لیکن شاعر کہتا ہے کہ میرے وطن سے کبھی اس بزرگ کا گزر ہی نہیں ہوا ہے۔ایک اور شاعر خورشید بسمل کا یہ شعر دیکھئے۔جس میں شاعر کی قلبی کیفیت کا اظہار ہوا ہے۔

چاند سورج میرے کوچے میں کبھی آئے نہیں
غالباً اس شہر کی ہیں ساری تعمیریں غلط

ریاست جموں وکشمیر کے شعرا کی زندگی ناکامیوں اور حسرتوں میں گھری ہوئی ہے۔ان کی شاعری میں یہ خاص رنگ ایک جذبے میں ڈھل کر سامنے آتا ہے،لیکن یہ افسردگی اور یہ غم انھیں رجعت پسندی اور قنوطیت کی طرف نہیں لے جاتا ہے، بلکہ اس کے ذریعے سے یہ جینے کا ہنر سیکھتے ہیں۔انھیں اس چیز کا یقین ہے کہ غم کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔جس طرح ہر اندھیری رات کے بعد صبح آجاتی ہے۔ٹھیک اُسی طرح ہر غم کے بعد خوشی آنے والی ہے۔نیچے چند اشعار دیکھئے،جن میں کسی بھی طرح کی مبالغہ آمیزی نہیں ملتی ہے۔بلکہ سچائی اور خلوص کے ساتھ ان مضامین کو برتا گیا ہے۔

اسی یقین پر زندہ ہے خوش گُمانِ وفا
جو سر پہ ہجر کا بادل ہے، چھٹ بھی سکتا ہے
(خالدؔ بشیر احمد)

دل ہم کو داغ داغ ملا پھر بھی ہم جیئے
محرومیوں کا باغ ملا پھر بھی ہم جیئے
(تنویرؔ بھدرواہی)

غم نہ کر دل کے ٹوٹنے کا عرشؔ
حادثے ایسے ہوتے رہتے ہیں
(عرشؔ صہبائی)

اس لئے کھائی نہیں گردشِ دوراں سے شکست
یہ بھی کیا کم ہے کہ جینے کی ادا ہے مجھ میں
(عرشؔ سہبائی)

موت کی کس کو پرواہ ہے
ہم سایوں سے ڈرتے ہیں
(ودیا رتن عاصیؔ)

غم خانۂ حیات پہ تھیں ظلمتیں محیط
بجھتا ہوا چراغ ملا پھر بھی ہم جیئے
(تنویرؔ بھدرواہی)

ہم ایک ذرہ ہی سہی تڑپ تو ہے چمک تو ہے
یہ کیا کہ دن کا ڈھلتا آفتاب ہو کے رہ گئے
(شبیبؔ رضوی)

مذکورہ اشعار کو پڑھ کر جہاں ان شعرا کی زندگی درد وغم کی لہر میں ڈوبتی ہوئی نظر آتی ہے، وہیں ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر کے موضوع پر تخلیق ہونے والی غزلوں میں اُمید اور رجائیت Hopefulness کا رنگ غالب ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مزاحمتی رویے نے تھکاوٹ اور یاسیت کے بجائے لوگوں کے مزاج میں استقلال کی فکری روایت پیدا کر دی ہے، جس نے شعری فکر کے لیے مہمیز کا کام کیا ہے۔اس خطے سے وابستہ شاعر پُر اُمید ہیں کہ جبر واستحصال کی قوتیں بہت جلد اپنے انجام کو پہنچنے والی ہیں۔ یہاں یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ شعرا غم سے زندگی کو گوارہ بنانے کا فن جان گئے ہیں۔ایسا نہیں کہ وہ زندگی سے بالکل ہی مایوس ہو گئے ہیں بلکہ موت ان کے لیے حیاتِ نو بن گئی ہے، زندگی سے انھیں محبت ہے اور وہ اسے جینا چاہتے ہیں۔

جدید غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا، کہ اس میں ترسیل کی کمی ہے۔ساتھ ہی اس نے قاری کو کوئی توجہ نہیں دی۔ جہاں تک ان اعتراضات کا سوال ہے۔ وہاں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جدیدیت کے علمبرداروں نے عام قاری کو نہیں بلکہ نقاد قاری کو اہمیت دی ہے۔ عام قاری سے مراد ہے، کہ جو شاعر یا فنکار کے کسی کارنامے کو پڑھ کر صرف لطف حاصل کریں۔ جبکہ نقاد قاری سے مراد وہ ہے، جو کسی فن پارے کو پڑھتے ہوئے اپنے تخیل سے کام لیکر ابتدا سے نقطۂ تکمیل تک اس فن پارے کا تجزیہ کر کے اس کو سمجھے اور دوسروں کو بھی سمجھا سکے۔لیکن ان تمام اعتراضات سے قطعِ نظر، جموں وکشمیر کے شعرا نے روایت کے گہرے ادراک و احترام کے ساتھ ریاستی حالات وواقعات سے متاثر ہو کر اور پھر ملکی وغیر ملکی سطحوں پر رونما ہونے والے افکار و

واقعات سے گہرا تاثر قبول کیا ہے۔جس سے وہ ایک نئے تناظر میں شخصی،ملکی اور انسانی مسائل کو دیکھنے لگے۔ساتھ ہی ملکی سطح پر موضوعاتی ولسانی طور پر جو نئے ابعاد پیدا ہوئے، یہاں کے شعرا اس سے بھی پوری طرح واقف رہے۔ان شعرا نے اردو غزل کے بدلتے ہوئے رویوں ورجحانات کا نہ صرف ساتھ دیا۔ بلکہ انہیں نکھارنے اور سنوارنے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے یہاں اپنے عہد کی سیاسی تحریک کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ ریاست کا پینسٹھ فیصدی غزلیہ کلام سیاسی فکرواحساسات میں ڈوبا ہوا ہے۔ان شعرا کے ہاں اپنے وطنِ عزیز (کشمیر) کے سیاسی تصور کی جھلکیاں جا بجا ملتی ہیں۔ان کے کلام کو سمجھنے کے لئے ریاست کے حالات کا خاکہ اور اُس نقطۂ نظر کا ہونا ضروری ہے، جس نقطۂ نظر کے تحت یہ شاعری کی گئی ہے۔ میں اپنے اس دعوے کی تائید ریاست کے ہی ایک شاعر بشیر منظؔر کے اس شعر سے کرنا چاہوں گا۔

میری باتوں پہ زمانے کو یقین آئے گا
تجھ کو دیکھے تو سہی میری نظر سے کوئی

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر کی سرزمین صنفِ غزل کی ترقی کے تعلق سے نہایت زرخیز ہے۔اگر ریاست کو بھی کسی طرح کی مرکزیت حاصل ہوئی ہوتی تو اس کی ادبی تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔لیکن اس کے باوجود بھی یہاں کے شعرا نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ قابلِ تحسین ہیں اور اس بات کی ضمانت ہیں کہ ملک کے دوسرے ادبی مراکز کی طرح ریاست کی ادبی تاریخ کسی سے کم نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی کہتا چلوں کہ ریاست کے لوگ جس ناپاک سیاست کا شکار ہوئے ہیں،اس کا براہ راست اثر یہاں کے ادب پر بھی پڑا ہے۔ جسے ریاست کے ہی ایک شاعر بشیر منظؔر کے اس شعر سے سمجھا جا سکتا ہے اور یہ شعر ریاست کی مجموعی شاعری کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔

یہاں شاعر نہیں کرتے لب و رخسار کی باتیں
یہاں مقتل کے قصے ہیں، فقط ہیں دھار کی باتیں

آخر پر میں اس بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ جن شعرا کے نام اب تک لیے گئے ہیں یا جن کے اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی جدید شعرا میں کچھ منفرد نام موجود ہیں، جنہوں نے جدید حسیت اور نئی بصیرت کی روشنی میں استعارات کو نئی معنویت دی یا علامت نگاری، رمزیت، پیکر تراشی کی کاوشیں کیں اور جن کے یہاں فارمولے یا فیشن کے بجائے نئی بصیرت اور نئی حسیت نظر آتی ہے۔ وہ شعرا اپنی قوتِ تخلیق کو 1980 سے پہلے اور اس کے بعد بھی بروئے کار لانے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اُن ناموں کے بغیر ریاست کی غزلیہ تاریخ نامکمل ہوگی۔ اس لیے اُن کا جائزہ اگلے باب میں تفصیل سے لیا جائے گا۔

☆☆☆

﴿حوالے﴾

(1)سنبل نگار، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ۔صفحہ 59

(2)ادب میں جدیدیت کا تصور، ایوان ادب، پٹنہ،صفحہ 147۔146

(3)خلیل الرحمٰن اعظمی، مضمون۔جدیدیت اور ادب۔صفحہ 253

(4)ڈاکٹر مشتاق احمد وانی۔مضمون، جموں وکشمیر میں اردو شاعری 1947 کے بعد،مشمولہ۔ماہنامہ شیرازہ، جلد 52،شمارہ۔7۔6۔صفحہ 186۔ناشر۔جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز۔سرینگر

(5)مصرہ مریم، حامدی کاشمیری، حیات اور شاعری۔صفحہ 87

(6)مجنوں گورکھپوری، کتاب ومضمون۔ادب اور زندگی۔صفحہ 49

(7)کشمیر کی اردو شاعری میں معاصر شعور، از۔حامدی کاشمیری۔مشمولہ، شیرازہ۔نوجوان نمبر۔شمارہ۔11۔1983۔صفحہ 11

(8)قمر رئیس، معاصر اردو غزل۔صفحہ 142

(9)شمیم حنفی، غزل کا نیا منظر نامہ، مضمون۔اردو غزل آزادی کے بعد، 61۔60

باب چہارم

جموں و کشمیر میں اردو غزل کا فنی و فکری

مطالعہ

''1980 تا حال''

اردو ادب میں ترقی پسند دور اور جدیدیت کے بعد جس ادب نے اپنی جگہ بنائی، اسے مابعد جدید ادب سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جسے ان دونوں ادوار کی ملی جلی کیفیات کا مرقع کہا جاتا ہے۔ اس دور میں ایک نئی صورت اُبھر کر سامنے آئی، علامت نگاری اور ترقی پسندی کے رجحانات باہم خلط ملط ہو گئے۔ ذات کی جگہ معاشرے کی اہمیت واضح ہو گئی۔ مابعد جدید دور میں زندگی سے جو رشتہ جدیدیت کی انتہا پسندی سے چھوٹ رہا تھا اس پر دوبارہ گرفت ہوئی۔ اس طرح ترقی پسند شاعری کی اجتماعیت کے ساتھ ساتھ اس میں داخلیت، شخصی واردات اور ذاتیات کو شامل کر کے ایک نئے رجحان کو اپنایا گیا۔

اس دور کی شاعری کے لہجے میں بہت زیادہ تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو اس کو ''نئی'' قرار دیتی ہے۔ دیکھا جائے تو اردو شاعری کے لہجے میں حلاوت، تغزل، روایتی رچاؤ، مخصوص الفاظ، تشبیہات و استعارات کے استعمال سے پیدا ہونے والی فضا ہمیشہ موجود رہی ہے۔ لیکن جدید اور مابعد جدید شاعری ان میں سے بہت سی خصوصیات سے خالی ہے، بلکہ اس کا لہجہ بڑی حد تک درشت، غیر ہموار اور غیر روایتی بھی ہے۔ جیسا کہ پچھلے ابواب میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ ہندوستان کی فکری اور تہذیبی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اُن کی گہری پرچھائیاں ریاست کے شعری مزاج پر بھی پڑتی رہی۔ اسی طرح مابعد جدید دور میں بھی یہاں کے شعرا مختلف حالیہ رجحانات سے بھرپور وابستگی اور واقفیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ریاست میں اس دور کی شاعری کے تعلق سے ڈاکٹر مشتاق احمد وانی لکھتے ہیں۔

> ''ریاست میں شاعری کا تیسرا دور جو 1980 کے بعد ایک نئے ادبی رجحان یا نظریئے جسے مابعد جدیدیت کے نام سے موسوم کیا گیا، کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ اس نئے ادبی رجحان یا نظریئے کا مرکزی نقطۂ نظر سابقہ تحریکوں یعنی ترقی پسندی اور جدیدیت کی مخالفت کرنا نہیں بلکہ اُن کے مثبت پہلوؤں سے استفادہ کر کے

ایک آزادانہ ڈسکورس قائم کرنا، بدلتے ہوئے عالمی منظرنامے میں
نئ صورتِ حال اور نئے رویوں کی پرچھائیوں کی پہچان کرنا
ہے۔"(1)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ 1980 کے بعد عالمی سطح پر اردو شعروادب کی دنیا میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، ریاستی شعرا ان تبدیلیوں سے نہ صرف متاثر ہوتے گئے، بلکہ ان تبدیلیوں کا ساتھ بھی دیا ہے۔ان شعرانے بھی ترقی پسندی اور جدیدیت کے مثبت اقدار کا اپنی شاعری میں ایک ساتھ اظہار کیا ہے، یہ وہ دور تھا، جب ایک انسان زمانے کی ناسازگاری اور بے التفاتی کی وجہ سے زمانے سے بیزار تھا۔اس دور کے شعرانے غزل کے روایتی موضوعات کونئ زندگی بخش دی۔ان شعرا کے یہاں روحانی سہاروں کا فقدان ہے۔اس لیے یہ بے چینی، مایوسی، فریب، شکستگی، عدم معنویت اور تنہائی کے احساسات میں ڈوب گئے ہیں، یہ شعرا ہجوم میں بھی تنہا ہیں، بے چہرگی کے کرب میں مبتلا ہیں، جو دراصل ان کے وجود کا کرب ہے۔وہ اپنے آپ کو تراشنے میں لگے ہیں۔ان رجحانات کو اپنانے کے لئے ان کے پاس اسلوب و اظہار کے بھی نئے طریقے ہیں۔ان شعرانے پرانی اور فرسودہ تشبیہات، استعارات اور علامتوں کا سہارا لینے کے بجائے نئے استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں 1980 کے بعد جن شاعروں نے غزل کی مانگ ستاروں سے بھر دی۔اُن میں حامدیؔ کاشمیری، حکیم منظورؔ، رفیق رازؔ، پرتپال سنگھ بیتابؔ، سلطان الحق شہیدیؔ، ہمدمؔ کاشمیری، فریدؔ پربتی شفقؔ سوپوری اور بلبلؔ کاشمیری وغیرہ کی شعری کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔یہ چند نام اس لحاظ سے اہم ہیں کہ انھوں نے ایک تو اس دور میں اردو غزل کی آبیاری کی ہے، ساتھ ہی یہ شعرا ذہنی عیاشی کے بالکل خلاف ہیں۔ان شعرانے زندگی کے ساتھ ساتھ فن میں بھی اخلاقی قدروں کا پاس ولحاظ رکھا ہے جس کا واضح ثبوت عریانیت سے پاک ان کی شاعری ہے۔انھوں نے روایت سے منہ نہیں موڑا بلکہ روایت سے رشتہ قائم رکھتے

ہوئے حال میں زندگی گزارنے کی کوشش کی ہے،اس طرح ادب میں نمایاں تبدیلی لاتے ہوئے جدید حسیت اور جدید رجحانات کو اپنا کر ادب کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔جب ہم ان کی غزلیہ شاعری پر نظر دوڑاتے ہیں،تو ابتدا میں ان کی غزلوں میں روایتی انداز،عشقیہ اور جمالیاتی انداز نمایاں نظر آتا ہے،لیکن ان کے یہاں جو فکری اسلوب دیکھنے کو ملتا ہے،اس کا اطلاق ریاست کی مجموعی شاعری پر نہیں ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ ریاست جموں وکشمیر دوسرے ادبی مراکز کے مقابلے میں اپنی سیاسی غلامی کے سبب ادبی لحاظ سے دورِانحطاط سے گزر رہی ہے۔کیونکہ یہاں کے لوگوں کو سیاسی انتشار کے سبب چین وسکون کبھی میسر نہیں ہوا اور آج بھی یہاں کا سیاسی نظام لگاتار بدلتا رہتا ہے۔صدیوں کی اس مسلسل غلامی نے یہاں کے باشندوں کی وہ روح فنا کردی ہے جو فنونِ لطیفہ کی پرورش کرتی ہے۔یہاں کی ادبی فضا پر دوسری ریاستوں کے مقابلے میں ایک خاموش افسردگی سی چھائی ہوئی ہے اور تاریخ کی مسلم روایت کے پیشِ نظر آج کشمیر کا وہ سرچشمہ تقریباً خشک ہوتا جارہا ہے۔جس سے ماضیٔ قریب میں ساری علمی دنیا میں بھی گنتی کے چند ادیب اور شعرا مشعلِ ادب کو تھامے ہوئے تھے۔زمانہ کی ناقدری اور سردمہری کے باوجود جو لوگ پچھلی کئی دہائیوں سے اپنی دھن میں مگن آگے بڑھتے جارہے تھے یا آج بھی ہیں۔اس مختصر گروپ میں حامدیؔ کاشمیری ایک مخصوص مقام کے حامل ہیں۔

حامدیؔ کاشمیری:۔

پروفیسر حامدیؔ کاشمیری شعروادب کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ان کا نام اردو دنیا کے بڑے حلقوں میں احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔حامدیؔ کی پیدائش 29رجنوری 1932 کو سرینگر کے ایک مشہور علاقہ ''بہوری کدل'' میں ہوئی۔ان کا اصل نام حبیب اللہ بٹ تھا۔لیکن ادبی حلقوں میں حامدیؔ کاشمیری کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔حامدیؔ ایک بہت بڑے نقاد، نثار، شاعر و ادیب تھے۔ان کے مضامین خواہ

تنقیدی ہوں یا تحقیقی، ہندو پاک کے معتبر رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہیں۔حامدؔی کا ادبی سرمایہ پچاس سے زائد کتابوں پر مشتمل ہے۔انھوں نے جن اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے وہاں ان کی جدتِ بیان اور موزونیِ طبع بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔تحقیق،تنقیداور دوسری اصنافِ سخن میں انھوں نے نئی راہوں کی کھوج کی ہے۔حامدؔی اولاً ایک نقاد تھے اور ایک تنقید نگار ہونے کی بنا پر جتنی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی اُتنی شاعر کی وجہ سے نہیں ہوئی۔لیکن ایک شاعر ہونے کے اعتبار سے بھی ان کی حیثیت اتنی مسلم ہے کہ آپ کا پایہ اپنے ہمعصر شعرا کے مقابلے میں بہت بلند ہے۔

حامدؔی کاشمیری کا ادبی سفر 1949 سے لیکر 2016 تک مسلسل جاری رہا اور 67 سالہ کے اس ادبی سفر میں ان کے کئی شعری مجموعے۔عروسِ تمنا، نایافت، لاحرف، شاخِ زعفران، وادیٔ امکان، خوابِ رواں اور شہرِ گمان کے علاوہ تنقید پر 27 کتابیں اور فکشن پر 8 کتابیں منظر عام پر آئیں، جو اہلِ ادب سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ویسے تو حامدؔی کا تمام تر ادبی سرمایہ قابل تحسین ہے۔لیکن تنقید پر لکھی گئی ان کی کتاب ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' اردو ادب میں ایک نئے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔کیونکہ اس کتاب سے اردو ادب میں ایک نئے تنقیدی دبستان کی بنیاد پڑتی ہے۔جسے ''اکتشافی تنقید'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔یہاں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اردو ادب کی آٹھ سو سالہ تاریخ میں یہ نظریہ نئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔اس طرح ایک عہد ساز نقاد ہونے کی حیثیت سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔لیکن حامدؔی کاشمیری خود کو نقاد کہلانے کے بجائے شاعر کہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔اس تعلق سے حامدؔی کی شریکِ حیات مصرہ مریم لکھتی ہے۔

''حامدؔی کا خیال ہے کہ ان کی دو specializations ہیں،
شاعری اور تنقید۔ان دونوں میں وہ شاعری کو اولیت کا درجہ دیتے
ہیں۔لیکن زمانے نے ان کی ناقدانہ حیثیت ہی کو ترجیحی طور پر توجہ
کا مرکز بنا دیا ہے، میرا تاثر یہ ہے کہ وہ جتنے بڑے نقاد ہیں، اتنے

ہی بڑے شاعر بھی ہیں۔''(2)

حامدؔی کاشمیری چونکہ ایک تنقید نگار تھے۔اس لئے انھوں نے اپنے شعری سرمائے کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا ہے۔قدیم شعرا سے بھی اکتسابِ فیض حاصل کیا ہے لیکن ان کا اپنا ایک انفرادی رنگ اور اندازِ بیاں بھی ہے۔ان کے اس مخصوص انداز پر روشنی ڈالتے ہوئے بلراج کومل لکھتے ہیں۔

''غزل کا روایتی مقبول طرز اظہار کا مطالبہ کرتا ہے کہ شعر کو تذکیرو تانیث کے جبر سے آزاد کر دیا جائے تاکہ ایمائیت اپنا پورا جلوہ دکھا سکے۔لیکن حامدی کاشمیری کا مسلہ چونکہ تجسیم کاری کا ہے اس لیے وہ معنیاتی پیکروں کو انسانی صورت حال کے بنیادی تقاضوں کے ساتھ منسلک کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نقطۂ آغاز ہے یا نقطۂ انجام؟ اس سوال کا فیصلہ کُن جواب پیش کرنا مشکل ہے،لیکن حامدی کاشمیری کا پورا منظر نامہ فسوں کار وپُر کار ہے۔''(3)

مذکورہ اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ حامدؔی کاشمیری کی فکری تہوں کی دبازت کیا ہے۔حامدؔی نے 1949 سے باقاعدہ طور پر شاعری کرنی شروع کی ہے۔وہ پہلے ریاست کے ایک شاعر منشی محمد صادق کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔اس کے بعد کشمیری زبان کے مشہور مزاحیہ شاعر مکھنؔ لال محو سے ملاقات ہوئی۔حامدؔی کی شعر فہمی کو دیکھ کر مکھنؔ لال نے انھیں شہ زورؔ کاشمیری کے پاس بھیج کر چند غزلیں شہ زورؔ کی خدمت میں پیش کرنے کو کہا۔شہ زورؔ نے ان کی اصلاح کی اور ان کی درخواست قبول کرنے سے پہلے چند اشعار لکھنے کو کہا۔بقولِ مصرہ مریم،شہ زورؔ کاشمیری کی فرمائش پر لکھا ہوا حامدؔی کا پہلا شعری مصرعہ یہ ہے۔جسے شہؔ زور کاشمیری نے بہت پسند کیا تھا اور اس طرح باقاعدگی سے حلقۂ تلامذہ میں شامل کرلیا۔

نا خدا کیا، اے کہ امیدِ خدا رکھتا ہوں میں(4)

اس شعری مصرعے کے معانی کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یعنی وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق شاعر کا اصل رویہ کیا ہے۔ اگر اس رویے کو کسی ایک لفظ سے تعبیر کیا جائے تو وہ شاعر کی استعمال کردہ ترکیب ''اُمیدِ خدا'' ہے۔ جو بجائے خود بلیغ اور فکر انگیز ہے۔ اس میں ایک قسم کا قولِ محال ہے، خدا کے ساتھ لفظ ''اُمید'' کو وابستہ کر دیا گیا ہے۔ جو خدا اور بندے کے درمیان ایک راز ہے۔

حامدؔی کاشمیری کی پہلی شائع شدہ غزل سرینگر سے نکلنے والے ہفت روزہ اخبار ''وکیل'' 1949 میں چھپی تھی۔ جس کا ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

جو رہرو آشنائے جذب کامل ہو نہیں سکتے
کبھی وہ فائز دامان منزل ہو نہیں سکتے

حامدؔی کو زندگی کے اوائل ہی میں شہرت حاصل ہوئی تھی۔ لیکن ان کا نام اس وقت ریاست سے باہر پہنچا جب اُن کی ایک غزل اردو ادب کے مشہور رسالہ ''شاعر'' کے مشاعرہ نمبر 1950 میں شائع ہوئی۔ جس کا پہلا شعر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

خبر نہیں کہ گلشنِ زندگی میں افسردگی ملے گی
نہال آشفتہ سر ملیں گے فسردہ ہر اک کلی ملے گی

یہ غزل ان کے پہلے شعری مجموعہ ''عروسِ تمنا'' میں شامل ہے۔ یہ اس دور میں لکھی گئی غزل ہے، جب تقسیمِ ہند کو کُل تین سال ہوئے تھے۔ ابھی زمانے نے اپنے تیور نہیں دکھائے تھے۔ اس شعر کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے مستقبل کے حالات کی پیشن گوئی پہلے ہی کی تھی۔

حامدؔی کا کلام اپنے زمانے کے گلدستوں میں بکثرت چھپتا تھا۔ اپنی شعری بصیرت کے سبب جلد ہی معروف ادیبوں کی صف میں شامل ہو کر ملک کے مختلف گوشوں میں منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں شرکت

کرنے لگے۔حامدیؔ اردو کے اُن خوش نصیب ادبا میں سے ہیں جن کی زندگی میں ہی اُن پر تحقیقی مقالے لکھے گئے۔لوگوں کی نظریں حامدیؔ کاشمیری کی شاعری پر پڑنے لگی اوران پر مختلف رسالوں میں تحقیقی مضامین چھپنے لگے۔کچھ رسالوں نے تو ان پر نمبر شائع کیے ہیں۔''شاعر'' کا ''حامدی نمبر''1987 اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔حامدیؔ کو ابتدا میں اردو نثر سے زیادہ لگاؤ تھا۔لیکن 1960 میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ افسانے اور ناول کے بجائے شاعری پر زیادہ توجہ مرکوز کرے۔اس تعلق سے خود فرماتے ہیں۔

> ''1960 کے بعد میری تخلیقی سرگرمیوں میں ایک اہم موڑ یہ آیا کہ میں فکشن سے قطعی طور پر دست بردار ہو گیا اور ہمہ وقت شاعری کا ہو کے رہ گیا۔اس تبدیلی کے چند اسباب ہیں۔اول،خارج سے لا تعلق ہو کر باطن دوستی کے نتیجے میں میں منصوبہ بند موضوعیت سے کنارہ کش ہو گیا اور افسانہ نگاری کے لئے بے مصرف ہو گیا۔ دوسرے اپنے باطنی سفر میں، میں جن نازک، بے چہرہ،متضاد اور گریزاں تجربوں سے متصادم ہوا ان کی لسانی تجسیم کے لئے شعر کی خود مرتکز علامتی اور کفایتی صنف ہی موزوں بلکہ نا گزیر تھی۔تیسرے لاشعوری محرکات کے ادراک نے فکشن کے بجائے شعر سے نسبت ذہنی کو استحکام عطا کیا۔''(5)

یعنی حامدیؔ شاعری کو ایک فطری جذبے کی تسکین کا ذریعہ سمجھتے تھے۔جیسا کا اوپر ذکر آ چکا ہے کہ حامدیؔ کاشمیری نے 1949 سے شعر کہنا شروع کیا تھا اور ملک کے مختلف رسالوں میں ان کی غزلیں شائع بھی ہونے لگی تھیں۔لیکن 1960 کے بعد انھوں نے شاعری تواتر کے ساتھ کرنی شروع کی ہے،جس کا بڑا ثبوت ان کا پہلا شعری مجموعہ''عروسِ تمنا''1961 ہے۔اس میں تقسیم ہند سے لیکر 1961 تک لکھی گئی نظمیں،

غزلیں اور قطعات شامل ہیں۔اس مجموعے میں شامل بیشتر غزلوں میں روایتی رنگ پایا جاتا ہے۔جن میں حسن وعشق کا والہانہ پن،غمِ دوراں کے مسائل اور مناظر فطرت کی نزاکتوں کے علاوہ روایت کے اثرات سے نجات پا چکی جدوجہد براہ راست دیکھی جاسکتی ہے۔ساتھ ہی احساس کی نزاکت کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔حامدؔی نے ابتدا میں قدیم وجدید کے امتزاجی اسلوب کو اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔جس کا ثبوت اس مجموعے میں شامل بہت سی غزلوں کو پڑھ کر ہوتا ہے۔چند اشعار دیکھئے ؎

یقین نہ آئیں تو خود پوچھ ماہ و انجم سے
مری نظر کو ترا انتظار آج بھی ہے

جانے کس کے لیے ہوں چشم براہ
یوں تو تیرا بھی انتظار نہیں

زبان پہ حامدی دردِ جگر کی بات آتی ہے
زمانہ والوں کو یہ شاعری معلوم ہوتی ہے

اُن کا حسنِ آرزو تھا یا بہاروں کا طلسم
پھول کھلتے ہی رہے وہ یاد آتے ہی رہے

مذکورہ اشعار میں ایک ایسا شاعر چھپا ہوا ہے۔جس کا سیماب وش مزاج ہر لفظ سے چھلک رہا ہے۔وہ بے قرار دل جو سینے میں ہے،کیا کیا رنگ دکھاتا ہے،کیا کیا پیرایۂ اظہار پیش کرتا ہے،کس کس طرح

وہ شاعر کو فریب دیتا ہے اور شاعر دل کے ہاتھوں مجبور، جان کر بھی یہ فریب برداشت کرتا ہے۔ کیونکہ بقول مومن خان مومنؔ۔

دشنام دوست طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

حامدیؔ کاشمیری کی غزل سراپا محبت ہے لیکن جہاں عصری حسیت کی آتش سیال ان کی رگوں میں رواں ہوئی ہے وہاں وہ ایک انقلابی شاعر کے روپ میں نظر آتے ہیں۔لیکن انہوں نے انقلاب کو بھی جمالیات کے حوالے سے دیکھا ہے اور ان کا یہ انداز نرالا اور خوبصورت ہے۔ان کی ابتدائی دور کی غزلوں میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں، جو عشقیہ شاعری کے لیے مخصوص ہیں۔لیکن اس کے باوجود ان کی غزلوں میں لہجے کی سادگی اور سادہ پیرایۂ بیان سے ایک خاص قسم کی معنویت پیدا ہوئی ہے۔اس دور کی شاعری میں بعض ایسے اشعار ملتے ہیں، جو فنی رچاؤ کی زندہ مثالیں ہیں اور شعر کے بلند معیار کا پتہ دیتے ہیں۔ حامدیؔ کو اس دور میں بھی فن پر اپنی پکڑ کا احساس ہے۔اسی لئے کہتے ہیں۔

ڈھل گئے جب خیال لفظوں میں
بجلیاں ہم گرفت میں لائے

حامدیؔ کاشمیری کی غزلوں کا ایک اہم پہلو رجائیت ہے جس نے حالات کی تبدیلیوں اور زمانے کے نشیب وفراز کے باوجود کبھی انھیں مایوسی عطا نہیں کی۔ان کے پہلے شعری مجموعہ ’عروسِ تمنا‘‘ میں شامل شاعری مخالف حالات کے باوجود انسان کے یقین اور قوت کی شاعری ہے۔اس تعلق سے یہ شعر دیکھئے۔

ڈروں کیا تجھ سے میں اے جادۂ شب
نظر میری تیرے انجام تک ہے

''عروسِ تمنا'' کی اشاعت کے بعد حامدؔی کی شعری فکر نے مسلسل عہد بہ عہد ارتقائی منازل طے کی ہیں۔ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''نایافت'' کے عنوان سے چھپا ہے۔اس میں پہلے مجموعے ''عروسِ تمنا'' کے مقابلے میں بڑی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔اس میں نئے تجربات اور نئے محسوسات کے علاوہ ایک مخصوص فکری رجحان بھی پایا جاتا ہے۔یہاں شاعر کے عہد کی زندگی سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے، یہاں سے شاعر کا دوسرا دور متعین ہوتا ہے۔اس دور میں غزل کا ایک نیا آہنگ اور غزل کے علامتی اظہار کے بارے میں ایک نیا رویہ سامنے آیا ہے، جو دراصل مروجہ اسالیبِ بیان اور روایتی علائم و رموز سے اجتناب بلکہ انحراف کا رویہ ہے۔اس دور میں حامدؔی موضوع کو اچھی طرح برتنے کا فن صحیح معنوں میں جان گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے نئے امکانات کی تلاش اور پیکر کی علامتی توسیع پسندی بھی صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ذیل میں چند اشعار ہیں جن سے حامدؔی کی ذہن کی تیزی کا پتہ چلتا ہے۔ان میں احساس کی نزاکت کے ساتھ ساتھ فنی باریکیوں کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔

اک اضطراب سا شب بھر تھا ان پہ کیوں طاری
یہ پوچھ لیتا کوئی ڈوبتے ستاروں سے

تو کھو نہ جائے کہیں تھک کے منزلِ شب
تیری تلاش میں خود ہی سحر نکل آئی

مرے خونِ تمنا ہی سے رنگِ دو جہاں بدلا
جو میرا نالۂ دل مستجاب ہوتا تو کیا ہوتا

حامدیؔ کا ادبی شباب ایک ایسے دور میں پروان چڑھا تھا، جس کے تقاضے ہر حساس انسان کو اس چیز کے لیے مجبور کرتے تھے کہ وہ اپنی طرف بھی دیکھے اور اپنے سماج کی طرف بھی۔اس دور میں حامدیؔ ذہنی حیثیت سے ایک تباہ کُن رومانی انفرادیت کے غار کے سامنے کھڑے ہونے کے باوجود ہمیشہ اس میں گرنے سے بچتے رہے۔اُن کا ذہن اپنے سماجی تبدیلیوں کو صحیح طور پر سمجھنے لگا اور بیرونی ماحول میں جب ان کے سوالوں کا جواب نہ مل سکا تو اُن کا تجسس اپنے باطن کی جانب راغب ہوا۔''نایافت'' کی شاعری میں حامدیؔ جذبات اور تکنیک کے تیز دھارے نئی اور تُند لہریں اختیار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اس مجموعے میں شاعر نے مضامین کی ادائیگی میں ایسے رنگ بھر دیئے ہیں اور ایسے جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہے جو بالکل مختلف اور جدید عبوری دور سے تعلق رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔اپنے زمانے کی مختلف تحریکات کی ترجمانی ہی حامدیؔ کے کلام کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت ہے۔انھوں نے شاعری کو محض فیشن پرستی کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ اپنے زمانے کے عصری مسائل وتقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھتے رہے۔وہ جہاں اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشی واقتصادی حالات کا سامنا کرتے ہیں، وہیں وہ زندگی کی اصلیت اور اس کے ختم ہونے کا حال بھی بیان کرتے ہیں۔یہاں ان کی غزلوں سے چند اشعار پیش کرتا ہوں، جن میں مضمون آفرینی اور تخیل سے زیادہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سب کو آشفتہ کار ہونا ہی تھا
دشت کو بے کنار ہونا ہی تھا

زندگی کا شعور کرنے کو
موت سے ہمکنار ہونا تھا

دشت کی دھوپ سے پگھلتے رہے
اَ بر کو سایہ دار ہونا تھا

حامدؔی کاشمیری ہر بار اپنی فنی چابکدستی کا ثبوت دیتے آئے ہیں۔ان کے یہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں کم سے کم الفاظ میں فکرو احساسات کی پھیلی ہوئی دنیا کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان اشعار میں اُبھرنے والی کیفیت ربط ونظم کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ جہاں خیالات جذبے میں تحلیل ہو تے ہیں۔بطورِخاص چھوٹی چھوٹی بحروں کی غزلوں میں ان کے فنی ذہن کی تیزی اور جذبہ واحساس کی تہہ داری کا پتہ چلتا ہے۔

دیکھ گلشن میں ہے بھیانک آگ
کیا میری آہ شعلہ بار نہیں

ستاروں، اے غمِ دل کے شرارو
سحر کو دور تک جا کر پکارو

مذکورہ اشعار میں جو باتیں کہیں گئی ہیں وہ اگر چہ ہمہ گیراور عام فہم معلوم ہوتی ہیں۔لیکن اصل میں یہ عامیانہ نہیں ہوتی بلکہ شاعر کی زبان میں ایک پُر کیف سادگی ہوتی ہے۔

حامدؔی کاشمیری کے کلام میں گہرائی بھی ہےاور گیرائی بھی۔ان کی غزلیں بڑی تہہ دار، رواں اور پُر لطف ہوتی ہیں۔انھوں نے اپنے شاعرانہ اظہار کے لیے علامتی اسلوب استعمال کیا ہےاور اپنے لاشعور کی الجھنوں کوشعری پیکر عطا کیا ہے۔ان کی غزلوں میں مصرعوں کی ہم آہنگی، زبان و بیان کا مترنم لہجہ اور کیف و سرور کے ساتھ غم کی دھیمی دھیمی چبھن بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔وہ شعر میں پیکریت کے قائل ہیں اور زیادہ

سے زیادہ پیکروں کی علامتی اہمیت پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ جیسا کہ اُن کے یہاں وادی، سنگ، چراغ، کمرہ، سمندر، دیوار، طوفان، سورج، چاند، پیڑ وغیرہ بنیادی علامتیں ہیں۔ اس طرح انھوں نے نئی حسیت کی علامتی پیکر تراشی پر ساری توجہ مرکوز کی ہے۔

آگ سے سایوں میں کالے شبد دہرائے گئے
چاندنی کے جسم تھے سانپوں سے ڈسوائے گئے

سکوتِ گرد میں دیوار و در سوالی تھے
وہ لوگ کیا ہوئے شہروں کے شہر خالی تھے

نادیدہ ساحلوں کے چراغوں کو گُل کرو
ہم کالے پانیوں میں گرفتار ہو گئے

ان اشعار میں حامدیؔ نے اپنی مراجعت کی ذہنیت کو ظاہر کیا ہے۔ حامدیؔ کاشمیری نے شخصی سطح پر شعور اور لاشعور کے عمل اور ردِعمل کے تحت نایاب اور رواں دواں تجربوں کی تخلیقی باز آفرینی کی ہے۔ جس کا اندازہ ان کے دوسرے شعری مجموعہ'' نایافت'' اور اس کے بعد کی شائع شدہ غزلوں کو پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ یہاں سے حامدیؔ کی فکر میں پختگی آ گئی ہے اور اسلوب زیادہ معتبر ہو گیا ہے۔ زندگی کے تجربے قیمتی ہو گئے ہیں۔ حامدیؔ کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے واقعات کے علاوہ اپنی ذات اور ذات کے شاریا بحران کا احساس ہے۔ جدید دور کی تباہ کاریوں اور تہذیبی شکست وریخت نے ایک فن کار کو اپنا نقطۂ نظر بدلنے پر مجبور کر دیا ہے اور اس طرح شاعر خارجی دنیا کی عکاسی کرنے کے بجائے اپنی ذات کی بھول بھلیوں

میں کھو گیا ہے۔حامدؔی کا فن موجودہ ہنگامی دور میں ذات کے خرابوں کا سفر بھی ہےاور اجتماعی سطح پر اس دور کی تمام تر پیچیدگیوں کا غماز بھی۔میکانکی تہذیب کی اندھی یلغار کے نتیجے میں فرد کی اجنبیت،خوف، بے چہرگی اور ذہنی گھٹن کی تخلیقی بازآفرینی کے عمدہ نمونے ان کے یہاں ملتے ہیں۔

جاگتے نہیں بھولے بھٹکے خواب
دشتِ ظلمت میں روشنی کے سراب

شبنم سے منہ دھوئے تھے
موسم ہی مٹیالے تھے

حامدؔی کی شاعرانہ شخصیت حساس اور مفکرانہ ہے۔ان کی شاعری میں موجودہ دور کی الم پذیری کا اظہار ایک مختلف زاویے سے ہوا ہے۔حامدؔی کے یہاں غزل کا لسانی نظام بے حد منفرد ہے۔وہ الفاظ کی معنوی ابعاد سے واقف ہے اور فنی اعتبار سے ان کے ہاں تازگی اور جمالیاتی سادگی کا احساس ہوتا ہے۔ان کے کلام سے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کر گئے دفن کالے سایوں میں
تنگ گلیوں کے زرد بوڑھے مکاں

وہ کالے ہاتھ ہوا میں دکھائی دیتے ہیں
جو راز سینے میں ہے، جا کے چوک میں کہہ دوں

شہر کی سڑکوں پہ یہ گھومتے کالے جنگل
گھیر لیں مجھ کو بہر سمت تو پھر کیا ہوگا

یک بیک چیخ اُٹھے چار دشاؤں کا سکوت
زرد دن میں بھی ایسا ہو تو پھر کیا ہوگا

میری جانب سیاہ ہاتھ بڑھے
سائے پتوں کے ہو رہے تھے دراز

مذکورہ اشعار میں دو الفاظ ''سیاہ'' یعنی ''کالا'' اور ''زرد'' یعنی ''پیلا'' کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ جہاں ''سیاہ'' ہولناکی کی صفت ہے اور ''زرد'' دل شکستگی کی علامت ہے۔ اس دور کے مزاج کو رنگوں کے تعلق سے پیش کرنے میں حامدی نے اچھی کوشش کی ہے۔

حامدی کو جدید علوم وافکار کی آسیب زدگی کا بھی احساس ہے کہ کس طرح اس نے معاشرے کے نظام کو منتشر کر دیا اور انسان کو لاعلمی کے صحرا میں خود آگہی کا کرب برداشت کرنے پر مجبور کر دیا۔

ہر ایک شخص کی آنکھوں سے روشنی لے لی
بڑا کریم تھا سورج یہ کام کر کے گیا

اب شاعر خارجی دباؤ سے افسردہ ہو کر اپنی ذات کی طرف بازگشت کر کے اپنے آبائی اور ماقبل تاریخ کے جنگلی انسان History of Nudity سے اپنے تعلق کی تجدید کرتا ہے۔

وہ لوگ مجھ سے گلے مل کے دیر تک روئے
بدن پہ بال تھے ان کے کوئی لباس نہ تھا

تھے وہ درماندہ شب جاگ کے بھر سوتے تھے
شہرِ ظلمات ہے کب اس میں سویرا ہوگا

موجودہ دور کا انسان خود کو غیر محفوظ تصور کرتا ہے۔اس کے اندر جو ڈر اور خوف ہے، اس کا اظہار وہ اپنے کلام میں کرتا رہتا ہے۔حامدؔی کے یہاں بھی اس طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔لیکن وہ ان موضوعات کو اس طرح باندھتے ہیں کہ یہ تازہ دم ہو جاتے ہیں۔اس تعلق سے ان کے تیسرے شعری مجموعے ''لاحرف'' کا یہ شعر دیکھئے۔

روکو نہ میرا راستہ سر سبز جنگلو
میں دست و پا شکستہ ہوں، پیچھے غنیم ہے

خوف اور دہشت نے تمام احساسات کو گھیر لیا ہے۔زندگی غیر محفوظ ہے۔اسے بچانے کے لیے اجنبی راستوں کی طرف دوڑنا پڑتا ہے۔لیکن کیا غنیم یعنی دشمن پیچھے سے ہی وار کرے گا، کیا وہ آگے سے حملہ نہیں کر سکتا ہے۔کیا اس شعر میں سیاسی حالات پوشیدہ نہیں ہو سکتے ہیں۔حامدؔی کو معلوم ہے کہ عصری حسیت کا منظوم اظہار شاعری نہیں ہے، بلکہ ان کی شاعری میں حیرت (astonishment) ڈر اور اندیشہ کے جو نظارے ملتے ہیں، ان کی حیثیت خالص تخلیقی ہے اور انسان کے اندر کی بے چینی کی پیدا کردہ ہے۔یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

آج انھیں پہلی بار دیکھا ہے
کون ہیں یہ بھلا کہاں کے ہیں

سایہ سایہ ہے اژدھا صورت
کیا یہ آثار اسی جہاں کے ہیں

یہ وقوعے تو آسماں کے ہیں
سانحے اور جسم و جاں کے ہیں

ایک اچھے شاعر کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے وسیع مطالعے کی بنیاد پر علم کی بے پایاں وسعتوں کا مالک ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے ماضی اور حال سے جُڑا ہوا رہتا ہے بلکہ اس کے سامنے فکر و فن کی ایک بے پایاں دنیا آباد ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے یہاں مستقبل بھی تصور بن کے ماضی اور حال کی طرح اشہبِ فکر کو مہمیز کرتا رہتا ہے اور اس طرح ماضی اور حال کے علم و آگہی کی روشنی میں مستقبل کی تصویر کشی کرتا ہے۔ حامدؔی کے یہاں بھی بعض ایسے تجربات ملتے ہیں جنہیں شاعر کی اپنی مٹی سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔ مثلاً

بلڈنگیں، شوکیس، ننگی عورتیں، وحشی ہجوم
خوب سو لیتے تھے ہم بھی یہ نگر ایسا نہ تھا

نکل پڑی ہیں تعاقب میں ہانپتی سڑکیں
کہیں یہاں سے اک آدھ بات ہو تو چلیں

پہلے شعر میں استعمال شدہ الفاظ بلڈنگیں، شوکیس، ننگی عورتیں اور وحشی ہجوم کو پڑھ کر اگر ہم شاعر کے سماج پر نظر دوڑائے تو وہاں ہمیں ایسی چیزیں نظر نہیں آئیں گی۔ اس شعر میں شاعر ذاتی سطح سے اُوپر اٹھ کر ایک ایسی آفاقیت پیدا کرتا ہے، جس کا تصور ایک عام ذہن رکھنے والا انسان نہیں کرسکتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ حامدؔی نے خود شناسی سے دنیا شناسی تک کا سفر طے کیا ہے۔ دوسرے شعر میں سڑک کا علامیہ مصروفیت اور کثرت کار کو ظاہر کرتا ہے۔ اب امکان ہے کہ شاعر نے مستقبل کے حالات کے لیے ان چیزوں کو پہلے سے محسوس کیا ہو جس طرح مندرجہ ذیل شعر میں صنعتی نظام کی تیز رفتاری اور نئے دور کے تردد کو اپنی

بستی میں سونگھنے کی کوشش کی ہے۔

مکان چھوڑو تہہ خانوں میں چھپو جا کر
فضا میں برق کوئی بے قرار ہے لوگو

جدید دور کی طرح مابعد جدید دور میں علامت نگاری ایک خاص رجحان کی حیثیت اختیار کرگئی۔ یہ وہ علامتیں ہیں جو ایک شاعر نے موجودہ زندگی اور معاشرے سے لی ہیں اور ان کی آڑ میں شاعر نے نفسیاتی الجھنوں، ارمانوں اور سیاسی موضوعات کو آزادانہ طور پر سپردِ قلم کیا ہے۔ علامت نگاری کے معاملے میں حامدؔی کاشمیری اپنے معاصرین میں سب سے آگے رہے ہیں۔ وہ ریاست کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے باقاعدہ طور پر علامتی شاعری کی طرف رجوع کیا ہے۔ حامدؔی نے پرانی علامتوں میں نئے مفاہیم کی جستجو کے ذریعے ان علامتوں میں نئے معنوی امکانات پیدا کیے ہیں۔ مثلاً یہ ایک شعر دیکھئے۔

شرار، برق، تلاطم، سیاہیاں، مرمر
کسے خبر تھی یہ ایک ساتھ پیش آنا تھا

1857 کے غدر کے بعد اردو میں شہر آشوبی غزلیں لکھنے کا رواج عام ہوا ہے۔ جس کا ثبوت نواب تفضّل حسین خان کوکبؔ دہلوی کی مرتب کردہ کتاب ''فغانِ دہلی'' 1864 سے ملتا ہے۔ یہ غزلیں اپنے عہد کی بھر پور عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے ذریعے اس عہد کی سیاسی، سماجی، تہذیبی وغیرہ تاریخ کو مرتب کیا گیا ہے۔ حامدؔی کاشمیری کے یہاں بھی شہر آشوبی غزلیں ملتی ہیں۔ انھوں نے جہاں اپنے عہد کی سماجی، تہذیبی و اخلاقی تاریخ کو مرتب کیا ہے، وہیں اپنے علاقے کی سیاسی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ شہر آشوب کے چند اشعار مجموعہ ''خوابِ رواں'' اور ''شہر گماں'' سے ملاحظہ ہوں۔

ہو گئے محروم بینائی تو کیا
نور کو ظلمت میں ضم ہونا ہی تھا

شام سے ہی چنار لرزاں ہیں
صبح کو قتلِ عام کرنا ہی تھا

کھول دیتے ہیں کیوں درِ زنداں
کون سا اب عذاب باقی ہے

مذکورہ اشعار میں شاعر نے گلشنِ کشمیر کی سیاسی بدحالی کا بیان بڑے ہی موثر انداز میں کیا ہے۔ حامدؔی کی شاعری کا فنی پہلو بھی قابلِ ستائش ہے۔ زبان و بیاں کے معاملے میں انھوں نے بڑے احتیاط سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ جو غزل کے لئے مناسب تھے۔ انھوں نے ان الفاظ کا استعمال صحیح طریقے سے کیا ہے۔

جو زندگی میں تشنۂ تکمیل ہی رہی
اُس حسرتِ گناہ کی کچھ اور بات ہے

کچھ اُن کی طرف سے بھی ہوئی ہم پہ نوازش
کچھ گردشِ ایام نے دل توڑ دیا

حامدؔی کاشمیری ستر برسوں سے شعروادب کی مختلف جہتوں میں مسلسل سرگرمِ سفر رہتے ہوئے نظم ونثر کی ہر مروجہ صنف میں دستاویزی نوعیت کی تصانیف نو بہ نو کے انبار لگاتے ہوئے شاعری، افسانہ نگاری، تنقید، تحقیق، تبصرہ نگاری، الغرض ہر میدان میں اپنی ہنرمندی اور کمالِ فن کی انفرادیت دنیا بھر سے منوانے کے بعد 27/دسمبر، 2018 کو 89 سال کی عمر میں اپنے فکر وفن کی روشنی بکھیر کر ہم سے ہمیشہ کے لیے دور چلے

گئے۔ریاست میں حامدؔی کاشمیری جیسا ادیب اب شاید ہی پیدا ہوگا۔یہاں مجھے غالبؔ کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

حکیم منظورؔ:۔

ریاست جموں وکشمیر میں حامدؔی کاشمیری کے بعد اگر کسی شاعر کا نام پوری پہچان کے ساتھ لیا جا سکتا ہے تو وہ حکیم منظورؔ ہے۔ان کا اصل نام محمد منظور تھا اور قلمی نام حکیم منظورؔ۔حکیم منظورؔ کی پیدائش 17رجنوری 1937 کو سرینگر میں ہوئی۔انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر سے حاصل کی ۔ پھر ایس۔پی کالج سرینگر سے بارہویں کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کرکے واپس کشمیر لوٹ آئے۔وہ ریاست کے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہ کر ڈپٹی کمشنر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

حکیم منظورؔ نے اپنا ادبی سفر 1956 میں افسانہ نگاری سے شروع کیا۔ان کے افسانے ''مارتنڈ'' اور دہلی کے ہفتہ وار اخبار ''چترا'' میں چھپتے تھے۔لیکن 1964 میں افسانہ نگاری کو خیر باد کہہ کر شعروشاعری کی طرف مائل ہوئے۔حکیم منظورؔ کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے،ان کی غزل تقلید کی زد میں نہیں ہے۔وہ یقیناً اپنے ہمعصر شعرا میں الگ نظر آتے ہیں۔ان کے ہاں نہ تو پٹے پٹائے موضوعات ہیں اور نہ ہی لب ورخسار اور گُل وبلبل کی بھرمار۔منظورؔ کے یہاں ان چیزوں کی تلاش سعیٔ لاحاصل کے مترادف ہے۔اگر چہ ان کے ابتدائی کلام میں رومانی اور روایتی شاعری کے تھوڑے بہت اثرات ملتے ہیں،لیکن وہ جلد ہی اس سے کنارہ کشی کر کے جدید رنگ وآہنگ اور فن کے نئے تقاضوں سے متاثر ہوتے گئے اور اس طرح ان کے کلام میں زیادہ گہرائی اور پختگی آئی ہے۔جس کے وہ خود معترف ہے۔

سو بار کی چلی راہیں عذاب ہیں
پاؤں کے اضطراب کو میدان چاہیے

حکیم منظورؔ کی شعری کاوشیں قابلِ تحسین ہیں۔ان کے کئی شعری مجموعے ''ناتمام'' 1977، ''لہولمس چنار'' 1982، ''برف رتوں کی آگ'' 1990، ''خوشبو کا نام نیا'' 1991، ''پھول شفق آنگن'' 1993 اور ''شعرآسماں'' 1997 منظر عام پر آ چکے ہیں۔جو ان کے پختہ شعور اور ذہانت پر دال ہے۔حکیم منظورؔ بڑے ہی سلجھے ہوئے الفاظ میں بڑی سی بڑی اور پیچیدہ سے پیچیدہ بات کہنے کے عادی ہیں۔اس فنی نزاکت سے اُن کی شاعری میں اور بھی رنگینی اور رعنائی پیدا ہوئی ہے۔اس تعلق سے خود لکھتے ہیں۔

منظورؔ بات اپنی اگر ہے تو پھر کبھی
کوئی سند کوئی بھی حوالہ نہ دیکھنا

حکیم منظورؔ بنیادی طور پر جذبے کے شاعر تھے۔لیکن وہ اپنے جذبے کو فکری جولانیوں سے قتل کر دیتے ہیں۔جس سے ان کی جذباتی شاعری دبتی گئی اور فکری شاعری بامِ عروج تک پہنچ گئی۔وہ اپنی بے چینیوں کے حوالے سے انسان کے درونِ نفس کی کشمکش کا جائزہ لیتے ہیں۔اس لیے ان کی غزلیں ایک نئی جہت لیکر سامنے آتی ہیں۔منظورؔ کی غزلوں میں موجودہ دور کے انسان کا وجود پاش پاش ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ان میں اس کا درد و کرب اور ذہنی افسردگی کے ساتھ ساتھ جنسی بے راہ روی کا بھی احساس ہوتا ہے۔اس طرز کے محسوسات اور خیالات حکیم منظورؔ جس طریقے سے پیش کرتے ہیں، وہ قابلِ ستائش ہے۔اشعار دیکھئے۔

پارکھ ہے تو مجھ کو پرکھ ہشیاری سے
میں اک گوہر بھی ہوں، میں اک پتھر بھی ہوں

مجھ سے دو گز پر سدا اونچا رہے گا آسماں
کیا ضرورت ہے کہ بے جا قد کو میں اونچا کروں

حکیم منظورؔ زبان و بیان کو اپنے خیالات کے تابع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مفرد لفظوں یا مرکبات سے استعاراتی پیکر تراشنے کی صلاحیت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مثلاً، سمندر، پتھر، زرد پتھر، تیرگی، ثمر، شفق، سنگ، آئینہ، خوشبو، رنگ وغیرہ الفاظ کے استعمال سے وہ اجنبیت، خوف، گھٹن، مایوسی اور بے وطنی کے جذبات کا موثر اظہار کرتے ہیں۔ یہ جذبات قدروں کی شکست کی آواز بن جاتے ہیں۔

دیکھ کر اس شہر میں ہر سمت ٹوٹے آئینے
چھپ کر میں بیٹھا ہوا احساس کے مرقد میں

اب یہاں کوئی وفاؤں کا خریدار نہیں
ہم بھی ہیں مُہر بلب دیکھ کے بازار کا رنگ

یہ کسے معلوم ہے میں درد کی کس حد میں ہوں
میں اک آئینہ ہوں لیکن پتھروں کی زد میں ہوں

میں نے ان فنکارانہ ہاتھوں سے تراشا تھا جو سنگ
کیا خبر تھی معنیِ تیشہ مجھے سمجھائے گا

مخملیں سنگ، بے برگ گُل، کیا کہوں
موسموں کی بھی کوئی شریعت نہیں

ان اشعار میں استعمال کردہ لفظیات میں جو تحرک پیدا ہوا ہے، وہ محض ان کی نحوی ترتیب بدلنے یا غزل کی روایتی حد بندیوں کی خلاف ورزی کرنے کے باعث پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس ضمن میں مضامین کے انتخاب نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔حکیم منظورؔ نے ان اشعار میں ایسے مضامین باندھے ہیں جو اپنے اظہار کے لیے استعمال ہونے والے جامد اور بجز الفاظ میں بھی جنبش اور نمو پذیری کی خوبیاں پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔حکیم منظورؔ کی ذہانت کی چابکدستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پریمی رومانی لکھتے ہیں۔

> ''حکیم منظور موزوں وقت پر بات کہنے کے عادی ہیں۔ وہ کچھ اس طرح سے اپنے خیالات کو پیش کرنے کے روادار ہیں، کہ اس میں شدت، سادگی اور اثر پیدا ہو۔ وہ مناسب موقع پر سلجھے ہوئے انداز میں بات دوسروں تک پہنچانے کے قائل ہیں۔انہوں نے اپنی شاعری میں جدید علامتوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ ان میں لسانی برتاؤ کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔''(6)

حکیمؔ منظور محبِ وطن شاعر تھے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں اپنے وطن سے محبت کے سچے جذبات کا اظہار کیا ہے۔انھیں اپنے وطن اور اس سے وابستہ تہذیب سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ ہر وقت اپنے وطن کے زوال سے مضطرب، یہاں کے لوگوں کی بے بسی سے پریشان، یہاں کی غلامی سے فکر منداور یہاں کی سیاسی بے رحمی سے افسردہ اور رنجیدہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی غزلوں میں نئے تجربوں کے ذریعے اپنے سماج اور اس سے وابستہ تہذیب کو سمونے کی کوشش کی ہے۔حکیم منظورؔ پر کشمیریت بہت زیادہ چھائی ہوئی ہے۔ان کی شاعری کا منفرد پہلو اپنے وطن ''کشمیر'' سے ان کی وابستگی بلکہ دلبستگی کا زائدہ ہے۔کشمیر کی اقامتی زندگی،

یہاں کے بدلتے موسموں اور پھلوں، مقامات اوراشیانے ان کی شاعری میں ایک ایسا منظر نامہ ترتیب دیا ہے جواردوشاعری میں بجائے خود ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہےاور یہ اشعار کسی نہ کسی image یا لینڈ اسکیپ کو پیش کر رہے ہیں جو دراصل شاعر کے داخلی لینڈ سکیپ سے جڑا ہوا ہے۔اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے میں کوئی شعری مثال پیش کروں، ان کی غزل سے متعلق مسعود منوّر کی یہ رائے دیکھئے۔

''حکیم منظوؔر کی غزلیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اُن کی جڑیں اپنی زمین میں بہت گہری ہیں۔ چنانچہ انھوں نے عرضِ سیب کی اخروٹ نکہتوں، سکوت برف شبی، نزولِ آفتاب، آفتابوں کا بڑھاپا، برف ملبوس، برف کا بستر، سلگتی برف جیسی ترکیبیں وضع کرکے جہاں اپنے مقامی رنگ کو نمایاں کیا ہے، وہاں غزل کے پیکر کو ایک تازہ تر، ایک بالکل منفرد، ایک غایت درجہ انوکھا ملبوس بھی دیا ہے اور وہ اپنے اس رویے کی بنا پر اپنے ہمعصروں میں بالکل علیحدہ دکھائی دیتے ہیں۔''(7)

اس اقتباس سے حکیم منظوؔر کی غزل کی انفرادیت کا ہمیں علم ہوتا ہے۔ان کے یہاں ایک منفرد لہجہ اور ایک الگ آواز کی پہچان ہوتی ہے۔وہ زبان وبیان کو اپنے خیالات کے تابع کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔حکیم منظوؔر کی شاعری میں کشمیر کا ذکر ان کی شاعری کو مقامی نہیں بنا دیتا بلکہ زمین وزماں کی حدود سے لا زمینی اور لا زمانی کیفیات ومحسوسات تک کے سفر پر محیط محسوس ہوتا ہے۔انہوں نے کشمیر کی تہذیب وثقافت سے وابستہ کئی مخصوص تراکیب اور الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، جن میں روؤف یعنی (کشمیری گیت) چنار چہرے، کانگڑی، نمکین چائے، سرو صنوبر کے قد آور پیڑ، بنجر کھیت، برفیلے سائے، وغیرہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔اس طرح ان کی شاعری کشمیر کی سیاسی وسماجی زندگی کا عکس ہے۔

ہوا ہی نہ بولے تو میں کیا کہوں
لہو لمس ہوتے ہیں کیسے چنار

تمہارے آموں پہ کیا گزری ہے، جانتا ہوں
لہو ہے اخروٹ میرے موسم کی سازشوں سے

چنار چہرے ہیں ان کی کوئی زبان نہیں ہے
سلگ رہیں ہیں مگر کہیں بھی دھواں نہیں ہے

پتھر میں شعلہ یا گوہر، دیکھ نہ پائیں، اُن کے لئے
اخروٹوں سے حنا کا رشتہ جیسے ایک تماشا ہے

اس سرے سے اُس سرے تک مختلف رنگوں کا جھمگٹ
سیب اس بازار میں اپنی نشانی چاہتا ہے

کس لیے اخروٹ کے چھلکوں سے رستا ہے لہو
سوچنے کے اس عمل پر کوئی بندش چاہیے

تازہ دم نمکین چائے کانگڑی ہنستی ہوئی
برف، گُل بُو قہقہے، پھر مدعا کیا پوچھنا

مذکورہ بالا اشعار میں جس لینڈ اسکیپ کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ لینڈ اسکیپ صرف معروضی نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر کی اندرونی کیفیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً اس شعر پر غور کر کے دیکھتے ہیں۔

کوہِ ماراں کی تجلی دیکھ کر منظوؔر اب
روشنی کیا ہے مجھے اب کیا کوئی سمجھائے گا

اس شعر کو اگر معروضی حوالے سے دیکھا جائے تو کوہِ ماراں کی تجلی کی کشش کے باعث مدو جزر کا منظر سامنے آتا ہے۔ لیکن دوسرے مصرعے میں شاعر کا ''روشنی کیا ہے'' اور ''مجھے اب کیا کوئی سمجھائے گا'' جیسا استفہامیہ انداز شاعر کی داخلی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اصل میں شاعر اپنے وطن کی سیاسی بے رحمی کے سبب نہایت پریشاں ہے، اسے اپنے وطن میں رہ کر بھی بے وطنی کا احساس ہوتا ہے۔

اپنے ہی گھر میں خود کو میں بے گھر دکھائی دوں
ہارا ہوا ہوں اور سکندر دکھائی دوں

اب کہاں معانی کے صحرا میں مری تکمیل ہوگی
میں مکمل لفظ تھا، لیکن مجھے لکھا ادھورا

حکیم منظوؔر اردو شاعری کی لفظیات سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ فکر و شعور سے مالا مال تھے، جذبات و احساسات سے بھرپور تھے۔ حکیم منظوؔر صداقت کے علمبردار تھے اور زبان و بیان میں پاکی، صفائی روانی اور جوش دونوں کی تصویر نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں الفاظ کا استعمال انتہائی خوبصورتی سے ہوا ہے۔ وہ

فرسودہ اور پیچیدہ الفاظ کو نیا جامہ پہنا کر ایک نئی شکل وصورت عطا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ایسے الفاظ بھی استعمال میں لاتے ہیں جو بالکل نئے ہوں اور اس طرح اپنی ایک الگ انفرادیت قائم کرتے ہیں۔ حکیم منظورؔ کے یہاں پتھر، کھڑکی، شعلہ، گوہر، برف، اخروٹ، کانگڑی وغیرہ جیسے الفاظ کی تکرار سے لفظوں کے معنی بدل گئے ہیں اور ان الفاظ کی اہمیت متعین کی ہے جن سے کئی نئی جہتیں سامنے آجاتی ہیں۔ بعض جگہوں پر انہوں نے کشمیری الفاظ کا مناسب استعمال بھی کیا ہے۔ ان کے یہاں معاصر شعور کی جھلکیاں اس طور پر ملتی ہیں کہ وہ ریاست کی مٹی کی خمیر سے لاتعلق نہیں ہو جاتیں۔ اس طرح سے شاعر نے اپنے وطن سے والہانہ عشق کی ایک انفرادی مثال قائم کی ہے۔ شاعر کی حب الوطنی کا جواز ان چند اشعار میں دیکھئے۔

کانگڑی بستر میں رکھ کر کھڑکیوں کو وا کروں
برف گرنے کا کبھی میں یونہی نظارہ کروں

پتھر میں شعلہ یا گوہر، دیکھ نہ پائیں، اُن کے لئے
اخروٹوں سے حنا کا رشتا، جیسے ایک تماشا ہے

حکیم منظورؔ نے اپنے قاری کو سیبوں کے ساتھ ساتھ آموں کی مٹھاس سے بھی آشنا کیا ہے اور پیپل کے شانہ بہ شانہ سفیدے کی سربلندی کا بھی ذکر کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

منظور برف دوست ہے، دلی میں کیا کہے
اب سیب ہے کہ آم، اسے کیا پسند ہے

یوں ہی سامنا ہوگا جب مرا سفیدوں سے
سایہ دار پیڑوں کی یاد کیوں نہ آئے گی

حکیم منظورؔ نے کشمیر کے آب و ہوا، وہاں کے پرندوں اور لوگوں کو مقامی تصورِ حیات ideology کے پسِ منظر میں بیان کیا ہے۔ان کے یہاں لفظ ''دھوپ'' سختی کا نہیں بلکہ شادمانی کا استعارہ ہے جو مصائب سے نبرد آزمائی کی تحریک دیتا ہے۔ یہ وہ تازگی ہے جو کہ جسم کے ساتھ ساتھ روح کو بھی ہنگامے کی گرمی عطا کرتی ہے جب کہ ''برف'' جسم و جاں کی یخ بستگی کا استعارہ ہے۔

مرا بس چلے برف زاروں کے بیچ
بناؤں میں کوئی مکاں دھوپ کا

حکیم منظورؔ کی شاعری کشمیر کا پُر اثر مرثیہ ہے۔انھوں نے اپنے کئی اشعار میں کشمیر کی سیاسی حالات کو پیش کیا ہے۔ یہ اشعار کشمیر کی عظمتِ رفتہ کا قصیدہ پُر آشوب، حال کا مرثیہ اور غیر یقین مستقبل کا آئینہ ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

امبری سیبوں کے میرے باغ سارے لُٹ گئے
میں وہ شہزادہ ہوں جو بے سلطنت ہو کر رہ گیا

یہ کھوکھلے چنار شکستہ حویلیاں
کچھ سال پہلے گاؤں تھا شاداب، صاف ہو گیا

آگ جو باہر ہے پہنچے گی اندر بھی
سائے جل جائیں گے اور پھر پیکر بھی

موجِ ہوا کا رقص میں دیکھوں تو کس طرح
آئینہ میری آنکھ کی دیوار بن گیا

مذکورہ بالا اشعار میں شاعر نے اپنے وطن (کشمیر) کی شان وشوکت کے عروج وزوال جیسے موضوع کو بیان کیا ہے۔ سرزمینِ کشمیر جو کبھی اپنی ایک انفرادی پہچان رکھتی تھی، آج سیاست نے اس کو اس طرح سے تباہ و برباد کیا ہے کہ سوائے افسوس کے کسی اور جذبے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ بستی ہے جو کبھی سر سبز وشاداب نظر آتی تھی، اب وہاں دور دور کہیں پہ زندگی نظر نہیں آتی ہے۔

حکیم منظورؔ کے کلام کی خصوصیت نے اہلِ علم کو ان کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کی انفرادیت اس امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ دوسروں کے بنائے ہوئے اصولوں پر چل کر اپنے شعور کو روشن نہیں کرتے بلکہ انفرادی اور شخصی سطح پر اپنے تجربوں کا پُر خلوص اور فنی اظہار کر کے معاصر شعور سے اپنی آگہی کا ثبوت دیتے ہیں۔ موجودہ دور کا انسان جس دھماکہ خیز صورتحال سے گزر رہا ہے اس کا احساس ہر کس و ناکس کو نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک شاعر کی بصارت کا ہی کمال ہے کہ وہ ان چیزوں کو دیکھتا ہے اور پھر ان حالات سے خود کو علاحدہ بھی نہیں رکھ پاتا ہے۔ اس تناظر میں جب ہم حکیم منظورؔ کی غزلوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اس میں جدید سوسائٹی کا پورا منظر نامہ سمٹا ہوا نظر آئے گا۔ سائنسی ترقی اور جدید ٹیکنالوجی کے ساتھ صارفانہ ذہنیت Consumer ideology نے جہاں ذاتی طور پر انسان کو خوشحالی دی ہے، وہیں روحانی وقلبی سکون جیسی گِراں قدر دولت سے خالی کر دیا ہے۔ ذات کا بحران، قدروں کی شکست وریخت بھی اس دور کا ایک المیہ ہے۔ حکیم منظورؔ کے یہاں ان تمام باتوں کا موثر اظہار ملتا ہے۔

لکھوں کیا برف صورت کاغذوں پر
تماشے کے سوا محبوس سب کچھ

غضب! خاموش ہیں ساری زبانیں
ستم! کرتا ہوں میں محسوس سب کچھ

موجودہ دور کا انسان بے یقینی کا شکار ہو چکا ہے اور اسے جدید علوم وافکار اور سائنسی پیش رفت نے جکڑ دیا ہے۔لیکن حکیم منظوؔر کا معاملہ کچھ الگ ہی ہے۔انھیں ان تمام چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی خدا پر ایمان متذبذب نہیں ہوا ہے بلکہ اس تاریکی میں بھی نور کی کرنوں کی التجا کرتے ہیں۔

چند ہنستے بولتے رنگین منظر بھیجنا
ہو سکے تو اک نیا موسم زمین پر بھیجنا

راتکی خنکی میں دینا تھوڑی سی گرمی اُدھار
دوپہر کی دھوپ میں سائے کی چادر بھیجنا

اب کے میرا کعبہ دل دشمنوں کی زد میں ہے
پھر مدد کرنا ابابیلوں کے لشکر بھیجنا

مسکراتے کھیلتے معصوم بچوں کے لئے
آنگنوں میں قاف کی پریوں کے لشکر بھیجنا

تو کہ سنتا ہے تو سن منظوؔر کی التجا
اے خدا! ہر رنگ اب پہلے سے بہتر بھیجنا

ان اشعار کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ منظورؔ زندگی سے مرعوب نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے جذبۂ بے اختیار شوق کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ ایک تو ان کے احساسات کی سچی ترجمانی ہوتی ہے، دوسرا وہ اپنی دلی تمناؤں کو اپنے خدا کے حضور پیش بھی کرتے ہیں۔

حکیم منظورؔ کے مخصوص اسلوبِ فکر نے غزل کو ایک نیا پیرہن بخشا ہے۔ان کی غزلوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی پیچیدگیوں اور تضادوں کا علم رکھتے ہیں۔ان کی انفرادیت وہاں پر اُبھرتی ہے جہاں وہ اپنے خیالات وتجربات کو جذباتی وفور سے بچا کر خود ضبطی،طنز اور احتجاج کا لہجہ عطا کرتے ہیں۔وہ غزل کی روایت سے اپنا رشتہ منقطع کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔تاہم ان کا ذہن جدید شعور سے آگاہی رکھتا ہے۔وہ لفظوں اور پیکروں کی ترتیب سے تازہ کاری کا احساس اس طرح دلاتے ہیں۔

بوئے گل، بادِ صبا کی طرح آوارہ ہے وہ
اُس نے ساری عمر اپنے آپ کو جانا نہیں

مجھے عزیز ہے یہ اپنے گھر کی تاریکی
کہاں رکھوں جو مجھے آفتاب دے کوئی

آنگنوں سے زرد پتوں کی صدا لے جائے گا
کوئی بھی طوفان آئے ہم سے کیا لے جائے گا

مذکورہ اشعار کی روشنی میں منظورؔ کی غزلیں منطقی استدلال کی شاعری کے طور پر اُبھرتی ہے۔ان کی غزلوں پر جدید نظامِ فکر کی چھاپ خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے،لیکن منظورؔ نے ان موضوعات کے بیان میں

شعر کی جمالیاتی قدروں کا بڑا احترام کیا ہے اور کہیں کسی بھی جگہ ناہمواری کا تصور تک نہیں ہوتا۔

حکیم منظؔور ایک خوش فکر شاعر ہونے کے علاوہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ان کی وجیہہ شخصیت، انکساری، وضعداری اور حسن اخلاق جیسے عناصر ثلاثہ کا مرقع نظر آتی ہے۔مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو۔

پھر بھی اے منظؔور کسی پر، ہاتھ نہ اب تک اُٹھا میرا
لڑنے کا فن سیکھ لیا ہے، گو میں نے بھی تھوڑا سا

مجموعی طور ہم کہہ سکتے ہیں کہ حکیم منظؔور کی غزلوں میں وطنیت کا غلبہ زیادہ ہے۔وہ ہر بار اسی کی ستم ظریفی کا رونا روتے ہیں۔یہ کیفیت اُس منفرد طرزِ احساس کی مرہونِ منت ہے، جو اسے اپنے سماج سے ودیعت کی گئی تھی۔حکیم منظؔور ایک ایسے دور سے تعلق رکھتے تھے جبکہ نظریات میں بہت زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔لیکن انھوں نے بے کیف اور بے رنگ فضاؤں سے الگ ہوکر ایک انفرادی راستہ اختیار کیا۔اس طرح ان کا نام تخریب کے دور میں تعمیر کی علامت بنا۔حکیم منظؔور متعدد اصناف کا ترتیب شدہ مطبوعہ کلام چھوڑ کر 69 سال کی عمر پا کر 2006 میں ادبی دنیا کی محفلیں سونی کر کے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔انھیں ریاست جموں و کشمیر کے ایک اچھے صاحبِ فکر فنکار کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

رفیق رازؔ:۔

رفیق رازؔ ریاست جموں وکشمیر کے ایک نامور شاعر ہیں۔ان کا اصل نام رفیق احمد اور قلمی نام رفیق رازؔ۔رازؔ کی پیدائش 10 / مارچ 1950 کو سرینگر کے ایک علاقہ براری پورہ میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم سرینگر کے مختلف اسکولوں سے حاصل کرنے کے بعد کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔رازؔ کو بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔رفیق رازؔ حامدؔی کاشمیری اور حکیم منظؔور کے بعد جدید دور کا ایک اہم نام ہے۔وہ نہ صرف اردو زبان کے اچھے شاعر ہے بلکہ کشمیری شاعری میں بھی اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ابتدا

میں انہوں نے کشمیری زبان میں ہی شاعری کرنی شروع کی ہے۔جس کا سب سے بڑا ثبوت ان کی کشمیری زبان کا شعری مجموعہ ''نَے چھے نالاں'' ہے۔اس کتاب کے عوض انھیں 1998 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔لیکن اردو زبان کے ساتھ بھی انہیں بڑا لگاؤ ہے اور اردو زبان میں شاعری کرنا اپنے لئے اعجاز سمجھتے ہیں۔اردو میں ان کے تین شعری مجموعے ''اَنہار'' ''مشراق'' اور ''نخلِ آب'' کے عنوان سے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

رفیق رازؔ کی شاعری لہجے اور فضا دونوں اعتبار سے نئی ہے۔لہجہ مایوسی اور ماتمی کا نہیں ہے، بلکہ مزاحمت کا ہے۔بے پناہ مظالم و مصائب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتماد اور حوصلے کے ساتھ سر بلند ہو کر کھڑے رہنے کی جرات کا مظہر ہے۔رفیقؔ کے لہجے میں قوت ہے، شکست خوردگی نہیں۔مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے۔

جسم کے دشت میں ویران جاں بولتی ہے
فرق یہ ہے کہ کوئی اور زبان بولتی ہے

فضا کے اعتبار سے ''دشت'' اور ''ویران'' اگر چہ روایتی علامتیں ہیں۔لیکن رفیق رازؔ کے یہاں یہ ایک وسیع تر اجتماعی منظرنامے کے ساتھ استعمال کی گئی ہے اور ایک مخصوص معنی کی ترجمانی کے لیے فضا ہموار کی گئی ہے۔رفیق رازؔ کے یہاں قدیم و جدید رنگوں کی جھلک نظر آتی ہے۔لیکن اس رنگا رنگی کے باوجود ان کی شاعری یک رنگ ہے۔شاید اس لیے کہ سادگی کے ساتھ ساتھ الفاظ اور بندشوں کے انتخاب میں بھی وہ نمایاں انفرادیت رکھتے ہیں اور ان کے اشعار پر ایک رومان پرور فضا چھائی رہتی ہے۔

یہ کرشمہ تری تصویر کا ہی لگتا ہے
ورنہ دیوار کسی گھر کی کہاں بولتی ہے

رفیق رازؔ اردو غزل کے ایک اچھے شاعر ہیں۔انہوں نے جذباتی ، ذاتی اور تصوراتی پیکروں کے لئے نئی نئی علامتیں تراشی ہیں۔ان علامتوں کے لئے شاید ہی کوئی واضح اصول ہو۔مختلف شعرا کسی علامت کو ایک یا قریب قریب ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔لیکن ان کے یہاں ایسے الفاظ کا استعمال کم نظر آتا ہے جو زمانہ دراز سے مستعمل تھے اور ایک مخصوص معنی کی ترجمانی کے لئے فضا ہموار کرتے تھے۔استعاروں کا زیادہ استعمال اگر چہ ان کے اشعار کو گراں بار بناتا ہے۔مگر ان کا استعمال اگر عمدہ اور چست انداز میں کیا جائے تو یقیناً یہ شاعری کے مشاہداتی پہلو کو جاندار بنانے کے مترادف ہیں، ساتھ ہی یہ شعر کو سادگی اور گفتگو کا رنگ بخشتے ہیں۔کیونکہ جدید شاعری روایتی اندازِ بیاں کو چھوڑ کر ایک نئے آہنگ، نئی معنویت اور نئے فکری احساسات کے اظہار کے امکانات کی متلاشی ہے۔

لوگ مجھ کو دیکھ کر اتنے ہیں کیوں حیران سے
جیسے ناقہ پر میں آیا ہوں ابھی کنعان سے

خون تو سارا ہماری ہی رگوں سے آیا تھا
تیر سب کابل سے آئے تھے کماں ملتان سے

سر تو لائے ہو بچا کے اے میرے غازی مگر
سر اُٹھا کر چل نہ پاؤ گے یہاں تم

ان اشعار میں استحصال اور شر پسندی کے خلاف ایک خاموش احتجاج ہے۔رفیق رازؔ نے اپنی شعری کائنات کو سمونے اور سمیٹنے کے لیے لفظوں کی ایک متوازی دنیا آباد کی ہے۔وہ بنیادی طور پر اندرونِ ذات

کے شاعر ہیں اور جب بھی وہ اپنے اندرون سے باہر آنے کی کوشش کرتے ہیں، وہاں وہ جلوہ افروزی کا سامان بھی تخلیق کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں شعری تجربے کا سفر خارج سے اندرون کی طرف نہیں بلکہ اندرون سے خارج کی طرف کا ہے۔ وہ یہاں سے کچھ بھی نہیں لیتے بلکہ وہ اپنے من میں ڈوب کر سراغ پانے اور لعل و گوہر تلاش کرنے میں جٹے ہوئے ہیں۔ رفیق رازؔ جدید دور کا شاعر ہونے کے باوجود بھی کشمیر کے روایتی،طلسماتی صوفیانہ شاعری کے منظرنامے کا حصہ بھی ہو سکتے ہیں۔جس کے احساس میں کشمیر کی ہزار ہا سال کی شعری اور وجدانی روایتیں اپنی تہذیبی اور اخلاقی ہیتوں کے ساتھ موجود ہیں۔

پتے ہلتے بھی نہیں تیز ہوا کے ہوتے
رک گیا کارِ جہاں کیوں یہ خدا کے ہوتے

سیلِ سیاہ کی زد میں باہر ہر ایک شے
مژگاں نہ کھول غور سے اندر کے رنگ دیکھ

رفیق رازؔ کی شاعری میں کشمیر کے شناختی امتیازات، مفارقت، زندگی کے بے معنی و بے کار ہونے کا کرب، زمانے کی بے رخی و بے اعتمادی کا اظہار فیشن کے طور پر نہیں ہوا ہے۔ بلکہ ایک سچے اور نڈر فنکار کی طرح ان تمام عناصر کا اظہار کیا ہے۔اسی لیے رفیق اپنے سامنے کی زندگی اور زمانے کی کج ادائیوں سے اپنی شاعری کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں۔لیکن ان کا اظہار اپنی ذات کی گہرائیوں میں موجود منفرد فنی وفکری انداز کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کی فضا زیادہ تر داستانی اور صوفیانہ نظر آتی ہے۔

ساتھ اب کے کچھ نہیں زادِ سفر بس ہاتھ میں
سات سو سالہ پرانا نقشہ تبریز ہے

ملبئہ بغداد سے کرتا ہے تعمیر سخن
تیرے اندر کا بھی شاعر فطرتاً چنگیز ہے

اپنا ہی کوئی در پئے آزار مجھ میں ہے
مجھ سے ہی کوئی بر سرِ پیکار مجھ میں ہے

لوگ مجھ کو دیکھ کر اتنے ہیں کیوں حیران سے
جیسے ناقہ پر میں ہوں ابھی کنعان سے

سر تو لائے ہو بچا کر اے میرے غازی مگر
سر اُٹھا کر چل نہ پاؤ گے یہاں تم شان سے

کشمیر کو ایک توصیفی موضوع سے نکال کر علامت کے طور پر استعمال کرنے والے شعرا میں رفیق راؔز ایک اہم نام ہے۔ راؔز کے تینوں شعری مجموعوں میں لفظ ''کشمیر'' کُل تین بار آیا ہے۔ لیکن کشمیر کے تعلق سے اُن کی شاعری انسلاک سے بھری پڑی ہے۔ راؔز کو اگرچہ آفاقی، متصوفیانہ اور ماورائی موضوعات مرغوب ہیں۔ لیکن ان کی شاعری میں کشمیر ایک زیریں لہر Indication کی طرح موجود ہے۔ راؔز کو عمدہ اور تازہ پیکر خلق کرنے میں کافی مہارت حاصل ہے جو کہ قاری کے اوسان کو متحرک رکھتے ہیں۔ اگر ان کے پیکروں کو مابعد جدید نظریہ سازوں کے نظریے کے مطابق کشمیر کے تناظر میں دیکھیں اور معنی کو لامرکوز کریں، معنی کے نئے اور تعجب خیز امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان پیکروں میں موجود تضادات کو دیکھ کر ان کے اندر اور باہر کی

متضاد کیفیات کی تفہیم ہو سکتی ہے۔

ہر طرح اس شہر میں سنگ باری ہو رہی ہے
میں کہ ہوں زد میں بھی اور محفوظ بھی اک آئینے میں

کرفیو لگا اور گھر میں پاؤں جو رکھ دیا
سامنے تنہائیوں کی اک فوج کھڑی تھی

وقفے وقفے سے اذانوں کا دھواں اٹھتا ہے
سانس لیتا ہے ابھی شہر کا مینار سیہ

مذکورہ اشعار میں سنگ باری، کرفیو، فوج، دھواں جیسے الفاظ کشمیر کی سیاسی حالات کی طرف رجوع کرنے والی علامتیں ہیں یا پھر ظلم و جبر کی نشانیاں ہیں۔

خدا کی تعریف وتوصیف کرنا ایک بندے کی مجال نہیں۔لیکن کچھ شعرا نے اپنی بساط کے مطابق اپنے کلام میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنے کی کوشش کی ہے۔رفیق رازؔ کے یہاں بھی کچھ اشعار ایسے ملیں گے جن میں خدا کی قدرت اور عظمت و طاقت جیسی صفات کو بڑے پُر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔شاعر اس بات کو دل وجان سے قبول کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے جلوے ہر شے میں موجود ہیں۔

یہ آسماں یہ چاند ستارے یہ آفتاب
آثار ہی تو ہیں ترے نام و نمود کے

لیکن اس کے لیے وہ آنکھیں اور دل ہونا چاہیے جو اسے دیکھ سکے اور محسوس کر سکے۔اس کے بعد وہ

اپنے معبود کے سامنے اپنے وطن کی سیاسی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لت پت ہیں خاک و خون میں اشجار یا اخی
بے سائیگی کا گرم ہے بازار یا اخی

جھلسا ہوا ہے جسم کا سایہ بھی جسم بھی
گرتی نہیں ہے دھوپ کی دیوار یا اخی

رفیق رازؔ کی غزلوں میں کشمیر کی مٹی کی خوشبو ہے۔ان کے کلام میں کشمیریت رچی بسی ہوئی ہے۔وہ اپنی تشبیہیں اور استعارے کشمیر کی فضا سے لیتے ہیں،ان کی محاکات میں بھی یہی رچاؤ ہے۔ان کی غزلوں میں ایسے کئی اشعار نظر آتے ہیں جنہیں بجا طور پر کشمیر کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔رازؔ قاری کو اپنے وطن کشمیر کی سیر کرنے کی دعوت اس طرح دیتے ہیں۔

خواب کی کرچیوں کو ساتھ لئے
وادئ شب کی دلدلوں میں اتر

تو کسی دن لباس شعلہ میں
میرے برفیلے جنگلوں میں اتر

دودھیا ابر کے محل سے نکل
خون آلودہ آنگنوں میں اتر

مذکورہ اشعار میں ایک مقدس کرب ہے جو خوابوں کو خواب سمجھنے پر بھی ان ہی خوابوں کو پلکوں پر سجانے کے لئے بے چین ہے کیونکہ ان کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کے کارواں کو آگے بڑھانے میں رفیق رازؔ نے وہی رول ادا کیا ہے جو فوج کا ہراول دستہ کرتا ہے۔ان کی غزلیہ شاعری کی خدمات کے سلسلے میں ثاقبؔ لکھنوی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مری ہمراہ منزل سے

پرتپال سنگھ بیتابؔ:۔

ریاست جموں وکشمیر کی شعری فضا میں پرتپال سنگھ بیتابؔ ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ان کی پیدائش 5/مئی1949 کو سردار گیانی پریم سنگھ کے گھر ہوئی۔میدانِ ادب میں وہ کافی عرصے سے سرگرمِ عمل ہیں۔انھوں نے نہ صرف علاقائی طور پر اپنی اہمیت کا احساس دلایا ہے بلکہ ملکی سطح پر بھی اپنے کلام کی اشاعت کے سبب اچھا نام کمایا ہے۔ بیتابؔ نے گل وبلبل اور حسن وعشق جیسے موضوعات کے بدلے عصری آگہی اور موجودہ دور کے سلگتے مسائل کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے۔سوز وگداز ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ان کے اشعار کو پڑھ کر قاری کے اندر غم کی لطیف وہلکی رَو ضرور دوڑ جاتی ہے۔لیکن یہ رجحان قنوطیت کی حدود کو نہیں چھوتا۔ان کے یہاں زندگی ہمیشہ اپنے ظہور کے لیے کوشاں ہے۔ بیتابؔ کے اشعار زندگی کو ہمارے لیے نامانوس اور غیر دلچسپ نہیں بناتے ہیں، بلکہ صرف آگاہی بخشتے ہیں۔ بیتابؔ نے اپنے اشعار میں متضاد احساس کا بیان جان بوجھ کر کیا ہے۔ان کی شاعری سے کوئی مثال پیش کرنے سے پہلے ہم جگن ناتھ آزادؔ کی یہ رائے دیکھتے ہیں۔

''بیتابؔ کا کلام ایک میخانۂ شعر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ کلام
دُرون بینی اور انکشافِ ذات کی لذت ہی کا حامل نہیں بلکہ صنائع
بدائع کے اُن محاسن سے بھی لبریز ہے جو طبیعت پر زور دینے سے
نہیں بلکہ اشعار کے ساتھ ہی بے ساختہ دلِ شاعر پر نزول کرتے
ہیں اور شعریت میں ڈھل کر کلام کو دلکش اور دلآویز بناتے چلے
جاتے ہیں۔''(8)

بیتابؔ کے یہاں خیال وزبان میں وحدت پائی جاتی ہے۔ زورِ تخیل کی مناسبت سے بیتابؔ نے زبان بھی جاندار استعمال کی ہے۔ پرتپال سنگھ بیتابؔ کی شاعری کے پانچ مجموعے، پیش خیمہ 1980، سراب درسراب 1984، خود رنگ 1995، موجِ ریگ 2003، فلک آثار 2013 منظرعام پر آچکے ہیں۔ ان میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ نظموں میں آزاد بھی ہیں اور پابند بھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیتابؔ اُن جدید شاعروں میں سے نہیں ہیں۔ جو جدید زیادہ ہیں اور شاعر کم، بلکہ وہ ایسے پختہ کار ادیب ہیں جو اپنے ذاتی قدروں سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اُن پر دسترس بھی رکھتے ہیں۔ بیتابؔ کی شاعری میں ذاتی ناکامی، فلسفہ وسیاست کی ناکامی، تہذیب وثقافت کی ناکامی وغیرہ جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ان اشعار پر غور کرتے ہیں۔

کھودی تھی ہم نے اپنی روایات کے لیے
یہ کیا ہوا کہ ہم ان ہی قبروں میں گڑ گئے

کوئی چودہ برس کی بات نہیں
میرا بن باس ایک جیون ہے

ان اشعار کی ساری تابش ایک جلے ہوئے نشیمن کی چنگاری ہے۔ جہاں عصری تہذیب کا کرب شاعر کا اپنا درد معلوم ہوتا ہے۔ پرتپال سنگھ بیتابؔ کی طبیعت کا تقاضا انھیں کسی ایک جہت میں قرار نہیں لینے دیتا۔اس لیے وہ مختلف اوقات میں مختلف جہتوں کا رُخ کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ان کی غزلوں میں تلخی کا ذائقہ نظموں سے کم ہے۔مگر طنز کی گہرائی نظموں سے زیادہ ہے۔نظموں میں تفکر کی جگہ تیز احساس ہے اور غزلوں میں تفکر اور آزردگی کا رنگ غالب ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی۔

’’بیتاب کی نظموں،غزلوں میں شاعر کی جو شخصیت نمایاں ہوتی ہے وہ بالکل یکساں ہے۔ یوں تو تقریباً ہراس شاعر کے بارے میں جو نظم اور غزل دونوں میں اپنا اظہار کرتا ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اظہار ان دو میں سے ایک صنف میں زیادہ بہتر ہے۔لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ نظم میں کسی اور طرح کی شخصیت نظر آئے اور غزل میں کسی اور طرح کی، یا دونوں شخصیتیں ایک ہی ہوں۔لیکن ان کے جو پہلو غزل میں نمایاں ہوں وہ ان پہلوؤں سے مختلف ہوں، جو نظم میں دکھائی دیتے ہیں، بیتاب کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔‘‘(9)

بیتابؔ نہ صرف ایک روایت پرست شاعر ہیں، بلکہ جدید دور اور جدید حسیت کے بعض عناصر بھی ان کی شاعری میں دھرآئے ہیں۔جدید شاعروں پر ایک الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ سب ایک ہی طرز میں لکھتے ہیں۔اس طرز کی ایک پہچان یہ بھی بتائی گئی تھی کہ جدید شاعروں کے یہاں سایہ، آسماں، شجر، شاخ، سمندر، وغیرہ الفاظ بہت آتے ہیں۔ساتھ ہی ان الفاظ کی معنویت بھی ایک جیسی ہے۔ بیتابؔ کے یہاں متقدمین سے لیکر متاخرین تک غزل کے حوالے سے تہذیبی اقدار کی تبدیلیاں نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ بیتابؔ

الفاظ ومحاورات کے استعمال پر مہارت رکھتے ہیں۔اس لئے ان کی شاعری کی زبان میں بھی ایک الگ لب و لہجہ پایا جاتا ہے۔ان کے یہاں جذبہ کی تڑپ اگر چہ کم ہے لیکن بیتابؔ کے استعمال کردہ الفاظ شاعری کے سانچے میں ڈھل کر بڑی حدتک فنِ شاعری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔انہوں نے سچ میں غزل کی دونوں روایتوں کی پاسداری کی ہے۔

پرتپال سنگھ بیتابؔ نے اظہار و بیان اور اسالیب میں نئے نئے اور برمحل الفاظ کے شاعرانہ استعمال سے اسلوب کے امکانات میں مزید اضافہ کیا ہے۔ان کی غزلوں کا لفظی اور لسانی نظام وہ بھی ہے جسے عام طور پر غزل کی غنائیت سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے کھردرے الفاظ کا ہی غزل میں استعمال کیا ہے، بلکہ انھوں نے بیشتر مقامات پر کھردرے لفظوں پر اپنی فکر کا رندہ چلا کر انھیں چکنا چور کر کے خوبصورت اور خوش نما بنادیا ہے۔دراصل یہ ان کی فکر کا کمال ہے۔

پاؤں کے نیچے زمین آجائے کاش اک بار پھر
ہم سے اب یہ آسمانوں کا سفر ہوتا نہیں

گھر سے مجھے نکال کے خوش ہو گیا تھا وہ
میں تو مگر بسا ہوا پورے نگر میں تھا

پرتپال سنگھ بیتابؔ نے بچپن ہی سے شاعرانہ مزاج پایا تھا۔جو ہر ایک انسان کا نصیب نہیں ہوتا، بلکہ اس مزاج کی تربیت میں علوم وفنون، زبان و بیان، مشاہدہ ومطالعہ کا بڑا دخل رہتا ہے۔جب عقل وخرد، قلب و نظر اور جنونِ شوق ایک مخصوص نکتۂ نظر پر جمع ہو جاتے ہیں۔تو جذبۂ شوق شعر کی صورت اختیار کر کے صفحۂ قرطاس پر اُتر آتا ہے۔اس طرح انسان عمر بھی اسی علمی دولت کا پرستار بن جاتا ہے۔

کیا کریں اور کوئی راہ نہ تھی
عمر بھر اس جہاں ہی میں رہے

بیتابؔ کی شاعری میں یاسیات کا غلبہ زیادہ نظر آتا ہے۔لیکن یہ رجحان قنوطیت کی حدود کو نہیں چھوتا۔شکست خوردگی پیدا نہیں کرتا۔ بیتابؔ کے یہاں یاسیت کی تہیں اتنی مظبوط نہیں کہ روشنی دب جائے، بلکہ قاری ان کے اشعار کو پڑھ کر وہی تاثر قبول کرتا ہے جو موسمِ گرما کی چمکتی ہوئی دھوپ اور جھلسا دینے والی لُو میں آسماں پر گہرے سیاہ بادلوں کے چھا جانے سے کرتا ہے۔ بیتابؔ قاری کو یہ اُمید بندھاتا ہے کہ یاسیت انسان کو زندگی جینے کا راستہ سکھاتا ہے۔اپنی شاعری میں یاسیت کے غلبے کے تعلق سے اپنے مجموعہ ''سراب در سراب'' کے صفحہ 128 پر لکھتے ہیں۔

''کچھ لوگ مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ میری شاعری پر یاسیت کا اس قدر غلبہ کیوں ہے؟ میرا خیال ہے کہ میری شاعری زندگی کی شاعری ہے، زندگی میں کرب اگر اس قدر زیادہ ہے، تو اس میں میرا کیا قصور، اس سلسلے میں ساحرلدھیانوی مرحوم کا ایک شعر یاد آتا ہے۔''

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

پرتپال سنگھ بیتابؔ کی غزلوں میں احساسِ غم کی شدت اور فراوانی کبھی کبھی یہ گمان بھی پیدا کرنے لگتی ہے کہ زندگی ایک بوجھ ہے۔ جیسے انسان ایک لاش کی طرح اُٹھائے ہوئے پھر رہا ہے۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں جو ایسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ان کے نزدیک جینا ایک مجبوری ہے اور انسان کو زندہ رہنے کی سزا دی گئی ہے۔

مجھ کو ایسے لگتا ہے گھر سے جب نکلتا ہوں
ہر کوئی مکمل ہے ایک میں ادھورا ہوں

اجنبی ہوں اپنوں میں بھیڑ میں اکیلا ہوں
میں کہ ایک دریچہ ہوں اور بند رہتا ہوں

ایک مدت سے ہے پیہم زلزلوں کا فیض مجھ پر
میں بھی کیسا شہر ہوں پَل پَل اُجڑتا جا رہا ہوں

در بدر اُن دنوں بھی تھے لوگوں
ہم جب اپنے مکان ہی میں رہے

پرتپال سنگھ بیتابؔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا ادراک رکھتے ہیں۔وہ اپنی غزلوں میں مانوس علائم کونئی لفظیات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے یہاں مایوسی تو ہے لیکن شکست نہیں،ایک بات یہ بھی ہے کہ جہاں ان کے کلام میں مختلف طرح کے اداروں کی ناکامی یا مختلف طرح کی کوششوں کی نارسائی کا احساس ہوتا ہے، وہاں انسانی تعلقات کی ناکامی یا شکست کا احساس بالکل نہیں ہوتا۔ایسا لگتا ہے کہ ناکامیوں سے مقابلہ کرنا ان کا معمول بنا ہوا ہے۔بیتابؔ نے اپنے عزائم اور جدو جہد سے اس تصور کو یاس پرستی کے بجائے اُمید اور یقین کے پھولوں سے سجا دیا ہے۔اگر مستقبل پر یہ یقین نہ ہوتا تو وہ زندگی کی جدو جہد میں مسلسل منہمک نہیں رہتے۔ان کا یہ شعر اس حقیقت کا غماز ہے۔

کوئی موسم ہو،انھیں تو کاٹنا ہوتا ہے وقت
کچھ درختوں پر کبھی کوئی ثمر ہوتا نہیں

پرتپال سنگھ بیتابؔ نے غزل کی زمین میں غیر متوقع پھول کھلائے ہیں۔ وہ زبان میں کسی رسومات کے پابند نہیں ہیں۔ وہ نامانوس الفاظ بھی بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں اور غزل کی مانوس رکھ رکھاؤ والی لفظیات بھی ان کی دسترس میں ہے۔لفظیات کا یہ تنوع کسی تیزی طبع کے اظہار یا ذہانت کے بجائے چالاکی سے کام نکالنے کی خاطر نہیں ہے، بلکہ اس تنوع کے ذریعے سے تخلیقی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔کبھی تو لگتا ہے کہ شاعر متکلم تھک ہار کر ایسے اسلوب میں اپنی بات کہہ رہا ہے جو خود ہی تجربے، مشاہدات اور انسانی فاعل کی ناقدری ظاہر کردے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر جان بوجھ کر بلند آہنگی ترک کر کے عامیانہ زبان استعمال کرتا ہے۔

دنیائے رنگ و بُو سے کنارا نہیں کیا
اچھا کیا جو ہم نے دکھاوا نہیں کیا

کتنے یُگوں کی برف ہے اس کوہسار پر
باطن میں اب اس کے کوئی لاوا نہیں رہا

آدمی راستے بدلتا ہے
فلسفہ ساتھ ساتھ چلتا ہے

ان اشعار میں جو سادگی پائی جاتی ہے اس کے پیچھے ایک گہری فکر کارفرما ہے۔شاعر استحصال اور

استبداد کو ایک ذاتی کرب کی طرح محسوس کرتا ہے اور انفرادی تجربے کی حیثیت سے قبول بھی کرتا ہے۔

پرتپال سنگھ بیتابؔ اردو کے کلاسکی شعرا سے بڑے متاثر تھے۔انھوں نے جہاں اپنی شاعری میں قدیم شعری استعارات وتشبیہات کا استعمال کیا ہے، وہیں اس امر میں جدت وندرت کا بھی ثبوت پیش کر کے قدیم شعرا کے اشعار سے متاثر ہوکر انھیں کے مضامین کو الگ الگ لفظیات کے تحت تخلیق کیا ہے۔انہوں نے قدیم اساتذہ کا مطالعہ کیا ہے۔ان کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے یہاں کچھ اشعار ابتدائی دور کی شاعری اور رنگِ میر کے عنواں سے کہی گئی غزلوں سے ملیں گے۔اس طرح بیتابؔ کے آہنگ کی فقیرانہ صدا میں میرؔ کی چھاپ نظر آتی ہے۔مثال کے طور پر میر تقی میرؔ کے ایک شعر سے موازنہ دیکھئے۔

تیز رکھیو سر ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

اب اسی شعر سے متاثر ہوکر بیتابؔ کا یہ شعر دیکھئے۔

اس دشت میں ہر خار کا سر تیز ہے بیتابؔ
رفتار میں جس درجہ ہے تیزی نہ رہے گی

مذکورہ اشعار میں بڑی سحر کاری ہے۔دونوں میں کوئی کردار نہیں ہے بلکہ خود کلامی پائی جاتی ہے۔لیکن اس کے باوجود بھی مکالمے کی صورت پیدا ہوئی ہے۔اگر چہ اثر انگیزی میں میرؔ کے شعر کو ترجیح دی جائے گی۔لیکن لہجے کی نرمی بیتابؔ کے یہاں سیاسی شعور سے بوجھل نہیں ہوتی ہے۔اس لیے بیتابؔ کا یہ شعر زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے۔

پرتپال سنگھ بیتابؔ شدتِ احساس کے شاعر ہیں لیکن جو چیز انہیں صاحبِ تمکین رکھتی ہے وہ غالباً یہی روحانی اور انسانی رشتوں کے دوام اور ان کے موثر ہونے کا تجربہ ہے جو اُن کی غزل میں تہ داری کی طرح

چپ چاپ اس کی گہرائی کو سیراب کرتی ہے۔

تباہی کسی دن کرے گا بہت
یہ لاوا یونہی جو دَبا رہ گیا

آباد اگر پوچھو تو گنجان بہت ہے
یہ دشت نما شہر جو ویران بہت ہے

خوش تھے ہم بھی زلزلوں کی زد میں اس کو دیکھ کر
اک مکاں اپنا نگر میں تھا جو کھنڈر کر دیا

بہر حال! بیتاؔب کی غزلیں ایک ٹھرے ہوئے جذبات اور سکڑے ہوئے احساس کی غماز ہیں۔ دورِ جدید کا انسانی المیہ ان کے حواس پر طاری ہے۔ شاعر کا ذہن مجروح ہے۔ وہ موجودہ دور کی زندگی کی تلخیوں کا عکس اپنی ذاتی محرومیوں میں بھی پاتے ہیں۔

فریؔد پربتی:۔

ریاست جموں وکشمیر کی غزلیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے فریؔد پربتی کا ذکر کرنا ناگزیر ہے۔ ان کا اصل نام غلام محمد بٹ تھا اور قلمی نام فریؔد پربتی۔ فریؔد کی پیدائش 4/ اگست 1961 کو سنگین دروازہ (حول) سرینگر میں ہوئی۔ ان کا شمار اردو کے اُن چند اُدبا میں ہوتا ہے جن کا اردو زبان وادب کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن ان کے ذوقِ ادب نے انھیں اتنا متاثر کیا کہ صرف اردو ہی کے گیسو سنوارنے میں ساری عمر صَرف کردی۔

فریدؔ بنیادی طور پر کامرس کے طالبِ علم تھے۔انھوں نے پہلے بی۔ کام اور ایم۔ کام کی ڈگریاں حاصل کی۔وہ چاہتے تو اسی میدان field میں اپنے جوہر دکھا سکتے تھے۔لیکن اردو زبان وادب کے ذوق وشوق نے انھیں اردو میں bridge course کرنے پر آمادہ کیا۔اس کے بعد اردو میں ''خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید نگاری'' پر ایم۔فل اور پھر'' شاہ حاتم دہلوی، حیات اور کارنامے'' پر پی ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔فریدؔ کا تقرر 1986 میں کشمیر اکاونٹس سروس ڈپارٹمنٹ میں ہوا۔اس کے بعد 2001 میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور 2006 میں اقبال انسٹی ٹیوٹ (کشمیر یونیورسٹی) میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر معمور ہونے کے کل پانچ سال بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

ریاست جموں وکشمیر کی شعری فضا میں فریدؔ پربتی جیسا قحط الرجال شاعر اب شاید ہی پیدا ہوگا۔وہ جتنے اچھے شاعر تھے اتنی ہی اچھی اُن کی شخصیت تھی۔فریدؔ کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔اردو کی شعری اصناف میں سے غزل،نظم،قطعہ اور رباعی میں طبع آزمائی کی ہے۔فریدؔ نظم ونثر کی کم وبیش پندرہ کتابیں تصنیف وتالیف کر چکے ہیں۔جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

شعری تصانیف :۔ ابرِ تر 1987، آب نیساں 1992، اثبات 1997،فرید نامہ 2003، ہزار امکاں 2006،خبرِ تحیر 2007،ہجومِ آئینہ 2010،اور ہزار امکاں 2011۔

نثری تصانیف :۔شاہ حاتم دہلوی۔حیات اور کارنامے، شہ زور کاشمیری ''تلمیذِ سیماب اکبرآبادی''، اردو ادب میں تاریخ گوئی کی روایت،اردو ادب میں اصلاح سخن کی روایت،مقدمہ صنفِ رباعی اور تخلیقی رویوں کی تفہیم وغیرہ شامل ہیں۔

فریدؔ پربتی نے اس زمانے سے لکھنا شروع کیا ہے، جب وہ اسلامیہ کالج (سرینگر) کی بزمِ ادب کی

طرف سے منعقدہ مختلف مجالس میں شرکت کرتے تھے۔اگرچہ میرا تعلق ان کی غزل گوئی سے ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انھوں نے صرف غزلیں تخلیق کی ہیں یا وہ کسی اور صنف کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ انھوں نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں، قطعات، رباعیات وغیرہ بھی لکھئی ہیں۔گویا ہر صنفِ سخن پر فریدؔ کو قدرت حاصل تھی۔فریدؔ نے جس میدان کو بھی منتخب کیا ہے، اس میں نئی بہار پیدا کردی ہے۔ان کی غزلوں میں عصری مسائل کا ردِعمل نہایت ہی بے ساختہ اور خودرو ہے کہ جسے کامیاب شاعروں کی بڑی ضمانت سمجھا جاتا ہے اور ساتھ ہی وہ اپنی محدود commitment کو اظہار کی سلاست روی میں سدِ راہ نہیں بننے دیتے۔اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے میں کوئی مثال پیش کروں۔فریدؔ کی غزل سے متعلق قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی کی یہ رائے دیکھئے، جو فریدؔ کی غزل کو سمجھنے میں کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔

> ''فریدؔ پربتی ہمارے اُن شاعروں میں ہیں جو شعری روایت سے نہ صرف واقفیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ہماری کلاسکی شاعری اور اس کی بوطیقا سے حسبِ توفیق استفادہ بھی کرتے ہیں۔ان کے ہاں نہ سراسر روایت پرستی ہے، نہ روایت گزیدگی۔شعری روایت کے شعور نے ان کے شعری ادراکات کو زیادہ سے زیادہ نکھارنے اور سنوارنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ جمالیاتی شعری روایت سے آگہی کے ساتھ انہوں نے اپنی فطرت کے عین مطابق ملک کی عام تہذیبی، رومانی اور انسانی روایات و اقدار کا بھی گہرا عرفان حاصل کیا ہے جس کے سبب ان کے ہاں تہذیبِ نفس اور تزکیۂ نفس کے مرحلے آسان ہوئے ہیں۔''(10)

اس اقتباس سے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ فریدؔ پربتی نے جمالیاتی شعری آگہی کے عین

مطابق اپنے ملک کی تہذیبی، روحانی، انسانی روایات واقدار کا گہرا عرفان حاصل کیا ہے جس سے ان کے یہاں تہذیبِ نفس اور تزکیۂ نفس کے مرحلے آسان ہو جاتے ہیں۔ شاعر کے لہجے میں کسی طرح کی بغاوت یا نفرت نظر نہیں آتی ہے، بلکہ ایک طرح کا دانشورانہ رویہ اور ایک غم انگیز آہنگ ملتا ہے۔ جو شاعر کی دردمند روح، اس کے روحانی سوز وتپش اور زخموں کا پتہ دیتا ہے۔ یہاں میں چند اشعار نموتاً پیش کرتا ہوں جس سے ہمیں شاعر کے لسانی رویے، معنوی ابعاد اور فنی وفکری کیفیت وکمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

اب اسی شہر میں کرتا ہوں طلب جائے اماں
لوگ جس شہر سے جان اپنی بچا کر نکلے

یہ عصر کربلا سے نہیں کم کسی طرح
ہر حق پرست ہے یہاں مظلوم بے طرح

رونق یہ میرے شہر کی اب لے گیا ہے کون
ایک اک سڑک خموش ہے ایک اک دکان بند

ان اشعار میں بڑی صداقت اور سلیقے کے ساتھ حالات کا نوحہ نظم کیا گیا ہے۔ یہاں شاعر کسی بھی طرح سے اپنے سماج سے بیگانہ نہیں ہوا ہے، بلکہ اس کے سماج میں جو چیزیں ہو رہی ہیں ان کا اثر وہ قبول کرتا رہا اور پھر اپنے تخیل سے اسے شعری پیکر عطا کرتا رہا۔

فریدؔ پربتی کے یہاں داخلی احساسات کی مرقع کاری نظر آتی ہے۔ انھوں نے تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں صرف جدت ہی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ان تشبیہوں کے ذریعے ان چیزوں کی طرف بھی

اشارہ کیا ہے جو مزاج اور اصول کے مطابق انوکھی ہیں۔ان تشبیہوں سے وہ اپنے کلام میں نہ صرف حسن و زور پیدا کر سکیں، بلکہ ایک خاص فضا اور کیفیت بھی پیدا کرتے رہیں۔ان تشبیہوں کے استعمال میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔انھوں نے اچھوتی اور نادر تشبیہات استعمال کی ہیں۔جیسے سرو چنار، دشت و سراب، آئینہ، سمندر، اشارے، دیوار، غبار، بگولہ، اوس، آندھی، درخت، پھوار، خار و خس، کشتی، کھیتی، مکان، پرندے وغیرہ۔ یہاں فریدؔ کے شعری مجموعہ ''آب نیساں'' سے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ ماتم کا ماحصل کیا ہے
اسی لئے مجھے آہ و بکا نہ راس آئی

اداس شام کے سائے یہ پوچھتے ہیں فریدؔ
محبتوں کی تجھے کیوں ضیا نہ راس آئی

شاید ڈبو کے جائیں گی طغیانیاں فریدؔ
خالی نہیں فساد سے دل کی کوئی ترنگ

فرصت جو ملے خود سے ملاقات بھی ہوگی
دیوار کے سایوں سے نئی بات بھی ہوگی

پیاسا جو پلٹ آؤں وہ ہے اپنا مقدر!
طے مجھ سے یوں تو منزلِ ظلمات بھی ہوگی

الفاظ وتراکیب اور معانی فرؔید کے ہاں ظروف سازی کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ یہ صناعی ان کی مخفی کیفیات کو بیش بہا جہتیں اور پہلو فراہم کرتی چلی جاتی ہے۔انھوں نے شاعری کی لفظیات کو گھسے پٹے انداز میں استعمال کرنے کے بجائے نئے نئے پیکر تراشنے کی کوشش کی ہے۔فرؔید پربتی کس لفظ کا استعمال کس نوع اور کس ساخت سے کرے، یہ اس کے کرشمہ ساز تصوراتی عرفان کا اختیار ہے۔ان کی با کمال صلاحیت ان الفاظ کو لغت کے دائرے سے نکال کر نیا آہنگ، نیا مرتبہ اور نیا مقام عطا کرتی ہے۔وہ استعاروں و علامتوں کو الگ طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔اس لیے خود کہتے ہیں۔

سلگتے خواب خریدے ہیں نیند کے بدلے
یہ کاروبار پرانا نیا نیا سا لگا

اس شعر میں ''سلگتے خواب'' اور ''نیند'' کے درمیان جو وابستگی پائی جاتی ہے وہ کشمیر کی موجودہ حالات کے تناظر میں اور وجودی کشمکش کے لحاظ سے بھی معنی خیز ہیں۔ساتھ ہی ان الفاظ کے استعمال سے شاعر نے اپنی مراجعت کی ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے۔

فرؔید پربتی کے یہاں ایک اور رجحان، جو اُن کے جمالیاتی فکر سے ہم آہنگ ہو کر بار بار سامنے آتا ہے وہ شدتِ غم کو کم کرنے کا عمل ہے۔

بطرزِ خاص ستم جو حنا حنا سا لگا
اسی سے درد کا رشتہ سجا سجا سا لگا

اس شعر میں ''ستم'' اور ''حنا'' کے درمیان مرحلوں اور رابطوں کا عرفان حاصل کئے بغیر درد کی معنویت کو سمجھنا نہایت مشکل ہے۔قدیم مضمون کو نئے رنگ کی زبان سے ہم آہنگ کر کے جن استعاروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے اس سے شاعر کی فنی چابکدستی کا اندازہ ہوتا ہے۔

فرؔید کی شاعری میں عصری حالات و معاملات کا ردِ عمل نہایت ہی بے ساختہ اور متحرک ہے، جو

کامیاب شاعری کی بڑی نشانی ہے۔ وہ اپنے تعہد یعنی commitment کو اظہار کی سلاست روی میں رکاوٹ نہیں بننے دیتے۔

کرائے دار سے ہوشیار رہنا
کہیں قابض نہ ہو جائے مکاں پر

خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے ایک اک دُکاں پر

شاعر زندگی کے جن گوشوں کو ظاہری و باطنی طور پر محسوس کرتا ہے۔ انھیں شعری زبان عطا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ فریدؔ اپنی مخصوص لفظیات اور لہجے سے اپنے اشعار میں ایک خوشگوار فضا تخلیق کرتے ہیں۔

یاد کے گہرے سمندر میں نہ ڈالو پتھر
دائرے کھینچتی ہے موجِ ہوا پانی پر

''یاد'' اور ''گہرے سمندر'' کے درمیان معنوی انسلاک، پتھر، دائرہ، موج، ہوا اور پانی کی شمولیت سے لفظی رعایتوں کی ایک طویل فہرست بنتی نظر آتی ہے۔ یہاں شاعر نے روایتی الفاظ میں ایک خوشگوار تبدیلی کر کے اپنے لہجے میں انفرادیت پیدا کر دی ہے۔

فریدؔ پربتی نے اپنے ذاتی تجربات کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ شعری قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ اپنے عہد کے سماج کی دراندازیوں، سماجی و معاشرتی زندگی کے بدلتے ہوئے رویوں اور اس سے وابستہ دوسرے معاملات کو اپنے ذاتی مشاہدات سے بڑی گہرائی سے محسوس کیا ہے۔ شاعر اس دنیا میں رہ کر خوش نہیں ہے۔ وہ اس دنیا سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے اور ایک ایسی دنیا کی طرف مراجعت کرنا چاہتا ہے جہاں

صرف اس کی اپنی ذات ہو اور کوئی نہیں غالباً وہ اُس جگہ تک پہنچ بھی گیا ہے۔

بہت دنوں سے کوئی خواب بھی نہیں آتا
چھڑا کے کون گیا ممکنات سے مجھ کو

شاعر کا شہر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہر طرف قتل و غارت گری ہے۔ معصوم چہرے مسخ کیے جا رہے ہیں۔ آبادیاں ویران ہو چکی ہیں، کوئی بچہ یتیم ہو رہا ہے تو کوئی عورت بیوہ۔ یعنی ہر طرف انسانی خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ فریدؔ نے انھیں دردمندانہ تاثرات کو اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔

کھو گئے گاڑھے دھویں میں شہر کے منظر تمام
اک پرندہ رہ گیا آہ و فغاں کرتا ہوا

اپنے سماج کے تباہ کُن حالات شاعر کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔ جب ایک انسان کو اپنی ذات کا عرفان ہو جاتا ہے تو وہ اپنے سماجی حالات کو اپنے جذبات و احساسات کی روشنی میں ڈھال لیتا ہے۔ شاعر اندر سے بُری طرح ٹوٹ چکا ہے۔ ان کے اندر جو حساس دل ہے وہ ایک عجیب سی بے رونقی کا مظاہرہ کرتا ہے اور شاعر خود کو ایک بے شمع کا مانوس سمجھنے لگتا ہے۔

تیرہ شبی نے آلیا میرا وجود
بے شمع کا مانوس ہوں، حیران ہوں

شاعر کا ایمان متزلزل نہیں ہے بلکہ اسے پورا یقین ہے کہ وقت بدل جائے گا اور لوگوں کے درمیان جو نفرتیں پیدا ہوئی ہیں۔ وہ ایک دن ناپید ہو جائیں گی اور انسان کے اندر کا اخلاص پھر سے جاگ اُٹھے گا۔

اس درجہ بڑھیں گے کبھی اخلاص کے رشتے
جو بات نہ کہنے کی ہے وہ بات بھی ہوگی

قرآن مجید کا اصل مقصد یہ ہے کہ خدا اور کائنات سے انسان کا تعلق واضح ہو جائے، ساتھ ہی ساتھ انسان یہ بھی جان لے کہ وہ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اللہ کا نائب ہے۔ فریدؔ پربتی کے یہاں اپنے سماج کی اصلاح کا ایک طریقہ یہ ہے، جو ذاتِ انسانی کو بالآخر رحمتِ باری کی فرحت بخش فضا میں لاتا ہے۔

سمیع کہنا، بصیر کہنا، علیم کہنا، حکیم کہنا
وہ اپنی عظمت سے خود ہے واقف اُسے تو ربِ عظیم کہنا

نوازش کیا، عنایتیں کیا، ہے باغ و بن کی روش روش پر
گلوں کو ، نکہتِ کلی کو رنگ، عطا ہے کس کی نسیم کہنا

دلوں کے سب بھید جانتا ہے، صدا صدا ہے اُسی پہ روشن
رحیم و رحمٰن صفت ہے اس کی اسے تو ربِ کریم کہنا

فرید پربتیؔ کو اپنے وطن (کشمیر) کی زہر آلودہ فضا کا بھی بخوبی ادراک ہے۔ باشعور شعرا نے ہمیشہ ہی سے عوامی حالات، خاص طور پر تیسری دنیا میں پائی جانے والی بے چینی کو ہی اپنا محبوب موضوع بنالیا ہے اور اپنے افکار کو شاعری کے قالب میں ڈھال کر اس بے چینی کے پیچ وخم سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ فریدؔ پربتی کے لحن میں شدتِ تسلسل اور برجستگی جس انداز میں ملتی ہے وہ ان کو منفرد بنا دیتی ہے۔ وہ اپنے وطن کشمیر کے پُرآشوب حالات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

اس درجہ بڑھے نقل مکانی کے یہاں شغل
تعمیر کہیں پر بھی مکاں کر نہیں پاتے

گھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا مجھ سا دُکھی ہے شہر میں کون
چھت پر چڑھ کر میں نے دیکھا، لگی ہوئی ہے گھر گھر آگ

تیرے آنگن میں پھول کھل آئے
میرے جیسا تو بد نصیب نہیں

کچھ ترحم چاہئے اے اَبرِ تر
جل گئیں میرے وطن کی کھیتیاں

خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے ایک اک دکاں پر

نکلا تھا گھر سے ڈھونڈنے وہ اپنے آپ کو
شاید یہی گناہ گناہِ کبیر تھا

شاعر نے ان اشعار کے ذریعے سرزمینِ کشمیر میں فاسد حکومتوں کی جانب سے بدعنوانیوں، غریب عوام کے استحصال اور فوجی استبداد کے مضامین کو نہایت حسنِ خوبی سے ادا کیا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فریدؔ پربتی کی شاعری فکری اعتبار سے نہ صرف اپنے پیش رو شعرا کے مقابلے میں، بلکہ اپنے ہم عصر شعرا کے مقابلے میں بھی ترقی اور فکری توسیع کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری کا

موضوعاتی تنوع اور فکری بلندی ان کی شاعری کے وقار کو نہ صرف بلند کرتی ہے بلکہ آنے والی نسل کے شعرا کی راہیں بھی ہموار کرتی ہے کہ غزل زندگی کے ہر تجربے کا اظہار ہو سکتی ہے۔ فریدؔ پربتی نے اپنی تمام عمر ادب کی خدمت میں گزاری۔ لیکن افسوس کہ گوناگوں جسمانی عوارض نے انھیں گھیر لیا تھا۔ 14؍دسمبر 2011 کو کل پچاس سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے کر ہمیشہ کے لیے دور چلے گئے۔ لیکن اس مختصر سی زندگی میں فریدؔ نے ادب کی جو خدمت کی ہے، اس سے اردو ادب ہمیشہ گراں بار رہے گا۔ بقول فریدؔ

زباں ہے صاف خیالات بھی شگفتہ ہیں
فریدؔ تو نے یہ طرزِ سخن نکالی ہے

سلطان الحق شہیدیؔ:۔

سلطان الحق شہیدیؔ کا شمار ریاست کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا اصل نام محمد سلطان الحق ہے اور قلمی نام شہیدیؔ۔ شہیدیؔ کی پیدائش 27؍جنوری 1933 میں ہوئی۔ وہ نہ صرف اردو زبان سے واقف ہیں بلکہ کشمیری اور فارسی زبانوں پر بھی اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ شہیدیؔ نے اردو شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ جن میں غزلیں، نظمیں اور قطعات شامل ہیں۔ ان کے اب تک تین شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جن میں پہلا مجموعہ ''انکشاف'' کے عنوان سے 2008 میں شائع ہوا ہے۔ جس میں غزلیں، نظمیں اور قطعات شامل ہیں۔ اس کے بعد دوسرا شعری مجموعہ ''تیشۂ گل'' 2009 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں زیادہ تر غزلیں ہی شامل ہیں اور 2012 میں ''برگ برگ'' کے عنوان سے ایک اور مجموعہ طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔

سلطان الحق شہیدیؔ نے شاعری کا آغاز بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں کیا ہے۔ ان کا کلام دہلی، ممبئی اور ملک کی دوسری جگہوں سے نکلنے والے ادبی رسائل میں چھپتا رہا۔ اس کے علاوہ کشمیر سے نکلنے والے

اردو روز ناموں اور کلچرل اکیڈمی کے رسائل میں بھی متواتر شائع ہوتا رہا۔ ریاست جموں وکشمیر میں اردو شعر و ادب کوفروغ دینے میں سلطان الحق شہیدیؔ کا اہم کردار رہا ہے۔ انھیں اپنی شاعرانہ بصیرت پر بڑا ناز ہے اور خود کو اپنے عہد کا میر تقی میرؔ سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے عہد کے ایک مستند شاعر ہیں۔ اس لئے ان کی ذات میں خود پسندی کا داخل ہونا بجا تھا اور یہ خود پسندی صنعتِ تعلیٰ کی صورت میں نمایاں ہوئی ہے۔

مجھے ہر گز نہیں دعوائے غالبؔ
حضور اس عہد کا میرؔ ہوں میں

شہیدیؔ نے مندرجہ بالا شعر میں تعلیٰ سے کام لیا ہے جس سے ان کی خود پسندی پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے یہاں خود پسندی کی ایک اور صورت ملتی ہے۔ ان کی خود پسندی کبھی نازک مزاجی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

کسی کو زعم اگر ہے کہ چڑھتا دریا ہوں
کہو کہ آنکھ ملائے میں تشنہ صحرا ہوں

سلطان الحق شہیدیؔ عصری مسائل و رجحانات سے بخوبی واقف ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں غزل کے فنی لوازمات سے سمجھوتا نہیں کرتے۔ ان کے منفرد لب و لہجے اور فکری گہرائی کا اندازہ ان کے کلام کو پڑھنے سے بخوبی ہوتا ہے۔ شہیدیؔ کی شاعری کا جائزہ لینے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے لسانی و جمالیاتی اقتضا کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے موضوعی اور اسلوبی اعتبار سے اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کے امکانات کو وسعت بخشی ہے۔ شاعری کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر اس طرح پیش کیا ہے۔

عصر حاضر ہے کینواس اپنا
اور اشعار ؟ چتر کاری ہے

سلطان الحق شہیدیؔ کی غزلوں میں ہمیں بیسویں صدی کے انسان کے کرب کی صدا صاف دکھائی دیتی ہے۔ اگر چہ غزل کی روایت رہی ہے کہ جب بھی کوئی انسان شاعری کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو ابتدا میں حسن و عشق جیسے موضوعات سے کام لیتا ہے۔ لیکن شہیدیؔ کا معاملہ کچھ الگ ہی ہے۔ ان کے یہاں حسن و عشق کے برعکس زندگی کی حقیقتوں کا اظہار ہوا ہے اور اس کا ثبوت ہمیں ''انکشاف'' کی پہلی غزل سے ہی ملنے لگتا ہے۔

برفاب ہو کے گر پڑا دریا و دشت پر
بادل بھی تھا عقاب مگر پر کٹا ہوا

سر تا قدم غبار سفر سے اٹا ہوا
وہ شخص قافلے سے ہے شاید ہٹا ہوا

مذکورہ اشعار میں زبان اور بندشِ الفاظ کی خوبیوں پر کافی زور دیا گیا ہے۔ لیکن طرزِ بیاں کے اعتبار سے شاعر نے غزل کو غزل ہی رہنے دیا اور بڑے سے بڑے خیال کو بھی حتی الامکان عام فہم زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

انسان خارجی طور پر اپنے ماحول سے اثر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ کبھی یہ اثر پذیری ارضیت کی صورت میں سامنے آتی ہے اور کبھی کسی اور حال میں۔ سلطان الحق شہیدیؔ کی فکری جہات میں ایک اہم خصوصیت ارضیت ہے۔ جس طرح میرؔ نے اردو غزل میں قلبی کیفیت کا اظہار کیا ہے اور اقبالؔ نے فلسفے کو پیش کیا اسی طرح

سلطان الحق شہیدیؔ نے اپنی شاعری میں اپنے وطن ''کشمیر'' کی عکاسی کی ہے۔شہیدیؔ نے اپنے وطن سے وابستگی کا اظہار بڑے ہی موثر انداز میں کیا ہے۔

ذہن دیکھا جو وادیٔ گلمرگ
رخش تخیل چڑھ کے آئے ہیں

جہلم نشاط باغ ولر اور امرناتھ
کشمیر سراپائے جلال و جمال ہے

کانگڑی ہے نہ کوئلہ گھر میں
برف کا شہر کال کا موسم

لدر عرفان تھے جو زمانے کے
ہر پہلگام میں سمائے ہیں

ان اشعار میں جن الفاظ وتراکیب کا ستعمال کیا گیا ہے، وہ سب کشمیر کی اپنی آب وہوا سے تعلق رکھتی ہیں۔جہلم ،نشاط باغ ،گلمر گ، ولر، کانگڑی، کوئلہ، برف، امرناتھ، لدر، پہلگام ،گل مرگ جیسے الفاظ سے شاعر نے اپنے وطن سے گہری وابستگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

شاعری خلا میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعلق اپنے معاشرے اوراس سے وابستہ حالات وواقعات سے ہوتا ہے۔سلطان الحق شہیدی کی شاعری غمِ ذات کے بجائے غمِ دوراں کا مرثیہ نظر آتی ہے، جس میں

سادگی کے علاوہ پُرکاری بھی ہے۔شاعر اپنی تہذیب اور سماج کی گرتی ہوئی عمارت کا نقشہ دیکھ کر کشمیر کا مرثیہ لکھتے ہیں۔

یہاں انصاف کی باتیں نہ کرنا
یہاں منصف انا کا ترجماں ہے

خراب و خستہ و دلگیر ہوں میں
بس اتنا جانئے کشمیر ہوں میں

سلطان الحق شہیدیؔ اپنی غزلوں میں درد و کرب کا اظہار طنزیہ لہجے میں کرتے ہیں ۔وہ جہاں ریاست کی سیاست کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں، وہیں ریا کار مولویوں کو بھی اپنے طنز کی لپیٹ میں کھڑا کرتے ہیں۔

یہ شیخ و برہمن سے پوچھتی ہے آج کی دنیا
رہے گی زندگی دیر و حرم کے درمیاں کب تک

دین ہو فلسفہ ہو حکمت ہو
آج کل سب کا چل گیا بیوپار

فلسفہ دین اور سیاست کی
نوعیت سب کی کاروباری ہے

حقیقت میں شاعر کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو۔لیکن حسن و جمال اسے اپنی طرف متوجہ کرتا ہی رہتا ہے

اور یہی ہماری شاعری کی روایت بھی رہی ہے۔عشق ہماری شاعری کا جزواعظم ہے۔عشق حقیقی ہو یا مجازی لیکن اس سے کوئی دل خالی نہیں۔شہیدؔی کے یہاں عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی کی جھلک زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ان کے یہاں کچھ ایسی غزلیں ملتی ہیں۔جن میں خدا کی قدرت اور عظمت وطاقت جیسی صفات کو بڑے موثر طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔انھیں اس بات پر کامل یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے جلوے ہر ایک شے میں موجود ہیں۔لیکن اس کے لیے وہ آنکھیں اور دل ہونا چاہیے جو اسے دیکھ سکے اور محسوس کر سکے۔

خدائے لم یزل تو مہرباں ہے
سوائے تیرے سب وہم و گماں ہے

تو ہی اول تو ہی آخر
تو ہی باطن تو ہی ظاہر

دوسرے مقام پر شہیدؔی کچھ اس طرح ربِ ذوالجلال کی شان وعظمت کو بیان کرتے ہیں۔

جسے ارض و سماں سمجھے ہیں ہم لوگ
وہ تیری صنعتوں کی اک دکاں ہے

شہیدؔی اقبالؔ کی شاعری سے بڑے متاثر ہیں۔اقبالؔ کے کلام نے شہیدؔی کے تخیل کے پردے پر مختلف نقوش ثبت کیے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کو پڑھ کر اقبالؔ کے کلام کا گمان ہوتا ہے۔

عیش ہے سوزِ حیات حسن سازِ حیات
یہ بھی ابھی نا تمام وہ ابھی ناتمام

مردِ مجاہد سے پوچھ اس کی حقیقت ہے کیا
رفعت منزل حلال رجعت منزل حرام

یہ حسن مجازی بھی وہ حسن حقیقی بھی
جلوے ہیں اسی کے سب اے نقد حکیمانہ

سلطان الحق شہیدیؔ نے اپنے آس پاس کے ماحول کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔انھوں نے عوامی دکھ درد اوران کے مسائل کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔اسی لیے انھوں نے اپنی شاعری میں انسانی نفسیات کو پیش کیا ہے۔ان کی غزلوں میں جوش ومحبت کے ساتھ ساتھ حالات کے جبر سے ایک طرح کی کڑھن پائی جاتی ہے۔مثال کے طور پر یہ چند اشعار دیکھئے۔

ہم نے ازل سے درد و خلوص و وفا کے ساتھ
ہر حادثے کو زینت دوراں بنا دیا

دیکھئے دل کے ٹکڑے نظر آئیں گے
میرا ہر اشک ہے آرسی کی طرح

تقسیمِ ہند کے بعد کشمیر میں جو سیاسی حالات رونما ہوئے ہیں ان کو شہیدیؔ نے مختلف پہلوؤں سے اپنے اشعار میں پیش کرنے کی بھر پور کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔کشمیر میں ہو رہے ظلم و جبر کے بیان میں کہیں کہیں ان کا لہجہ درشت دکھائی دیتا ہے لیکن اپنی شاعری کو انھوں نے نعرہ بازی سے دور رکھا اور اپنے جذبات کا اظہار شعری تقاضوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کیا ہے۔کشمیر کی خستہ حالی

اور اس کے اسباب و محرکات کے تعلق سے اکثر ان پر غم و غصہ کے جذبات بھی محیط ہو جاتے ہیں۔ شہیدؔی نے کشمیر میں ہو رہے ظلم و جبر، لوٹ مار اور ساتھ ہی ساتھ کشمیریوں کے صبر و تحمل، خودداری اور یقینِ محکم کو نہایت ہی حسین پیکروں کے ذریعے بیان کیا ہے۔

جشن پھر بھی مناتے ہیں ہم لوگ
جانتے ہیں سیاہ اجالے ہیں

کیجیے اس پہ تبصرہ کچھ آپ
ہونٹ اپنے ہیں ان کے تالے ہیں

سلطان الحق شہیدؔی کو زبان و بیان پر کافی دسترس حاصل ہے۔ ان کے کلام میں علامتوں اور پیکروں کا استعمال، تشبیہات اور استعارات کی رنگا رنگی کا برتاؤ اور موزوں الفاظ و تراکیب کا اچھے ڈھنگ سے اظہار ہوا ہے، جس سے ان کی غزلوں میں اور بھی تازگی پیدا ہوئی ہے۔

تجھ ایک چاند پر منحصر نہیں اب تک
نہ جانے کتنے ہی سورج گہن میں گزرے

سلطان الحق شہیدؔی کو اپنے ماضی سے بہت محبت ہے لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ وہ روایت پسند ہیں، بلکہ وہ ماضی کو حال کے آگے حائل ہونے نہیں دیتے۔ ان کی شاعری کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ کہیں وہ تخیل کا سہارا لیتے ہیں اور کہیں وہ تہذیب و روایات کا احترام و اعتراف بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ذہن کے دروازوں کو ہمیشہ کھلا رکھا۔ شہیدؔی نہ تو روایت سے بغاوت کرتے ہیں اور نہ ہی جدت سے آنکھیں چراتے ہیں، بلکہ دونوں سے مناسب فائدہ اٹھاتے ہوئے، قدیمیت، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کو ایک ساتھ منسلک کر دیتے ہیں۔ جس سے لسانی، موضوعاتی اور جمالیاتی رویے بھی کسی نہ کسی طرح

میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔

اکثر تمھاری یاد نے شب خون مار کے
پرزے اڑا دیے ہیں غمِ روزگار کے

ترا وصال میرے جون کا مہینہ ہے
ترے فراق کا موسم ہے جنوری کی طرح

شہیدؔ کی غزل کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔شاید ہی ایسا کوئی موضوع ہوگا جس کا ذکر شہیدؔ نے اپنے اشعار میں نہ کیا ہو۔ان کے کلام میں اکملیت اور تہہ داری پائی جاتی ہے۔اپنے اشعار کے ذریعے معنی کے نئے نئے دفتر کھول دیے ہیں۔غزل ان کی محبوب صنف ہےاور وہ اسے دبستان آگہی کا نام دیتے ہیں۔

کہیے غزل کو کیوں نہ دبستان آگہی
ہر شعر کھولتا ہے جو دفتر نئے نئے

سلطان الحق شہیدؔ کی شاعری ہمیں غم میں مسکرانے کا سبق دیتی ہےاور ساتھ ہی ظلم و جبر کا مقابلہ کرنے کی ہدایت دیتی ہے۔انقلاب کا بیان وہ نرم لہجے میں کرتے ہیں اور زندگی کو ایک مسلسل امتحان کا نام دیتے ہیں۔

بے دلوں کے واسطے یہ موت کا پیغام ہے
اہل دل کو اک مسلسل امتحاں ہے زندگی

اکیسویں صدی کا رجحان گو کہ انحطاط پذیر ہو چکا ہےلیکن سلطان الحق شہیدؔ کی غزلوں میں ایسے کئی اشعار دیکھے جا سکتے ہیں۔جنہیں قدیم روایت اور فرسودہ ماحول سے انحراف کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔مثال

کے طور پر یہ چند اشعار دیکھئے۔

ایک انسان ہوں اور اس پہ مصائب لاکھوں
میرے اللہ تجھے یاد کروں یا نہ کروں

دل ہے تنہا میری نظر تنہا
زندگی خوب ہے مگر تنہا

ساتھ تھے ان کے اور بھی لیکن
لوگ دیکھے ہیں بیشتر تنہا

فخر کرے تھا عرش جس پر ہے تحریر فسانوں میں
جانے وہ کیا بات ہوئی وہ بات نہیں انسانوں میں

اس طرح شہیدیؔ نے عصری مسائل ور رجحانات سے پوری واقفیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ان کی غزلوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں غزل کے فنی لوازمات سے سمجھوتا نہیں کرتے ہیں۔ان کے منفرد لب ولہجہ اور فکری گہرائی کا اندازہ ان کے کلام کو پڑھنے سے بخوبی ہوتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

عجب دستور دیکھا ہے جہاں کا
رہینِ رنج خود راحت رساں ہے

سمندر، رات، اک ٹوٹا سفینہ
یہ اپنی مختصر سی داستان ہے

رہا ہر دار ہر اک وار مبہوت
شہیدؔی تو بڑا ہی سخت جاں ہے

الغرض! شہیدؔی کی غزلیہ شاعری کو مدِنظر رکھ کر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ان میں اچھی تخلیقی صلاحیت پنہاں ہے۔

بلبلؔ کاشمیری:۔

شیخ غلام علی بلبلؔ کاشمیری کا شمار ریاست کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ بلبلؔ نے ضلع بانڈی پورہ (کشمیر) کے ایک معزز اور باوقار زمیندار گھرانے میں 12/اپریل 1912 کو آنکھیں کھولیں۔آپ کے والد کا نام عبدالجبار تھا، جو عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر اچھی دسترس رکھتے تھے۔بلبلؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔اس کے بعد بانڈی پورہ کے کئی اسکولوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سری پرتاپ کالج سرینگر میں داخلہ لیا۔اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر تین سال تک کالج میگزین کے ایڈیٹر رہے۔اسی کالج کی طالبِ علمی کے دوران شعروشاعری کا آغاز کیا۔ریاست کے مشہور شاعر میر غلام رسول نازکیؔ کو اپنا استاد مانتے تھے اور انھیں کے زیرِ سایہ شاعری میں باقاعدہ طور پر طبع آزمائی کی اور ان کو ہی اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔اس تعلق سے بلبلؔ کاشمیری خود فرماتے ہیں۔

> ''وہ یعنی میر غلام رسول نازکیؔ ہماری اولین درسگاہ میں ہمارے استاد تھے۔اُن کے علم وفضل کا شہرہ تو عام تھا مگر ہم پر اُن کی نگاہِ شفقت خاص تھی۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بلبلؔ کی شاعری نے انھیں کی

حوصلہ افزائی سے پر و بال نکالے تھے۔‘‘(11)

بلبلؔ کاشمیری کا شمار اردو کے ان بے نوا شعرا میں ہوتا ہے جنہیں تقسیم ہند کے بعد اپنا گھر بار، عزیز و اقربا اور اپنا وطن سب کچھ چھوڑنا پڑا۔ بلبلؔ کو تلاشِ معاش نے پہلے ہی سے بے گھر کر دیا تھا۔ انھیں ملازمت کے سلسلے میں کرگل (بلتستان)، برما اور سنگھا پور کی خاک چھاننی پڑی اور تقسیمِ ہند کے بعد پاکستانی فوج میں شامل ہو کر زندگی کے باقی سال پاکستان میں ہی گزارنے پڑے۔ لیکن ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لندن چلے گئے جہاں وہ زندگی کی آخری سانس تک ’’ہنس لو‘‘ HOUNSLOW نامی شہر میں رہے۔ اس بات کا پتہ بلبلؔ کے ان اشعار سے ملتا ہے۔

شاعرِ خوش نوا ہوں خندہ بہ لب
سب کو میرا پیام ہے ہنس لو

میں جہاں رہ رہا ہوں لندن میں
اس بسیرے کا نام ہے ’’ ہنس لو‘‘

بلبلؔ کاشمیری بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے، گو ان کی نظمیں اور قطعات بھی لطف سے خالی نہیں، غزلوں میں وہ احساس کی چوٹ کو دردمندی اور کیفیت کی زبان عطا کرتے ہیں۔۔ بلبلؔ نے جس میدان کو بھی منتخب کیا ہے، اس میں نئی بہار پیدا کر دی ہے۔ اگرچہ انھوں نے ہیئت کے تجربے نہیں کیے ہیں مگر موضوع کی صداقت ان کا یقینِ مسلم ہے، وہ اردو کے اُن شعرا میں سے ہیں جنہوں نے ہجرت کا دکھ بھوگا ہے۔ بلبلؔ کاشمیری کے دو شعری مجموعے ’’خندۂ گل‘‘ اور ’’دستِ چنار‘‘ کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ جن میں غزلیں، نظمیں اور قطعات شامل ہیں۔ بلبلؔ کی غزلوں میں پاکیزہ خیالات اور لطیف جذبات کی فراوانی ہے، جن میں

شاعر نے ماضی کی حسرتناک یادیں Nostalgia کی کہانیاں بیان کی ہیں۔ جو ہر غریب الوطن کشمیری کو ہر لمحہ اپنے وطن سے جوڑے رکھتا ہے۔ ان مجموعوں کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ ''کشمیر'' ایک طویل بے خوابی اور مسلسل کرب کا استعارہ ہے۔ ان مجموعوں کے تعلق سے پروفیسر منصور احمد منصور رقمطراز ہیں۔

> ''خندۂ گل'' اور ''دستِ چنار'' میں صرف وطن مالوف سے والہانہ محبت جھلکتی ہے بلکہ وطن کے سبزہ زاروں، کوہساروں، آبشاروں اور عزیز و اقارب سے بچھڑنے کے درد و غم کا اظہار بھی ملتا ہے۔ بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی حسرت بھی ایک گھٹی گھٹی چیخ کی صورت میں سنائی دیتی ہے۔''(12)

بلبلؔ کاشمیری کی شاعری میں کشمیر کے آبشاروں، سبزہ زاروں، کوہ ساروں اور قصبوں کا ذکر اس کثرت سے آیا ہے کہ اسے کشمیر کا شہرِ آشوب بھی کہا جا سکتا ہے اور سیاست نامہ بھی۔ ''دستِ چنار'' کا پہلا ہی شعر شاعر کے شعری رویے کا ترجمان اور ہجرت کے کرب کا اظہار ہے۔

وہ اُٹھے میری دعا کے واسطے دستِ چنار
منتظر ہیں وہ مرے سرد و سمن میرے لیے

بلبلؔ کی غزلوں میں ہجرت کے مسائل، غیر مانوس تہذیب کا سامنا اور نئے تقاضوں سے سمجھوتے کی دشواریاں بھی چنگاریوں کی طرح رقصاں نظر آتی ہیں۔ غریب الوطنی کے نتیجے میں انسان جس بے سروسامانی، بے کیفی اور ذہنی و جذباتی اُلجھن کو محسوس کرتا ہے۔ بلبلؔ کی شاعری میں اس کرب کا اظہار بڑے شدو مد سے ملتا ہے۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح لندن میں بھی نئے سال کی آمد پر بڑا جوش و خروش ہوتا ہے، لوگ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب رات کے بارہ بج جائیں، تاکہ گلی کوچوں، شاہراؤں، پارکوں اور گلیوں میں سالِ نو کا جشن برپا ہو۔ لوگ ایک نئی سحر اور نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے جاگ رہے ہیں اور غریب الوطن

شاعر اس ہنگامے سے کوسوں دور تنہائی، ویرانی اور اداسی کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔

وہ صبح سال نو کے لیے جاگتے رہے
میں سو گیا چراغ بجھا کر تمام رات

مہاجرانہ زندگی تو دربدری کی زندگی ہوتی ہے۔ انسان نہ صرف خود کو ایک خلاء میں بھٹکتا ہوا محسوس کرتا ہے بلکہ اسے اپنی شناخت سے محروم ہونے کا ڈر اور خوف ہر وقت ستاتا ہے۔ بلبلؔ کاشمیری کی شاعری میں اس خوف اور ڈر کو یوں زبان مل گئی ہے۔

چھوٹ کر اپنے وطن سے آہ کس آفت میں ہے
بلبل بے پر کی جان انگلستان میں ہے

کوئی قومیت ہے نہ کوئی وطن
کئی لوگ یوں در بدر ہو گئے ہیں

دربدری اور خوف ووحشت کے اس عالم میں جو چیز جذباتی اور نفسیاتی سہارا بن جاتی ہے، وہ وطن اور اہلِ وطن کی یاد ہے۔ جو بلبلؔ کاشمیری کی اپنی زمین اور ثقافت سے وابستگی کے استعارے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ شاعر ہر لمحہ اُن مناظر، مظاہر اور اُن رنگوں کو یاد کرتا ہے، جو اس کی زمین اور ثقافت سے نسبت رکھتے ہیں۔ وہ عالمِ تخیل میں کبھی ولر کے کنارے موجوں کا رقصِ جمیل دیکھتے ہیں اور کبھی اپنے گاؤں ''آجر'' کے مضافات سے نکل آتے ہیں۔ ایسی یادوں کا جھرمٹ ''دستِ چنار'' اور ''خندۂ گل'' میں بھرپور نظر آتا ہے۔ اس طرح یادوں کا رقص دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

کوہساروں پر نظر آتے ہیں جو بادل مجھے
لگ رہے ہیں عارضِ کشمیر کے آنچل مجھ کو

میرے سینے پر عمر رفتہ نے اک تیر مارا ہے
اس وادی نے یاد کے جزیروں میں پکارا ہے

اچھ بل یاد آگیا اور پاپہ چھن یاد آگیا
تھام لو مجھ کو مجھے اپنا وطن یاد آگیا

گاؤں کے کتنے مناظر رنگ برسانے لگے
دفعتاً یاد آگیا چھوڑے ہوئے ''آجز'' کا نام

گُلس کا، وُلر کا، داچھیگام کا، ماڈر کا نام
مدمتی کا، تراگہ بل کا، اور شیرا سر کا نام

مذکورہ اشعار میں چھپا یہ درد، اس ہجر وفراق اور اس تجربے کا زائیدہ ہے جو قریباً پانچ دہائیوں کے عرصے پر محیط ہے۔لیکن بلبلؔ کے یہاں نہ صرف درد وکرب کا اظہار ملتا ہے بلکہ ان کے شعری مجموعہ ''خندۂ گل'' میں ان کی خوشگوار ظرافت کا بھرپور عکس نظر آتا ہے۔بلبلؔ نے بعض جگہ شگفتہ ہی نہیں بلکہ خیال انگیز مزاح تک رسائی حاصل کی ہے۔ان کی طنز میں نشتریت ہے اور اس نشتریت کو انہوں نے محض گھسے پٹے خانگی مسائل تک محدود نہیں رکھا بلکہ عصر حاضر کی ناہمواریوں کے مسائل کو منظر نامے پر لایا ہے۔یہاں زندگی کی تلخیاں شوخی وظرافت کا سنگار کیے ہوئے نظر آتی ہیں۔بلبلؔ زندگی کے حادثات، تجربات اور وقوعات کو مزاح میں گھول کر پیش کرتے ہیں۔

کشت و خوں میں کٹ رہے ہیں اسطرح لوگوں کے سر
آدمی ہے آج کل مولی کا یا گاجر کا نام

''خندۂ گل'' میں ظرافت اور مزاح کے شوخ رنگوں کے درمیان اس کرب کے سائے بھی ملتے ہیں، جو کسی بھی تخلیقی فنکار کے اندر اپنی زمین اور اپنی ثقافت سے بچھڑنے کے شدید جذباتی احساس کے سبب پیدا ہوتے ہیں۔

میں ہوں خطرے کا الارم نالۂ بلبل ہوں میں
میرے ہم وطنو سنو سمجھو نہ تم پاگل مجھے

مفت کی مے بھی نہ پی بلبل نے مفتی ہے گواہ
مفت میں لیکن ہوا بدنام لندن شہر میں

جنتِ کشمیر سے بلبل نکالے کیا گئے
ہم پہ بھی آدم کی کچھ تاریخ دہرائی گئی

بلبلؔ کاشمیری ظریفانہ شاعری سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ وہ اگر پُر مزاح گفتگو بھی کرتے تو اس انداز سے کہ متانت اور سنجیدگی کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ان کی باتوں میں جو حسِ مزاح پایا جاتا ہے، اس کی بدولت اکثر محافل قہقہہ زار بن جایا کرتی تھی۔ انھوں نے باقاعدہ مزاحیہ شاعری بھی کی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام '' خندۂ گل'' کی شاعری مزاحیہ عنصر کے ساتھ ساتھ اپنے اندر بے انتہا سنجیدگی بھی لئے ہوئے ہیں۔ اس طرح ان کا بیشتر طنزیہ کلام ہجویات پر مشتمل ہے جو حقائق پر مبنی ہے۔

چند اشعار دیکھئے۔

لڑکا نظر آتی ہے، لڑکی نظر آتا ہے
مغرب کا جو سیدھا ہے الٹا نظر آتا ہے

منی اسکرٹ پہنے پھر رہی ہے اب جو وہ لڑکی
حیا سے باپ کے آگے اُٹھاتی تھی نقاب آدھا

عقل میں آتی ہے وسعت تن سکڑ جانے کے بعد
منزلِ پیری کی جانب عمر مڑ جانے کے بعد

تجربہ کنگی ہے جس سے بال سلجھاتے ہیں لوگ
یہ مگر ملتی ہے سر کے بال اُڑ جانے کے بعد

شادیاں ہوتی ہیں ٹیلی فون پر
کون کہتا ہے کہ دلی دور ہے

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ بلبلؔ کاشمیری کے شعری خیالات سادہ اور پاک ہیں۔اس لیے ان کے اسلوب میں بھی پیچیدگی نہیں۔ان کے بیان میں تازگی ہے،لیکن نامانوس تراکیب سے بڑی حد تک احتیاط برتا ہے۔بلبلؔ کاشمیری کا انتقال 2/مارچ 1998 کو 82 سال کی عمر میں لندن شہر میں ہوا۔ان کی وفات پر برطانیہ کے ایک شاعر سوہن راہی کا یہ قطعہ ملاحظہ ہوں۔جو ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ کے اپریل

1998 کے شمارے میں موجود ہے۔

شگفتہ فن کا وہ ایک شاہکار جاتا رہا
جہانِ خاک سے اک میرا یار جاتا رہا
وہ قہقہوں کی ضمانت وہ طنز کا رسیا
ہنسی مزاح کا آئینہ دار جاتا رہا

ہمدمؔ کاشمیری:۔

ہمدمؔ کاشمیری کا شمار ریاست کے عہد ساز شعرا میں ہوتا ہے۔ان کا اصل نام عبدالقیوم خان ہے۔لیکن ادبی حلقوں میں ہمدمؔ کاشمیری کے نام سے مشہور ہے۔ ہمدمؔ نے اپنا شعری سفر 1958 میں اس وقت شروع کیا، جب اُن کی ایک غزل امرتسر سے نکلنے والے ایک ادبی جریدے ''پگڈنڈی''میں شائع ہوئی۔لیکن ان کا شعری مجموعہ اس کے 45 سال بعد 2003 میں ''دھوپ لہو کی'' کے عنوان سے چھپا ہے۔جس میں اکسٹھ غزلیں شامل ہیں۔اس کے بعد ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''ورقِ سادہ'' کے نام سے 2012 میں منظر عام پر آیا ہے۔ان دونوں مجموعوں کی شاعری کا مطالعہ ایک ایسے ارتقائی سفر کی نشاندہی کرتا ہے جس کے بغیر کسی شاعر یا ادیب سے توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتیں۔ان مجموعوں میں شامل غزلوں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ ہمدمؔ بہت ہی کم گو ہے۔وہ نہ صرف کم گو ہی ہے بلکہ نرم گفتار، خوش گو، اور خوش فکر انسان ہونے کے علاوہ گونا گوں طبیعت کے مالک بھی ہیں۔انکا اندازِ بیاں سادہ اور رنگین ہے۔عرفان صدیقی اپنی تقریظ ''میرا لہو رواں ہے کس گلاب کے لئے''میں ہمدمؔ کاشمیری کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

''کسی ایسے شاعر کے لئے جس کی تخلیقات 1958 سے جب ان
کی غزل (پگڈنڈی۔امرتسر میں شائع ہوئی) ملک کے وقیع ادبی

جریدوں میں شائع ہوتی رہی ہوں اور اچھی اور سچی شاعری کے قدر شناسوں کی توجہ اور تحسین حاصل کرتی رہی ہوں۔ پہلے مجموعے کی اشاعت میں تقریباً چار دہائیوں کا وقفہ باعث تعجب ہو سکتا ہے۔لیکن جو لوگ ذاتی طور پر ان سے واقف ہیں اور جانتے ہیں کہ اس تاخیر یا تکلف میں ان کے مزاج کی درویشانہ افتاد اور تشہیر سے گریز کا بھی دخل ہے اور ان کے اس تخلیقی رویئے کا بھی کہ وہ تجربے اور واردات کو اپنے اندرون میں پوری طرح جذب کئے بغیر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ انھوں نے گزشتہ نصف صدی کے دوران اُبھرنے اور ڈوبنے والے مختلف شعری اور ادبی رجحانات کے ساتھ سفر طے کیا ہے اور غزل کے نو بہ نو رنگوں، لہجو اور رویوں کے درمیان اپنی شاعری کی انفرادی شناخت ودریافت کی ہے،اس فنکارانہ ریاض کا ثمرہ یہ ہے کہ کم کم لکھنے اور رُک رُک کر چھپنے کے باوجود اُنکی غزل نے جیسا کہ سچی شاعری کا خاصہ ہے، دلوں اور ذہنوں پر اپنا نقش قائم کیا۔ دنیا کو دیکھنے، سمجھنے اور اس کے پیچ در پیچ پہلوؤں کو بیان کرنے کا اُنکا مخصوص انداز ہمعصر غزل کی نمایاں لفظیات کے اشتراک کے باوجود دوسروں سے جُدا پہچانا جا سکتا ہے اور یہ الفاظ وتراکیب کی بلند آہنگی سے زیادہ محسوسات کی شدت پر قائم ہے۔'' (13)

اس طرح تخیل کی ثروت اور لفظیات کی شادانی ورعنائی ہمدؔم کی شناخت سے عبارت ہے۔ان کی شاعری میں زندگی کے وسیع تجربات اور مشاہدات کا فنکارانہ امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہمدؔم کاشمیری کا

اسلوب، اس کی سلاست، سادگی، غیر مبہم، تہہ در تہہ ذوقِ جمال کی تشفی کی مسلسل کاوشوں اور انفرادی جذبات و احساسات کی عالمگیریت وتخلیقی تجربوں کی ہمہ گیریت سے عبارت ہے۔

حقیقتوں کا کبھی سامنا ہوا ہی نہیں
کہیں پہ خواب کہیں پہ سراب دیکھے ہیں

میرا بدن تمام زخم ہے مگر یہ سوچئے
میرا لہو رواں ہے کس گلاب کے لئے

ہمدؔم اپنی غزل میں منفرد الفاظ کے دروبست سے نئے نئے رنگ بھر دیتے ہیں اور اس کو حیات آفرین بنا دیتے ہیں۔ان کے خیالات میں پرانی اور نئی شعری اقدار کا ادراک پایا جاتا ہے۔ ہمدؔم 1947 کے بعد پروان چڑھتی ہوئی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ملک میں بالعموم اور ریاست میں بالخصوص رونما ہونے والے کئی انقلابات کو حالات کا رُخ موڑتے ہوئے دیکھا،کوئی بھی حساس انسان اپنے اردگرد پھیلی ہوئی حالات کی اس سردمہری کو کیوں کرنظرانداز کرسکتا ہے۔انھیں نامساعد تجربات کی خنکی ہمدؔم کے اشعار میں ایک منفرد زاویے سے ہوئی ہے۔

کہاں کہاں نہ ہوئی خون سے تر بہ تر آنکھیں
جہاں بھی عرصۂ ناسازگار تھا، میں تھا

اب یہاں کس سے کرے کوئی شکایت ہمدؔم
شہر اپنا ہے، جنوں اپنا ہے، پتھر اپنے

مذکورہ اشعار میں خون، تر بہ تر آنکھیں، عرصۂ ناسازگار، بیکار، جنوں، پتھر وغیرہ الفاظ وتراکیب سے

زندگی کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ کافی سوگوار اور المناک ہے۔ ہر جگہ رونا دھونا دیکھ کر بجائے اس کے کہ ان اشعار سے فرحت میسر ہو، طبیعت میں اُداسی اور افسردگی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہمدؔم کاشمیری نے زبان لکھنے اور ترکیبوں و فقروں کو صحت کے ساتھ استعمال کرنے میں بڑی کاوش و احتیاط سے کام لیا ہے۔ انسانی زندگی کی سچائیاں دوسرے ہم عصر شاعروں کی طرح ہمدؔم کا بھی موضوعِ سخن ہے لیکن ہر تجربے سے دو چار ہونے کے بعد اُن کا منفرد ردِ عمل اپنے پیرایۂ اظہار اور اپنی فکری گہرائی کی بدولت معنی خیز اور خیال انگیز شاعری کا پیکر اختیار کرتا ہے۔ حیرت، تجسس، اندوہ، امید کی جھلکیاں ہمدؔم کی غزل کے منظر نامے کی تکمیل کرتی ہیں۔ ہمدؔم اپنے ڈکشن سے مرعوب نہیں کرتے بلکہ اپنے شعری تجربے کی صداقت اور اپنے دل کے گداز سے متاثر کرتے ہیں۔

کوئی شعلہ چنار سے نہ اُٹھا
زرد اشجار ہو گئے کیسے

بہت بیزار ہوں شہرِ یقین سے
نکل جانے کا راستہ سوچتا ہوں

طاق در طاق چراغوں کو جلانے والا
کیا ہوا سوچئے راتوں کو سجانے والا

ہمدؔم کی غزل کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ ان کی غزل کو کسی خاص علاقے کے تناظر میں دیکھنا اور پرکھنا صحیح نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی غزلوں میں اپنے وطن کشمیر کی مٹی کی خوشبوں سانسوں میں رس

گھولنے لگتی ہے۔لیکن ایک شاعر کی وسعتِ نظر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے حالات و واقعات کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتا ہے۔وہ دنیا کے کسی بھی علاقے میں انسانی جانوں پر ہو رہے ظلم و جبر اور قتل و غارت گری کا اظہار غیر جانبدارانہ طور پر کرتا رہتا ہے۔کیونکہ یہ حالات انسان کو بُری طرح مضطرب اور بے چین کر کے رکھ دیتے ہیں۔ہمدؔم کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں محدود حب الوطنی وسیع تر حب الوطنی سے ہاتھ ملاتی محسوس ہوتی ہے۔یہی عالمی تناظر ہمدؔم کی شاعری میں آفاقیت پیدا کر دیتا ہے۔

کر رہا ہے نئی تعمیر کی باتیں کیسے
جا بجا شہر کے آثار مٹانے والا

ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے گُم سُم
سڑک پہ مجھ سے بڑا اشتہار تھا میں تھا

اب بھلا اس سے بڑھ کر جان کا غم کیا ہوگا
دیکھنے والوں نے دیکھی نہیں زنجیر میری

شعر سے شعر اٹھایا ہم نے
خود کو یوں بہلایا ہم نے

سایوں کے ساتھ ساتھ وہ اشجار لے گئے
جتنے بھی تھے یہاں میرے آثار لے گئے

کیوں دریچہ نہیں کُھلا کوئی
بند بازار ہو گئے کیسے

ظاہر ہے کہ مقامیت کے حوالے سے ریاست جموں وکشمیر پچھلے کئی دہائیوں سے کئی معاشرتی، سماجی اور ہوشربا حالات وواقعات سے گزری ہے اور آج بھی صبر آزما حالات سے دوچار ہے، لیکن ہمدؔم کاشمیری کی شاعری فنکارانہ چابکدستی سے ہنگامی اظہار سے دامن بچانے میں کامیاب ہوئی ہے، جسکا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ عصری کرب آگہی سے جی کترا کر چلے ہیں۔

آج اس شہر میں ہر گھر ہے مقفل ہمدؔم
آج ممکن نہیں درویش کو خیرات ملے

لہو لہاں ہوئے سب پڑے پڑے گھروں میں
عجب تھا یہ، کہیں میدانِ کارزار نہ تھا

یہ ہماری ہے نہ تمہاری دنیا
جانے کس کی ہے بیچاری دنیا

جیسے میں کوئی کھوٹا سکہ ہوں
دیکھتے ہیں وہ بار بار مجھے

الٹے سیدھے حروف ایسے لوگ
شہر لگتا ہے اشتہار مجھے

دیکھا جو غور سے تو کہیں زلزلہ نہ تھا
ایک ایک اینٹ گر گئی میرے مکان کی

شاعر کو اس چیز سے کوئی واسطہ نہیں ہے کہ لوگ اس کی شاعری کو کیا سمجھیں گے اور اس کے دل کے جذباتی تجربات میں کیسے شریک ہو جائیں گے۔ بلکہ اگر اپنے کلام کی تھوڑی بہت داد مل سکتی ہے تو وہ ایک ایسے شخص سے مل سکتی ہے جس کی خاطر وہ شہرِ غزل میں قدم رکھ چکے ہیں۔

تیرے لہجے میں تجھ سے دو باتیں ہوں
ورنہ شہرِ غزل میں میرا کام نہ تھا

ہمدمؔ کاشمیری کے اس شعر کو پڑھ کر انسانی ذہن شش پنج میں پڑ جاتا ہے، کہ شاعر شہر غزل میں آ کر کس سے گفتگو کرنا چاہتا ہے اور مخاطب کون ہے، وہ کس سے دو باتیں کرنا چاہتا ہے۔لیکن اس شعر میں جو معنوی ابہام پایا جاتا ہے، وہیں تجربے کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے۔الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمدمؔ کاشمیری سنجیدہ طبع، مخلص اور زندہ دل انسان ہیں۔انہوں نے بحیثیت شاعر و ادیب نصف صدی سے زیادہ شعر و ادب کی محفلوں میں نمایاں رہ کر اردو ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ ہمدمؔ ابھی حیات ہے اس لیے آگے بھی ان سے یہی اُمید کی جا سکتی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کی غزلیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے شفقؔ سوپوری کو کسی بھی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔شفقؔ کی پہچان ایک نثار کی بنا پر مسلم ہے۔لیکن ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔جدید دور اور جدید حسیت کی گوناگوں جھلکیاں ان کے ہاں نظر آتی ہیں۔شفقؔ کی شاعری اظہارِ ذات کی شاعری ہے، ایک ایسے فرد کی کہانی جو اندر سے ٹوٹا ضرور ہے البتہ بکھرا نہیں ہے۔ان کے لب و لہجے سے ایک طرح کی تازگی کا احساس ہوتا ہے، نئی لفظیات اور نئی حسیت اُن کی شاعری کے امتیازی

اوصاف ہیں۔

صبح کا بھولا تھا چاند میری طرح
اپنے ہی شہر میں گُم ہوا، کھو گیا

مجھ کو چلنے نہیں دیتا ہے اکیلا وہ خدا
میں جو چلتا ہوں مرے ساتھ ہوا چلتی ہے

شفق کی شاعری ذاتی واجتماعی مصائب کی روداد ہے۔وہ اپنا ایک انفرادی رنگ رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے اشعار میں روایتی علامتیں استعمال کرنے کے برعکس ایک نئی تازگی اور ایک نیا شعور دکھایا ہے۔لیکن ان تمام نزاکتوں کے باوجود ان کے ہاں انسانی جذبات واحساسات کا بہترین اظہار ملتا ہے۔فطری اشیاء کی ترجمانی کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔شفق کے کلام میں زبان کی لطافت کے ساتھ ساتھ رنگینی کے جوہر پائے جاتے ہیں۔

یہ بوئے گل، یہ خاک رہ اور برگ زریں
ہر اک روپ میں اُڑتا ہے بدن مرا ہی

جانے کہاں سے آکے پھر سانپ زہر اُگلے
اس رات کے دریچوں پر اک نظر غنیمت

اس کے علاوہ شفق سوپوری اردو کی کلاسکی شعری روایت سے پوری طرح واقف ہے اور ادھر کچھ عرصے سے ان کی شاعری میں کلاسک سے براہِ راست جُڑ جانے کے کئی دلآویز اور کامیاب تجربے سامنے

آئے ہیں۔

وہ تن ہی کی موجوں میں ایک ہوگی
جس موج میں سفاک خواب ہوگا

ریاست جموں وکشمیر کی شعری کائنات پر نظر دوڑاتے ہوئے ہمیں چند شاعرات بھی نظر آتی ہیں۔مگر بدقسمتی سے ان شاعرات کے تئیں ایک طرح کا سکوت چھایا ہوا نظر آتا ہے۔اگرچہ ان میں سے چند قلمکاروں کی دبی دبی آوازیں سرگوشیوں میں سنائی دیتی ہیں مگر یہ آوازیں ان کے گھروں کی دیواری سے ٹکرا کر رہ گئیں ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کو اس بات پر فخر ہے کہ یہاں کی شاعرات نے اپنے معاشرے کے تعلق سے گہرا شعور پیدا کرنے کے لئے بہت جدوجہد کی ہے۔انہوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف سے واقفیت حاصل کی۔خصوصاً نظموں اور غزلوں میں یہ نہایت جاذبیت رکھتی ہیں۔ان شاعرات نے بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ مشقِ سخن کو جاری رکھا اور بہت جلد صحیح راستے پر گامزن ہوگئیں۔ریاست کی شاعرات کے کلام میں روایت کی پاسداری اور اس کی صالح قدروں کا احساس نمایاں ہے۔

ان شاعرات کا کلام روایتی ہونے کے ساتھ ساتھ جدید خیالات اور جدید طرز سے بھرا ہوا ہے۔ان کے کلام میں جہاں قدیم طرز کے موضوعات۔جیسے عشق و عاشقی،گل وبلبل کی داستانیں ملتی ہیں وہیں جدید طرز کے وہ اشعار بھی نظر آتے ہیں جو ملک وقوم کو بیدار کرنے میں کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ان شاعرات کے یہاں خیالات کی بلند پروازی،سادگی،اسلوبِ بیان کی ندرت اور جدتِ زبان کی جو صفائی ملتی ہے،وہ حقیقتاً قابلِ داد ہے۔موجودہ دور میں جن خواتین نے ریاست جموں وکشمیر میں شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل کیا ہے اور جن کے کلام نے شہرت حاصل کی ہے۔ان میں ترنّم ریاض،فریدہ کول،درخشاں

اندرا آبی، نصرت چودھری، نسرین نقاش، نکہت فاروق نظر، رخسانہ جبین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ان شاعرات کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار کو اگر ان کے نام بتائے بغیر پیش کیا جائے تو کسی کو یہ بھی پتہ نہیں چلے گا کہ کسی عورت کا لکھا ہوا شعر ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں ایسے اشعار نظر آتے ہیں۔ جن میں وہی اسلوب، وہی تخلیقی نہج اور وہی موضوعات ملتے ہیں جو دوسرے مرد شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی نے کہا تھا کہ شعر میں جنس (Gender) کا ظاہر ہونا معیوب ہے۔ اس کے بعد اس عیب سے بچنے کے لیے مونث کا صیغہ استعمال کرنے کے بجائے مذکر کا صیغہ رواج پانے لگا۔ چنانچہ ان شاعرات نے بھی حالی کے اس بیان کی تائید میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں، جن سے تذکیر و تانیث کا فرق واضح نہیں ہوتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔

دھندلا سا ایک نقش ہوں اک اَن کہی سی بات
چہرے کی اس خوشی سے اُجاگر نہیں ہوں
(نصرت چودھری)

میں شمعِ انتظار کیے رہا
چاہت کا اس طرف سے اشارہ نہ ہو سکا
(نصرت چودھری)

اسے شدتِ غم کے ماروں میں لکھنا
مرا نام بھی بے سہاروں میں لکھنا
(فریدہ کول)

جنہیں جذب کرتی ہے شب کی سیاہی
مرا ذکر ایسے ستاروں میں لکھنا
(فریدہ کول)

اب تو اُسکی جستجو کا ایک ہی انداز ٹھرا
تتلیوں کے ساتھ پھرنا، خوشبوؤں کے ساتھ رہنا
(درخشاںؔ اندرابی)

ان شاعرات کا اظہار، اندازِ بیاں اور شعر گوئی کا رویہ خود پروردہ ہے۔ان کے کلام میں عشقیہ مضامین کی کثرت ہے جس کی بنیادی وجہ ان کی روایتی شاعری کی پاسداری ہے۔ان کے یہ اشعار جذبۂ احترام کو اُجاگر کرتے ہیں۔شاعری بنیادی طور پر جذبات کی ترجمانی کا نام ہے۔ریاستی شاعرات نے جہاں اپنے کلام میں اس چیز کا خیال رکھا ہے وہیں ان کے کلام میں ایک پُر کیف و پُر تاثیر درد بھی ملتا ہے۔ساتھ ہی کلام میں سادگی وروانی بھی پیدا ہوئی ہیں۔ان شاعرات کے کلام میں زیادہ تر عشقیہ مضامین ہی برتیں گئے ہیں مگر ایسا نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ان اشعار کی بنیاد صرف عشقِ مجازی پر ہے۔

اُن سے مل پاؤں کبھی ایسا اشارہ مانگو
میں سمندر میں کھڑی ہو کے کنارہ مانگو
(نصرتؔ چودھری)

نسرین اُس کی یاد سے روشن ہے کائنات
ہر لمحہ مری جاں سے جو یکسر قریب تھا
(نسرینؔ نقاش)

خود شناسی کا درس دیتا رہا جو عمر بھر
خود سے ہی وہ کب ملا ہے فرصتوں کے باوجود
(نکہت فاروق نظرؔ)

دل و نگاہ پر کچھ ایسے چھا گیا کوئی
بجھا چراغ تھا دل کا جلا گیا کوئی
(فریدؔہ کول)

انسان کے نظریات میں اخلاقی قدروں کے سلسلے میں اختلاف واقع ہوسکتا ہے۔مگر وہ بنیادی اصولوں سے قطعی طور جدانہیں ہوسکتا ہے۔اس طرح انسان عام طور سے حقیقت کے دامن سے وابستہ رہتا ہےاور وہ اپنے سماج سے رشتہ قائم رکھتا ہے۔ ریاستی شاعرات نے بھی اپنے عہد کے سماج کے ناسازگار حالات کواپنی شاعری میں پیش کیا ہے،مثلاً۔مایوسی،اپنوں سے دور ہونے کاغم،سوگواری،حالات کاشکوہ اور اس سے تعلق رکھنے والے مختلف مضامین کوبھی بیان کیا ہیں۔اپنے عہد کا سیاسی شعور بھی ان کے کلام میں ملتاہے۔کشمیر کے سیاسی حالات وواقعات کی ترجمانی کانقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

رات دن ہے جو برق کی زد میں
میں کسی آشیاں میں رہتی ہوں
(فریدؔہ کول)

حادثوں کا جب تھا پل پل سامنا
کوئی بھی گوشہ میرا پنہا نہ تھا
(فریدؔہ کول)

میرے گھر میں ہے موت کا آنا جانا
مرا سانس بھی مرے بس میں نہیں ہے
(نسریؔن نقاش)

ہمارے پاؤں سے لپٹا ہے خواہشوں کا سفر
ہمارے سر ہیں کہ بس خنجروں میں رکھے ہیں
(نسرین نقاش)

جو بھی شہرے ہیں خون سے تر ہیں
ہر طرف غم زدہ سے پیکر ہیں
(نصرت چودھری)

بدلتی رُت کے تقاضوں سے تُو پریشان ہے
میں مطمئن ہوں خدا نے مزاج سادہ دیا
(رخسانہ جبین)

مخالف ساعتوں میں تجھ کو ہمدم کون رکھے گا
مری وادی ترے زخموں پر مرہم کون رکھے گا
(ترنم ریاض)

مذکورہ اشعار کو اضطرابِ زندگی کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔جن میں رنج و ملال کی کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے اور یہ کیفیت انھیں اپنے سماج کی سیاسی حالات سے ودیعت کی گئی ہے۔ یہ اشعار کشمیری قوم کی پستی کا احساس دلاتے ہیں اور قوتِ عمل کو اُبھارتے ہیں۔

مذکورہ بالا شعرا کے بعد اگر چہ ریاست کا گلزارِ ادب بہت کچھ خزاں دیدہ لگ رہا ہے، مگر پھر بھی اس کی افسردہ شاخوں پر چند شگفتہ و شاداب پھول کہیں کہیں اپنی بہار دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں، اب یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ آنے والے دور میں لوگ ان چند پھولوں کے رنگ و بو کو بھی مشامِ ادب کا سرمایۂ افتخار سمجھیں گے

اوران کی بقا کوغنیمت جانے گے۔ان میں اطؔہر بشیر،محتشمؔ احتشام،شبیہ الحسن قیصؔر،اقبال صدیقیؔ،یاسمینؔ سمبلی، غ۔غ۔عارفؔ،غضنفر علی شہبازؔ،امتیاز نسیم ہاشمؔی،روف راحتؔ،سبط رضاؔ،مقبول ساحلؔ،غلام نبی غافلؔ،سہل مہدیؔ،سلیم ساغؔر،ستیش ومؔل،وحید مسافؔر،امیر حسین شاؔد،شیخ خالد کراؔر وغیرہ ایسے نوجوان اور نمائندہ شاعر ہیں جن کی غزلیں نئے امکانات کا پتہ دیتی ہیں۔یہ بھی امید کی جاسکتی ہے کہ ریاست کے بزرگ شعرا کی بنائی ہوئی فنی عمارت موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرتی رہے گی۔

☆☆☆

حوالے

(1) ڈاکٹر مشتاق احمد وانی۔مضمون، جموں و کشمیر میں اردو شاعری 1947 کے بعد،مشمولہ۔ماہنامہ شیرازہ،جلد 52 شمارہ۔7۔6۔صفحہ 186۔ناشر۔جموں وکشمیراکیڈمی آف آرٹ،کلچراینڈلنگویجز۔سرینگر

(2) حامدؔی کاشمیری،حیات اورشاعری،مصرہ مریم۔صفحہ 11

(3) بلراج کومل،حامدی کاشمیری کی شاعری،مشمولہ،شاعر۔حامدی کاشمیری نمبر۔شمارہ۔010۔009

(4) مصرہ مریم،حامدؔی کاشمیری،حیات اورشاعری۔صفحہ نمبر 77

(5) شیرازہ کلچرل اکاڈمی،سرینگر جلد 24،شمارہ 3) مصرہ مریم۔صفحہ 82

(6) پریمی رامانی۔کشمیرکی اردوشاعری۔علامتوں کااستعمال اورلسانی برتاؤ،مشمولہ،شیرازہ جلد 2 نومبر،1983 نوجوان نمبر، شمارہ ۱۱۔صفحہ 45

(7) حکیم منظورؔ،فلیپ کی تحریر۔مجموعہ،صبح شفق،تلاوت

(8) پرتپال سنگھ بیتابؔ،مجموعہ۔خودرنگ،فلیب کی تحریر۔از۔پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ

(9) شمس الرحمٰن فاروقی،مجموعہ،پیش خیمہ،پرتپال سنگھ بیتاب،صفحہ 15

(10) فریدؔ پربتی کاشعری ارتقا،از۔قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی۔مشمولہ،رسالہ شیرازہ۔جلد 49۔صفحہ 13

(11) بلبلؔ کاشیری،خندۂ گل (شعری مجموعہ) مطبع۔شکتی کومپنی کیشنز،لاہور۔اشاعت،1987۔صفحہ 12

(12) رسالہ،بازیافت،دسمبر 2002۔صفحہ 117

(13) ہمدم کاشمیری،مجموعہ۔لہو دھوپ کی۔اشاعت 2003۔مطبع،اکشراگرافکس،دہلی۔صفحہ 15

﴾ماحصل﴿

اپنے مقالے ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو غزل کا فنی وفکری مطالعہ، 1947 کے بعد'' کا خلاصہ پیش کرنے سے قبل مجھے جاں نثار اختر کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے، غزل کا فن کیا ہے
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

ریاست جموں وکشمیر کو علمی وادبی نقطۂ نظر سے دنیائے ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہ سرزمین عرصۂ دراز تک صوفیوں، ریشیوں اور بزرگوں کا مرکز رہی ہے۔ ان شخصیتوں کے علمی وادبی کارنامے عالمی ادب کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ ان کے توسط سے سالہا سال تک یہاں علم وفضل کے چشمے بہتے رہے اور علم وعرفان کی بارش ہوتی رہی۔ ان کی تحریریں اور اشعار اس شہر کی فضا کو مترنم و مسحور کرتے رہے۔ ریاست جموں وکشمیر کی قدرتی فضا اور یہاں کے ادبی ماحول نے لوگوں کے دلوں میں علم وعرفان کا بہترین ذوق پیدا کیا ہے اور ان کے دلوں میں جذبہ انسانیت ومہر وفا کو مستحکم کیا ہے۔

آج ایک طرف اس شہر کی داستان عہدِ پارینہ کے شکستہ نقوش اپنی زبانِ حال سے بیان کرتے ہیں تو دوسری جانب ادیبوں اور شاعروں کے شہ پارے محققین اور دلدادگانِ ادب کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر میں اردو شاعری کے ابتدائی نقوش ہمیں یہاں پر فارسی دور سے ہی ملنے لگتے ہیں۔ لیکن 1889 میں جب مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اردو کو سرکاری زبان بنانے کا حکم جاری کیا۔ اس کے بعد یہ شہر اردو ادب کا مرکز بنتا گیا اور اس طرح انیسویں صدی میں یہ سرزمین علم وادب کے درخشندہ ستاروں سے جگمگاتی رہی۔

ریاست جموں وکشمیر کی غزلیہ شاعری پر غالب ترین رجحان جدیدیت کا نظر آتا ہے۔ اردو ادب میں

جدیدیت کا اطلاق 1960 سے شروع ہوتا ہے۔اگر چہ اس کے ابتدائی نقوش ہمیں ریاست جموں وکشمیر کی ابتدائی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں،لیکن تقسیم ہند کے المیے نے اس رجحان کواور زیادہ بڑھاوا دیا۔اس دور میں سائنسی اور مشینی معاشرے نے انسانیت کے چہرے کو مسخ کر دیا تھا۔جس نے ہمارے شعرا کے اندر تنہائی، بے چینی، بے یقینی،شکست وریخت کے احساسات کواور زیادہ اُبھارا۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری اردو غزل جو آج تک صرف انسان کے خارجی احساسات کی ترجمان تھی وہ اب داخلیت کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ہندوستان کی فکری،نفسیاتی اورتہذیبی زندگی میں جو تبدیلیاں آرہی تھیں اُن کی گہری پرچھائیاں ریاست کے شعری مزاج پر بھی پڑتی رہیں۔یہاں کے شعرا مختلف عصری رجحانات کی حسبِ توفیق نمائندگی کرتے رہے اوراپنے فعال ذہن اورعصری آگہی کا ثبوت دیتے رہے۔

ہندوستان کا شاید ہی کوئی باشندہ ایسا ہوگا،جو تقسیمِ وطن کے المیہ سے بیگانہ ہوسکتا ہے۔14 اور 15 راگست 1947 کو دو بہنیں (پاکستان اور ہندستان) کچھ اندرونی تقاضوں کی بنا پر دوالگ الگ گھر بسانے پہ مجبور ہوئیں،مگر ساتھ ہی ریاست جموں وکشمیر کو بھی دو حصوں میں منقسم کرنے پر آمادہ ہوگئیں۔ریاست کے ایک حصے پر پاکستان نے قبضہ جما لیا اور دوسرے حصے پر ہندوستان قابض ہوا۔تب سے لیکر آج تک کشمیر میں ان دونوں ممالک نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر انسانی حقوق کی پامالی کا ایسا سلسلہ جاری رکھا ہے جو آج تک تھمنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ایسے حالات میں ایک حساس انسان کا جگر کانپ اُٹھتا ہے۔تقسیمِ ہند کے بعد ریاست میں جو حالات رونما ہورہے تھے،اُس کا براہِ راست اثر یہاں کے ادب پر بھی پڑا۔ریاست کے شعرا کے کلام میں جگہ جگہ سیاسی غلامی کے خدوخال نظر آتے ہیں۔ان شعرا نے صحیح معنوں میں اپنے وطن کے حالات وواقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے،ساتھ ہی روزمرہ زندگی کے مسائل کواپنی شاعری کے ذریعے اُجاگر کیا ہے۔

جموں وکشمیر میں جن شعرا کے مزاج کی انفرادیت 1960 سے پہلے کے دور میں تشکیل پائی۔ساتھ ہی مکانی اعتبار سے ملک گیر شہرت پائی اور زمانی لحاظ سے اردو شعر وادب کی تاریخ کے اوراق پر اپنے نام وکام کی مہر ثبت کی ،اُن میں میر غلام رسول نازکیؔ ،رساؔ جاودانی،شوریدہؔ کاشمیری،عابدؔ مناوریؔ،قیصر قلندرؔ،شہ زورؔ کاشمیری،غ۔م۔طاؤس،کشمیری لال ذاکرؔ،سیفی سوپوری،ہیمراجؔ ٹھپہ ہیرانگری،اشتیاق خورشید کاظمیؔ،سید فطح حسین شاہ کاظمی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ایسا کہنا بھی ٹھیک نہیں ہوگا کہ انہوں نے صرف غزلیں لکھی ہیں بلکہ ان میں سے کچھ نے نظم نگاری،قطعہ نویسی،رباعی گوئی وغیرہ میں بھی قابلِ قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔لیکن ان کی غزلیں نہ صرف معیار واقدار میں ان کے دوسرے کلام کے برابر ہیں بلکہ اردو شاعری میں اپنی فکری وفنی خوبیوں کی وجہ سے قابلِ مطالعہ بھی ہیں۔

ان شعرا کی ابتدائی دور کی غزلوں میں روایت اور تقلید کے اثرات دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔اصل میں انہوں نے مکمل طور پر اپنے وجود کے تقاضوں کو پہچان نہیں لیا تھا۔تاہم اس دور کی شاعری میں بھی ان کے جذبات کی سچائی کا احساس ہوتا ہے۔ان کی شاعری میں ایک ایسے شخص کے خدوخال صاف اُبھرتے ہیں جو ایک کشمیری النسل انسان ہیں۔جو کشمیری ماحول میں پلے بڑھے ہیں اور جن کے لہو میں کشمیر کا حسن،وہاں کے لوگوں کی سادگی،صبر،محبت،ہمدردی اور انسان دوستی رچی بسی ہوئی ہے۔ان شعرا نے اپنے شعری سفر کی ابتدا میں کچھ دیر ادھر اُدھر بھٹکنے کے بعد اپنی ذات سے رشتہ قائم کیا ہے اور ان کی ذات ان کے لئے ایک مستقل سرچشمۂ فیضان بن گئی۔دراصل ان کی ذات قدیم کشمیری زندگی کی قدروں سے سیراب ہے۔ساتھ ہی یہ جدید کشمیر کی تبدیلیوں اور جدتوں سے بھی آگاہ ہیں۔اس طرح ان کی شخصیت قدیم وجدید کی آمیزش کا نمونہ ہے۔یہاں میں چند شعرا کے کلام سے مثالیں دینا ضروری سمجھتا ہوں۔تاکہ قاری کو اس دور کی غزلیہ شاعری کا ادراک حاصل ہو۔

اس دور کے کچھ شعرا روایت کے بہت حامی رہے ہیں۔جن میں عابدؔ مناوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔عابدؔ مناوری کے اشعار بڑے خوبصورت ہیں۔لیکن ان میں خیال بھی محدود ہے،ساتھ ہی اندازِ سخن میں بھی نہ پھیلاؤ کا کوئی امکان ہے اور نہ کسی تقلید کا۔اصل میں عابدؔ عشق و محبت کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ایسا کہہ سکتے ہیں کہ وہ عشق و محبت کے ہی شاعر تھے۔کہیں وہ اپنی زبونی بخت اور شوخیِ حشمت کا گلہ بھی زبان پر لے آتے ہیں اور محبوب کی بے اعتنائی کی شکوہ سنجی کرنے لگتے ہیں۔

سب کے ہونٹوں پہ تیرے جور کا شکوہ ہوگا
دیکھنا حشر کے دن حشر تیرا کیا ہوگا

غ۔م۔طاؤسؔ ریاست کے ایک اہم شاعر ہیں۔ان کے ابتدائی دور کی شاعری 1944 سے قبل تخلیق کردہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہیں جو بنیادی طور پر ان کی طالبِ علمی کے دور کی شعری کاوشوں کا نتیجہ ہے۔جس میں طاؤسؔ کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا پَرتو نظر آتا ہے۔طاؤس نے وارداتِ قلبی کے ساتھ عنفوانِ شباب کے جذبات وخیالات کو بھی بیان کیا ہیں۔

پھر بہار آئی دلوں میں ولولے پیدا ہوئے
دیکھئے کن کن تمناؤں کا ہو جاتا ہے خون

طاؤسؔ کا یہ شعر اردو کے کلاسکی شعرا کے رنگِ سخن کی آبیاری کرتا ہے۔خواجہ میر دردؔ کا یہ شعر دیکھئے۔

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر، اُودھر چلے

میر دردؔ کے اس شعر میں درد وغم کا جذبہ کارفرما ہے۔یہ وہ دور تھا جب دنیا کی تمام خوبصورت چیزیں ایک شاعر کی آنکھوں کے سامنے تھیں،لیکن دوسری جانب کشمیر کے لیے یہ دور عظیم بربریت سے کم نہ تھا۔لوگ مہاراجہ کے ظلم و جبر سے تنگ آچکے تھے۔اس لئے طاؤسؔ کے پاس موت کی ہمہ گیری اور دنیا کی بے ثباتی کا

ذکر کرنا ضروری تھا۔

کشمیری لال ذاکرؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی ہے۔ذاکرؔ کے ہاں کلاسکی شعرا کے رنگِ سخن کی آبیاری ملتی ہے، ساتھ ہی نئے عہد کے شعور اور نئی تحریکات کے اثر نے ان کی غزلوں کو فکر و اسلوب کے اعتبار سے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ ذاکرؔ کے کلام کی سب سے بڑی خاصیت، زبان کی سلاست اور بیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ فہم و فراست کی کارفرمائی ہے۔انھوں نے عصری حسیت کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ذاکرؔ کا حسنِ بیاں بڑا انرالا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

میں وہ آنسوں جو سلگتا ہی رہا پلکوں پر
کسی دامن پہ، کسی گال پہ ٹپکا ہی نہیں

ہم اُجالے ہیں سرِ شام ہی کھو جائیں گے
ہم اُجالوں کو کسی آنکھ نے دیکھا ہی نہیں

ان اشعار میں ایک طرح کا تسلسل ملتا ہے۔اس کے باوجود غزل کے آرٹ کے مطابق یہ اشعار معنی و مفہوم کے اعتبار سے اپنی جگہ مکمل ہیں۔ یہاں تنہائی و بے چینی کے ایسے مربوط سلسلے دکھائی دیتے ہیں جہاں شاعر ایک ایسے غم میں گرفتار ہوتا ہے جو غم کسی اور کو کہنے کے لائق نہ ہو۔ یہ بنیادی طور پر ایک حساس دل کی فریاد ہے۔آگے دیکھئے۔

نظر اُٹھا کے انھیں ایک بار دیکھ تو لو
ستارے پلکوں پہ ہم نے سجا کے رکھے ہیں

کریں گے آج کی شب کیا، یہ سوچنا ہوگا
تمام کام تو کل پر اُٹھا کے رکھے ہیں

بظاہر یہ دو الگ الگ شعر ہیں، لیکن ان میں ایک طرح کی اندرونی وابستگی پوشیدہ ہے۔ دونوں اشعار کا منبع رائگاں کا وہ احساس ہے، جو محبت اور زندگی سے وابستہ شاعر کی توقعات کی شکست کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ پہلے شعر میں شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے، جس کے لیے اس نے اپنی آنکھوں میں جو خواب سجائے تھے۔ اُن سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آنسوؤں کے ان ستاروں کی طرف ایک نظر دیکھ لینے کی التجا کرتا ہے۔ جنھیں ان ٹوٹے ہوئے خوابوں کی جگہ اس نے اپنی پلکوں پہ سجا رکھا ہے۔ شاعر کے لہجے میں جو حسرت ناکی ہے وہ صاف ظاہر کرتی ہے کہ اس کی یہ التجا بھی بیکار جائے گی۔

دوسرے شعر میں رائگانی کا یہ احساس اور شدت اختیار کر گیا ہے۔ یہاں زندگی کی ساری مصروفیات، ساری چیزیں شاعر کے لیے اپنی فوری کشش کھو چکی ہیں۔ وہ انھیں آنے والے کل پر ٹالتا رہتا ہے۔ لیکن لمحۂ رواں کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ مثلاً، اپنی استقامت کے لیے کسی استغراق کی تلاش اور جب یہ لمحۂ رواں اُبھر کر ایک طویل سیاہ رات کی شکل اختیار کرتا ہے، تو اس کے اقتضا کو یکسر رد کر دینا مشکل ہوتا ہے۔

ذاکرؔ کی شاعری کا امتیازی پہلو یہی ہے کہ ان کے کلام میں خیالات اور مواد کی یکسانیت بدرجۂ اتم موجود ہے، مگر باوجود اس کے یہ اشعار الگ الگ اثرات کے حامل نظر آتے ہیں۔ آگے دیکھئے۔

خلوص، درد، محبت، وفا، رازداری
یہ نام ہم نے کسی آشنا کے رکھے ہیں

اس شعر میں انسانی زندگی کے مختلف پہلو، ہمارے ٹھوس، مالی و عملی اقدار اور جمالیاتی اقدار کا بہترین

امتزاج ملتا ہے۔ندرت بیانی اس شعر میں توجہ طلب ہے۔لیکن اصل خوبی اس بلیغ اشارے میں پیوستہ ہے کہ ہمارا ''آشنا'' وہی ہوگا جو ہماری ان خواہشات پر پورا اُترتا ہو۔وجود مادی کا وہ ڈھانچہ ان تصورات پر پورا اُتر سکے گا،جس میں،خلوص ہو،محبت ہو،وفا ہو،راز داری ہو۔اُسی کی آشنائی زندگی کی معنویت کو اور زیادہ دوبالا کر سکتی ہے۔

تمہارے در کے سوالی بنیں تو کیسے بنیں
تمہارے در پہ تو کانٹے اَنا کے رکھے ہیں

''اَنا''(Ego) غیرتِ عشق کا ایک جزوِ عظیم ہے۔محبوب میں اگر ''اَنا'' نہ ہو تو محبت کی صعبتوں کا اندازہ لگا نا مشکل ہو جاتا ہے۔لیکن محبت کی اصل معراج خود سپردگی میں پوشیدہ ہے۔خود سپردگی عاشق اور معشوق کے درمیان حائل تمام پردوں کو ہٹا دیتی ہے اور عاشق اپنے محبوب کے لیے اس حد تک جاتا ہے۔

مجھ میں جو کچھ اچھا ہے سب اس کا ہے
میں نے جو کچھ لکھا ہے سب اس کا ہے

مری یہ تازہ کہانی بڑی پرانی ہے
خیال میرا ہے لیکن جمال اس کا ہے

اب سیفؔی سوپوری کے اندازِ بیاں پر روشنی ڈالتے ہیں۔وہ ایک عام خیال کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔سیفؔی کے کئی اشعار میں داخلیت کے بجائے خارجی اثرات نمایاں ہیں۔انہوں نے ایک اصولی بات کہی ہے لیکن سادگی کے ساتھ اور جس سے قاری کے دل و دماغ پر کوئی غم آفریں نقش مرتسم تو نہیں ہوتا بلکہ ایک انسان کا ذہن دنیا کے مساوی پہلو کی طرف لے جانے کی اچھی مثال ہے۔

کیا میرؔ کے انداز کا دعویٰ تھا کسی کو
جو لوگ یہاں آئے تھے سب اہلِ زباں تھے

اگر دیکھا جائے تو ''خدائے سخن'' کا دعویٰ کرنے والے سر پھرے بہت ملیں گے، مگر حقیقت تو یہی ہے کہ تیشۂ فن لے کر دودھ کی نہریں نکالنے والے فرہاد کم ہی نظر آتے ہیں۔

ریاستی شعرا اگرچہ زندگی کے کچھ معاملات میں ناکام ونامراد ہی رہے ہونگے لیکن وہ عام قنوطیوں کی طرح غم کھا کر دنیا کی لذتوں سے محروم نہیں رہنا چاہتے، بلکہ غم سے ایک نیا حوصلہ پاتے ہیں۔ان کی شاعری صحیح معنوں میں ایک دُکھے دل کی پکار ہے۔ان کی زندگی غم سے پُر ہے اور غم ان کے لیے زندگی کی ایک اہم ترین حقیقت سے عبارت ہے۔انسانی زندگی سے غم کا جزو اگر نکال دیا جائے،تو زندگی بے معنی سی بن جاتی ہے۔اس اعتبار سے غم بنی نوع انسان کے لیے ایک قیمتی اَثاثہ ہے اور غم کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔میر غلام رسول نازکیؔ کے یہاں غم کا یہ تصور اتنا شدید ہے، کہ ان کے نزدیک غم ہی بندہ ومولا میں ''وجہ ارتباط'' یعنی Affinity ہے اور روح کی بالیدگی کے لیے صرف ''دلِ اندوہ گیں'' یعنی sorrowful spirit کی ضرورت ہے۔اسی لیے لکھتے ہیں۔

غم میانِ بندہ و مولیٰ ہے وجہِ ارتباط
باعث قربِ خدا ہم پایۂ روح الامین

غم کو تونے کیا سمجھ رکھا ہے میرے ہمنشیں
روح کو شاداب کرتا ہے دلِ اندوہ گیں

شاعر اپنے سماج کا حساس ترین فرد ہوتا ہے، وہ اپنے سماج میں رونما ہونے والے حالات وواقعات

کا اثر دوسروں کے مقابلے میں جلد قبول کرتا ہے۔ان حالات سے واقف ہونے کے لیے وہ چلتے پھرتے انسانوں کی دنیا میں سانس لینے پر مجبور ہے۔تخیل کی کھوکھلی بلند پروازوں کے سہارے سے اب چھپروں میں رہنے والوں کو ڈائنگ روم کے خواب نہیں دکھائے جاسکتے ہیں۔نازکی ادبیات (Literature) کے اس علامتی رجحان (symbolic trend) سے نظر نہیں چراتے ہیں، بلکہ اپنے سماج کو اور قریب سے دیکھتے ہیں۔

بغض و عداوت، رشک و رقابت، آپا دھاپی، چیخ پُکار
ابلیسوں کے چیلے چانٹے، شیطانوں کے برخوردار!

مذکورہ شعر میں عصری حسیت کا بیان زیادہ وسعت کا حامل ہے۔پرانے سماج میں بغض، عداوت، رشک، رقابت، آپا دھاپی، چیخ و پکار جیسے بُرے اور شیطانی خصائل شاذ و نادر ہی ملتے تھے، لیکن موجودہ دور کے انسان نے ان تمام خصائل کو اپنے اندر اس طرح پیوستہ کر کے رکھا ہے، کہ وہ اب انھیں چیزوں سے پہچانا جاتا ہے۔شاعر نے اس طرح کے لفظیات سے اپنے سماج میں پھیلی برائیوں کا نقشہ کھینچا ہے، جو شاعر کی وسعتِ نظر کا خاصہ ہے۔

1960 کے بعد کا دور، اس دور کی بشارت لے کر آتا ہے، کہ جب ایک شاعر کا مرکزِ نگاہ اپنے عروج کو پہنچا تھا۔اس کا اندازِ بیاں، اس کی تشبیہیں واستعارے اور غور وفکر کا انداز سب کچھ بدل گیا تھا۔ساتھ ہی فن میں سادگی وسلاست کے علاوہ، خوش اندازی، رنگینی و پُر کاری بھی پیدا ہوئی۔لیکن ان خصوصیات کو صرف الفاظ کی بازی گری نے پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اس میں ان کے تخیل کی جادوگری کا بڑا دخل ہے۔ریاستی شعرا نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بات کی ہے۔زندگی کے ان پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے وہ جذبات کے چشمے ہی نہیں بہا لیتے ہیں، بلکہ ان تمام باتوں کو فکری اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔جس سے ان کے

خیالات میں محض تہدید یعنی للکار کا آہنگ ہی نہیں بلکہ غور وفکر کے عناصر بھی موجود ہیں۔ان شعرا نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو فکر وشعور کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے زمانے کی آواز کو اپنی آواز بنا کر پیش کیا۔اس طرح اپنی ذات کے اظہار کے ساتھ ساتھ زمانے کی کج ادائی،سماجی نا برابری، بے راہ روی وغیرہ جیسے موضوعات پر لکھنے لگے۔یہ شعرا شخصی سطح پر شعور اور لاشعور کے عمل اور ردِعمل کے تحت نا یاب اور رواں دواں تجربوں کی تخلیقی باز آفرینی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، ساتھ ہی ان کے یہاں صنائع بدائع کی جادوگری کے بجائے فکر کی گہرائی ملتی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے شعرا کی زندگی ناکامیوں اور حسرتوں میں گھری ہوئی ہے۔ان کی شاعری میں یہ خاص رنگ ایک جذبے میں ڈھل کر سامنے آتا ہے،لیکن یہ افسردگی اور یہ غم انھیں رجعت پسندی اور قنوطیت کی طرف نہیں لے جاتا ہے، بلکہ اس کے ذریعے سے یہ جینے کا ہنر سیکھتے ہیں۔انھیں اس چیز کا یقین ہے کہ غم کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔جس طرح ہر اندھیری رات کے بعد صبح آجاتی ہے۔ٹھیک اُسی طرح ہر غم کے بعد خوشی آنے والی ہے۔نیچے چند اشعار دیکھئے،جن میں کسی بھی طرح کی مبالغہ آمیزی نہیں ملتی ہے بلکہ سچائی اور خلوص کے ساتھ ان مضامین کو برتا گیا ہے۔

اسی یقین پر زندہ ہے خوش گُمانِ وفا
جو سر پہ ہجر کا بادل ہے، چھٹ بھی سکتا ہے
(خالدؔ بشیر احمد)

دل ہم کو داغ داغ ملا پھر بھی ہم جیئے
محرومیوں کا باغ ملا پھر بھی ہم جیئے
(تنویرؔ بھدرواہی)

اس لیے کھائی نہیں گردشِ دوراں سے شکست
یہ بھی کیا کم ہے کہ جینے کی ادا ہے مجھ میں
(عرشؔ صہبائی)

مذکورہ اشعار کو پڑھ کر جہاں ان شعرا کی زندگی درد وغم کی لہر میں ڈوبتی ہوئی نظر آتی ہے، وہیں ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر کے موضوع پر تخلیق ہونے والی غزلوں میں اُمید اور رجائیت Hopefulness کا رنگ غالب ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مزاحمتی رویے نے تھکاوٹ اور یاسیت کے بجائے لوگوں کے مزاج میں استقلال کی فکری روایت پیدا کردی ہے، جس نے شعری فکر کے لیے مہمیز کا کام کیا ہے۔اس خطے سے وابستہ شاعر پُر اُمید ہیں کہ جبر واستحصال کی قوتیں بہت جلد اپنے انجام کو پہنچنے والی ہیں۔یہاں یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ شعرا غم سے زندگی کو گوارہ بنانے کا فن جان گئے ہیں۔ایسا نہیں کہ وہ زندگی سے بالکل ہی مایوس ہوگئے ہیں بلکہ موت ان کے لیے حیاتِ نو بن گئی ہے، زندگی سے انھیں محبت ہے اور وہ اسے جینا چاہتے ہیں۔

ریاستی شعرا نے اپنے وطن کی سیاسی غلامی کے ظلم و جبر اور اس کے نتیجے میں یہاں کے نوجوانوں کا عین دورِ شباب میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا اظہار بھی کیا ہے۔پوری دنیا ارضِ کشمیر کی سیاسی غلامی سے واقف ہے۔یہ وہ بستی ہے جہاں ہر یعقوب سے اس کا یوسف رخصت ہو چکا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت یعقوب کا بیٹا یوسف ایک دن لوٹ آیا۔لیکن اس بستی میں ہزار ہا یوسف گُم ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی نہیں آتے۔اس سرزمین کا ہر شخص صحرا میں بھٹکے ہوئے اس مسافر کی طرح ہے، جسے دور دور تک کہیں زندگی نظر نہیں آتی ہے۔اس سلسلے میں شہباز راجوروی کا یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

وہی حالات کا صحرا مسافر
یہاں خضر ہی اُترا نہ ہوگا

''خضر'' کے ایک معنی سبز یا ہرا رنگ کے ہیں۔یعنی اس سرزمین میں کبھی بہار نہیں آئی ہے۔''خضر'' کے دوسرے معنی ایک فرشتہ صفت انسان کے ہیں،اس انسان کا گزر صرف صحراؤں سے ہوتا ہے۔جس انسان سے اس کی ملاقات ہوتی ہے،اُسے لمبی عمر عطا کی جاتی ہے۔لیکن شاعر کہتا ہے کہ میرے وطن سے کبھی اس بزرگ کا گزر ہی نہیں ہوا ہے۔ایک اور شاعر خورشید بسملؔ کا یہ شعر دیکھئے۔جس میں شاعر کی قلبی کیفیت کا اظہار ہوا ہے۔

چاند سورج مرے کوچے میں کبھی آئے نہیں
غالباً اس شہر کی ہیں ساری تعمیریں غلط

ریاستی شعرا کے کلام میں سوز اور درد ہے اور متاعِ درد اس لیے بھی ان کے مقسوم ہو گئی کہ جس بد نصیب خطۂ ارض سے یہ تعلق رکھتے ہیں وہاں کی عوام کئی دہائیوں سے ظلم و جبر کی چکی میں پس رہی ہے۔اس طرح ان کا معاشرہ ایک خستہ مزار کی مانند ہے۔اس معاشرے میں انصاف کی باتیں کرنا فضول ہے، یہاں کے منصف گھمنڈی ہیں، یہاں ہر وقت محشر سا سما چھایا رہتا ہے، یہاں کا آسماں ہر وقت سیاہ چادر اوڑھے رہتا ہے،اس شہر کے آسماں کی اُفق ہر شام کو لال ہوتی ہے کیونکہ یہ وہ شہر ہے، جہاں ہر دن کسی نہ کسی بے گناہ کا قتل ہو ہی جاتا ہے۔اب جہاں ایسا سماج ہو وہاں کے ادب میں لب و رخسار کی باتیں کھوجنا فضول ہے۔وہاں مقتل کے قصوں اور دَھار کی باتوں کا ملنا بجا ہے۔کیونکہ ادب ہوتا ہی ہے اپنے سماج کا آئینہ!اپنے اس دعوے کے سلسلے میں چند شعری مثالیں ملاحظہ ہوں۔

نظر میں جو بھی ہے منظر، غُبار جیسا ہے
مرا معاشرہ خستہ مزار جیسا ہے
(عرشؔ صہبائی)

مدتوں سے کوئی محشر سا بپا ہے مجھ میں
میں سمجھ پایا نہیں ہوں کہ یہ کیا ہے مجھ میں
(عرشؔ صہبائی)

یہ کون سی کدورتیں ہیں شہر کی نگاہ میں
ہمارے گھر کے آئینے خراب ہو کے رہ گئے
(شیبؔ رضوی)

مذکورہ اشعار ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں، جس میں زندگی ریزہ ریزہ اور کٹی پھٹی ہے۔اس معاشرے کو کسی ایسے مسیحا کی تلاش ہے جو اس کے زخموں کا مداوا کر سکے اور اس کا تار تار دامن بھی سی سکے۔ان اشعار کا لہجہ کہیں کہیں غیرت منداور کھردرا بھی ہے اور یہ عمل ان کے ذاتی تجربوں کا نتیجہ ہے، جس میں مانوس اجنبیت، بیان کا حسن اور زبان کی توانائی شامل ہے۔ایسے مضامین کے برتاؤ میں ان شعرا نے سلاست اور نغمگی کا خیال رکھا ہے،ٹوٹتے رشتوں کا کرب، ذاتی اور داخلی ہیجان اور ان سے پیدا شدہ اذیتیں ان کی شاعری کو نیا پن بخشتی ہیں۔چنانچہ اس اعتبار سے ریاست کی غزل میں اپنے اردگرد کے ماحول کی عکاسی پوری طرح موجود ہے اور جو نئے تقاضوں اور شعور کی ترجمان ہے۔ایسے مضامین کو وہی انسان جنم دے سکتا ہے جو کربناک حالات سے خود گزرا ہو، جس نے مصیبتیں دیکھی اور سہی ہو، جس انسان کی زندگی ہر وقت توپوں کے سائے میں رہتی ہو، اگر وہ ان چیزوں کو بیان نہ کرے گا، تو کون کر سکتا ہے۔ یہاں مجھے ریاست کے ہی ایک شاعر عرشؔ صہبائی کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

اُسے پڑا ہی نہیں واسطہ مصائب سے
اسی لئے وہ غموں کا مزاج داں بھی نہیں

یعنی جس شخص نے مصیبت نہ دیکھی ہو، وہ دوسروں کے درد کو محسوس نہیں کر سکتا ہے۔ان اشعار میں تنہائی اور اجنبیت کا جو احساس پنہاں ہے، وہ صرف جدید دور کی دین ہے۔اس طرح ان شعرا نے اپنے دور کے حالات کے ساتھ ساتھ جدید دور کے شعری تقاضوں کو بھی پورا کیا ہے۔

ریاستی شعرا نے اپنے تخیل سے تشبیہات، استعارات و اشارات کی ایک نئی دنیا پیدا کی ہے جو کہ رمزیت کی شان کو دوبالا کر دیتی ہے اور جذبے کی بے ساختگی کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذاتی تجربوں کو ایک عام انسان کا تجربہ بنا دیا ہے۔ان شعرا کی استعمال کردہ تشبیہات و استعارات میں ایک طرح کی ندرت پائی جاتی ہے۔یہاں پر صرف جمالیاتی استعارہ کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

لے آئیں الفاظ و معانی میٹھی باس
رمز کی خوشبو چشمِ غزالہ دے جائے
(صآبر مرزا)

اس شعر میں ''میٹھی باس''، ''رمز کی خوشبو'' اور ''چشمِ غزالہ'' تینوں شعری و جمالیاتی استعارے ہیں اور جمالیاتی معنویت کے مظہر ہیں۔اس کے علاوہ ان شعرا کے ہاں بڑی دلکش تشبیہات ملتی ہیں۔ایک اور مثال ملاحظہ ہوں۔

اپنی آنکھوں میں رکھو برف کی کاشیں محفوظ
کہیں رستے میں دہکتا ہوا منظر ہوگا
(سید رضآ)

اس شعر میں شاعر نے ''برف کی کاشیں'' اور ''دہکتا ہوا منظر'' جیسی تراکیب استعمال کر کے کشمیر کے spirit یعنی ''روح'' کو غزل میں سمونے کی کوشش کی ہے اور اپنی جڑوں سے گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں 1980 کے بعد جن شاعروں نے غزل کی مانگ ستاروں سے بھردی۔اُن میں حامدؔی کاشمیری،حکیم منظوؔر، رفیق رازؔ، پرتپال سنگھ بیتابؔ،سلطان الحق شہیدؔی، ہمدؔم کاشمیری،فرؔید پربتی شفقؔ سوپوری اور بلبلؔ کاشمیری وغیرہ کی شعری کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔یہ چند نام اس لحاظ سے اہم ہیں کہ انھوں نے ایک تو اس دور میں اردوغزل کی آبیاری کی ہے، ساتھ ہی یہ شعرا ذہنی عیاشی کے بالکل خلاف ہیں۔ان شعرانے زندگی کے ساتھ ساتھ فن میں بھی اخلاقی قدروں کا پاس ولحاظ رکھا ہے جس کا واضح ثبوت عریانیت سے پاک ان کی شاعری ہے۔انھوں نے روایت سے منہ نہیں موڑا بلکہ روایت سے رشتہ قائم رکھتے ہوئے حال میں زندگی گزارنے کی کوشش کی ہے،اس طرح ادب میں نمایاں تبدیلی لاتے ہوئے جدید حسیت اور جدید رجحانات کواپنا کرادب کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔اس دور کے شعرا کی شاعری محض تقلید نہیں بلکہ نئے الفاظ وتراکیب اور نئے مضامین کی حامل ہے۔اس دور کی شعری تاریخ میں حامدؔی کاشمیری کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ان کے کلام کی چاشنی اورتخیل کی بلند پروازی نے خاصا اثر چھوڑا ہے۔حامدؔی کی شاعرانہ شخصیت حساس اور مفکرانہ ہے۔ان کی شاعری میں موجودہ دور کی حشر سامانیوں کا اظہار ایک مختلف زاویے سے ہوا ہے۔حامدؔی کے یہاں غزل کا لسانی نظام بے حد منفرد ہے۔وہ الفاظ کی معنوی جہتوں سے آشنا ہے اورفنی اعتبار سے ان کے ہاں تازگی اور جمالیاتی سادگی کا احساس ہوتا ہے۔ان کے کلام سے یہ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کر گئے دفن کالے سایوں میں
تنگ گلیوں کے زرد بوڑھے مکاں

مذکورہ شعر میں دو الفاظ ''سیاہ''یعنی'' کالا'' اور'' زرد''یعنی'' پیلا'' کا استعمال ہوا ہے۔ جہاں'' سیاہ '' ہولناکی کی صفت ہے اور'' زرد'' دل شکستگی کی علامت ہے۔اس دور کے مزاج کو رنگوں کی مناسبت سے پیش کرنے میں حامدؔی نے اچھی کوشش کی ہے۔

حامدؔی کو جدید علوم وافکار اور آگہی کی آسیب زدگی کا بھی احساس ہے کہ کس طرح اس نے معاشرے کے نظام کو بکھیر دیا اور فرد کو لاعلمی کے صحرا میں خود آگہی کا کرب برداشت پر مجبور کر دیا۔

ہر ایک شخص کی آنکھوں سے روشنی لے لی
بڑا کریم تھا سورج یہ کام کر کے گیا

اب شاعر خارجی دباؤ سے افسردہ ہو کر اپنی ذات کی طرف رجوع کر کے اپنے آبائی اور ماقبل تاریخ کے جنگلی انسان History of Nudity سے اپنے ربط کی تجدید کرتا ہے۔

وہ لوگ مجھ سے گلے مل کے دیر تک روئے
بدن پہ بال تھے ان کے کوئی لباس نہ تھا

موجودہ دور کا انسان خود کو غیر محفوظ تصور کرتا ہے۔اس کے اندر جو ڈر اور خوف ہے، اس کا اظہار وہ اپنے کلام میں کرتا رہتا ہے۔حامدؔی کے یہاں بھی اس طرح کے موضوعات ملتے ہیں۔لیکن وہ ان موضوعات کو اس طرح باندھتے ہیں کہ یہ تازہ دم ہو جاتے ہیں۔اس تعلق سے ان کے تیسرے شعری مجموعے ''لاحرف'' کا یہ شعر دیکھئے۔

روکو نہ میرا رستہ سر سبز جنگلو
میں دست و پا شکستہ ہوں، پیچھے غنیم ہے

خوف اور دہشت نے تمام احساسات کو گھیر لیا ہے۔زندگی غیر محفوظ ہے۔اسے بچانے کے لیے انجان راستوں کی طرف دوڑنا پڑتا ہے۔لیکن کیا غنیم یعنی دشمن پیچھے سے ہی وار کرے گا، کیا وہ آگے سے حملہ

نہیں کرسکتا ہے۔کیا اس شعر میں سیاسی حالات پوشیدہ نہیں ہوسکتے ہیں۔حامدؔی کو معلوم ہے کہ عصری حسیت کا منظوم اظہار شاعری نہیں ہے، بلکہ ان کی شاعری میں حیرت (astonishment) ڈر اور اندیشہ کے جو نظارے ملتے ہیں، ان کی حیثیت خالص تخلیقی ہے اور انسان کے اندر کی بے چینی کی پیدا کردہ ہے۔

آج انھیں پہلی بار دیکھا ہے
کون ہیں یہ بھلا کہاں کے ہیں

ایک اچھے شاعر کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے وسیع مطالعے کی بنیاد پر علم کی بے پایاں وسعتوں کا مالک ہوتا ہے۔وہ نہ صرف اپنے ماضی اور حال سے جُڑا ہوا رہتا ہے بلکہ اس کے سامنے فکر و فن کی ایک بے پایاں دنیا آباد ہوتی ہے۔اس لیے اس کے یہاں مستقبل بھی تصور بن کے ماضی اور حال کی طرح اشہبِ فکر کو مہمیز کرتا رہتا ہے اور اس طرح ماضی اور حال کے علم و آگہی کی روشنی میں مستقبل کی تصویر کشی کرتا ہے۔حامدؔی کے یہاں بھی بعض ایسے تجربات ملتے ہیں جنہیں شاعر کی اپنی مٹی سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔مثلاً

بلڈنگیں، شوکیس، ننگی عورتیں، وحشی ہجوم
خوب سو لیتے تھے ہم بھی یہ نگر ایسا نہ تھا

اس شعر میں استعمال شدہ الفاظ بلڈنگیں، شوکیس، ننگی عورتیں اور وحشی ہجوم کو پڑھ کر اگر ہم شاعر کے سماج پر نظر دوڑائے تو وہاں ہمیں ایسی چیزیں نظر نہیں آئیں گی۔ان اشعار میں شاعر ذاتی سطح سے اُوپر اٹھ کر ایک ایسی آفاقیت پیدا کرتا ہے جس کا تصور ایک عام ذہن رکھنے والا انسان نہیں کرسکتا ہے۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ حامدؔی نے خودشناسی سے دنیا شناسی تک کا سفر طے کیا ہے۔

حکیم منظورؔ کی شاعری میں کشمیر کا ذکر ان کی شاعری کو مقامی نہیں بنا دیتا بلکہ زمین و زماں کی حدود سے لازمینی اور لازمانی کیفیات و محسوسات تک کے سفر پر محیط محسوس ہوتا ہے۔انہوں نے کشمیر کی تہذیب و ثقافت

سے وابستہ کئی مخصوص تراکیب اور الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، جن میں روؤف یعنی (کشمیری گیت) نمکین چائے، کانگڑی، سروصنوبر کے قد آور پیڑ، وغیرہ پیش کیے جاسکتے ہیں۔اس طرح ان کی شاعری کشمیر کی سیاسی و سماجی زندگی کا عکس ہے۔

ہوا ہی نہ بولے تو میں کیا کہوں
لہو لمس ہوتے ہیں کیسے چنار

اس سرے سے اُس سرے تک مختلف رنگوں کا جھمگٹ
سیب اس بازار میں اپنی نشانی چاہتا ہے

تازہ دم نمکین چائے کانگڑی ہنستی ہوئی
برف، گُل بُو قہقہے، پھر مدعا کیا پوچھنا

مذکورہ بالا اشعار میں جس لینڈ اسکیپ کو پیش کیا گیا ہے۔وہ لینڈ اسکیپ صرف معروضی نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر کی اندرونی کیفیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔مثلاً اس شعر پر غور کر کے دیکھتے ہیں۔

کوہِ ماراں کی تجلی دیکھ کر منظورؔ اب
روشنی کیا ہے مجھے اب کیا کوئی سمجھائے گا

اس شعر کو اگر معروضی حوالے سے دیکھا جائے تو کوہِ ماراں کی تجلی کی کشش کے باعث مدوجزر کا منظر سامنے آتا ہے۔لیکن دوسرے مصرعے میں شاعر کا ''روشنی کیا ہے'' اور ''مجھے اب کیا کوئی سمجھائے گا'' جیسا استفہامیہ انداز شاعر کی داخلی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔اصل میں شاعر اپنے وطن کی سیاسی بے رحمی کے

سبب نہایت پریشاں ہے، اسے اپنے وطن میں رہ کر بھی بے وطنی کا احساس ہوتا ہے۔

اپنے ہی گھر میں خود کو میں بے گھر دکھائی دوں
ہارا ہوا ہوں اور سکندر دکھائی دوں

حکیم منظوؔر نے کشمیر کی آب و ہوا، وہاں کے پرندوں اور لوگوں کو مقامی تصورِ حیات ideology کے پسِ منظر میں بیان کیا ہے۔ان کے یہاں لفظ''دھوپ'' سختی کا نہیں بلکہ شادمانی کا استعارہ ہے جو مصائب سے نبرد آزمائی کی تحریک دیتا ہے۔ یہ وہ تازگی ہے جو کہ جسم کے ساتھ ساتھ روح کو بھی ہنگامے کی گرمی عطا کرتی ہے جب کہ ''برف'' جسم وجاں کی یخ بستگی کا استعارہ ہے۔

مرا بس چلے برف زاروں کے بیچ
بناؤں میں کوئی مکاں دھوپ کا

حکیم منظوؔر کی شاعری کشمیر کا پُر اثر مرثیہ ہے۔انھوں نے اپنے کئی اشعار میں کشمیر کی سیاسی حالات کو پیش کیا ہے۔ یہ اشعار کشمیر کی عظمتِ رفتہ کا قصیدہ پُر آشوب، حال کا مرثیہ اور غیر یقین مستقبل کا آئینہ ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

امبری سیبوں کے میرے باغ سارے لُٹ گئے
میں وہ شہزادہ ہوں جو بے سلطنت کے رہ گیا

یہ کھوکھلے چنار شکستہ حویلیاں
کچھ سال پہلے گاؤں تھا شاداب ہو گیا

مذکورہ بالا اشعار میں شاعر نے اپنے وطن (کشمیر) کی شان وشوکت کے عروج وزوال جیسے موضوع کو بیان کیا ہے۔سرزمینِ کشمیر جو کبھی اپنی ایک انفرادی پہچان رکھتی تھی، آج سیاست نے اس کو اس طرح سے

تباہ و برباد کیا ہے کہ سوائے افسوس کے کسی اور جذبے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ بستی ہے جو کبھی سر سبز و شاداب نظر آتی تھی، اب وہاں دور دور تک کہیں پہ زندگی نظر نہیں آتی ہے۔

رفیق رازؔ کی غزلوں میں کشمیر کی مٹی کی خوشبو ہے۔ان کے کلام میں کشمیریت رچی بسی ہوئی ہے۔ وہ اپنی تشبیہیں اور استعارے کشمیر کی فضا سے لیتے ہیں۔ ان کی محاکات میں بھی یہی رچاؤ ہے۔ان کی غزلوں میں ایسے کئی اشعار نظر آتے ہیں جنہیں بجا طور پر کشمیر کی شاعری کہا جا سکتا ہے۔رازؔ قاری کو اپنے وطن کشمیر کی سیر کرنے کی دعوت اس طرح دیتے ہیں۔

خواب کی کرچیوں کو ساتھ لئے
وادیٔ شب کی دلدلوں میں اتر

تو کسی دن لباس شعلہ میں
میرے برفیلے جنگلوں میں اتر

دودھیا ابر کے محل سے نکل
خون آلودہ آنگنوں میں اتر

مذکورہ اشعار میں ایک مقدس کرب ہے۔ جو خوابوں کو خواب سمجھنے پر بھی ان ہی خوابوں کو پلکوں پر سجانے کے لئے بے چین ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر کی سرزمین صنفِ غزل کی ترقی کے تعلق سے نہایت زرخیز ہے۔ اگر ریاست کو بھی کسی طرح کی مرکزیت حاصل ہوئی ہوتی تو اس کی ادبی تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔لیکن اس کے باوجود بھی یہاں کے شعرا نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ قابلِ تحسین ہیں اور اس بات

کی ضمانت ہیں کہ ملک کے دوسرے ادبی مراکز کی طرح ریاست کی ادبی تاریخ کسی سے کم نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی کہتا چلوں کہ ریاست کے لوگ جس ناپاک سیاست کا شکار ہوئے ہیں، اس کا براہ راست اثر یہاں کے ادب پر بھی پڑا ہے۔ جسے ریاست کے ہی ایک شاعر بشیر منظؔر کے اس شعر سے سمجھا جا سکتا ہے اور یہ شعر ریاست کی مجموعی شاعری کا خلاصہ پیش کرتا ہے۔

یہاں شاعر نہیں کرتے لب و رخسار کی باتیں
یہاں مقتل کے قصے ہیں، فقط ہیں دھار کی باتیں

☆☆☆

﴿کتابیات﴾

بنیادی ماخذ

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب	مقامِ اشاعت (پبلشر)	سنِ اشاعت
1	پرتپال سنگھ بیتابؔ	پیشِ خیمہ	قومی پرنٹنگ پریس، جموں	1980
2	پرتپال سنگھ بیتابؔ	سراب درسراب (غزلیں)	ہندوستان آرٹ پریس، جموں	1984
3	پرتپال سنگھ بیتابؔ	خودرنگ	ثمر آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی	1995
4	پرتپال سنگھ بیتابؔ	موج ریگ (غزلیات)	رہبر آفسیٹ پرنٹنگ سنٹر، دہلی	2003
5	پرتپال سنگھ بیتابؔ	نظم اکیسویں صدی	رہبر آفسیٹ پرنٹنگ سنٹر، دہلی	2008
6	پرتپال سنگھ بیتابؔ	ملک آثار	نرمل آرٹ پرنٹرز (جموں)	2013
7	حامدیؔ کاشمیری، ڈاکٹر	لاحرف (غزلوں کا مجموعہ)	جے۔کے۔آفیسٹ پریس، دہلی	1984
8	حامدیؔ کاشمیری	کیفِ عزم	جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرس (دہلی)	1991
9	حامدیؔ کاشمیری	وادیٔ امکاں (مجموعہ غزلیات)	جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز (دہلی)	2000
10	حامدیؔ کاشمیری	خوابِ رواں	جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرس (دہلی)	2003
11	حامدیؔ کاشمیری	شہرِ گماں	جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرس (دہلی)	2005
12	حکیم منظورؔ	ناتمام	جے۔کے۔آفیسٹ پریس، دہلی	1977
13	حکیم منظورؔ	لہولمس چنار	جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرس (دہلی)	1983
14	حکیم منظورؔ	برف رتوں کی آگ	عارض آفسٹ پریس، دہلی	1990
15	حکیم منظورؔ	برفاقتاب	سیما آفسٹ پریس (دہلی)	2000
16	حکیم منظورؔ	سخن برف زاد	جے۔کے۔آفیسٹ پریس، دہلی	2002
17	حکیم منظورؔ	صبح۔شفق تلاوت	خبرونظر پبلکیشنز	ندارد
18	حکیم منظورؔ	قلم، زباں، شگاف	شالیمار آرٹ پریس، سرینگر	2005
19	خالد بشیر احمد	خواب پارہ	جے کے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2008

20	دیناناتھ مستؔ کاشمیری	فردوسِ خیال (شعری مجموعہ)	نعمانی پریس (دہلی)	1977
21	دیناناتھ مستؔ کاشمیری	الہاماتِ مستؔ (شعری مجموعہ)	نعمانی پریس (دہلی)	1985
22	رفیق رازؔ	مشراق	تحریک ادب، وارانسی	2012
23	رفیق رازؔ	انہار	شارپ پرنٹنگ ایجنسی، نئی دہلی	2004
24	رفیق رازؔ	مشراق	تحریک ادب، وارانسی	2009
25	رفیق رازؔ	نخلِ آب	الحیات پرنٹوگرافرس (سرینگر)	2015
26	سلطان الحق شہیدیؔ	انکشاف	شالیمار آرٹ پریس (سرینگر)	2008
27	سلطان الحق شہیدیؔ	تیشۂ گل (شعری مجموعہ)	کلاسک آرٹ پرنٹرز (نئی دہلی)	2009
28	سلطان الحق شہیدیؔ	برگ برگ (شعری مجموعہ)	شہیدی پبلی کیشنز، لال بازار۔سرینگر	2012
29	شوریدہؔ کاشمیری	جوشِ جنوں (شعری مجموعہ)	جمال پرنٹنگ پریس (دہلی)	1980
30	شوریدہؔ کاشمیری	جذبِ دروں	ندارد	1988
31	شہ زورؔ کاشمیری	کیفِ عزم	الحیات پرنٹوگرافرس (سرینگر)	2003
32	شبنم قیوم ڈاکٹر	من میں جمی برف	کلاسک آرٹ پریس، دہلی	2013
33	شبیب رضوی	لہولہو غزل (شعری مجموعہ)	جے۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز (دہلی)	2012
34	شفقؔ سوپوری	دلِ خاگ بستر	فوٹو آفسٹ پرنٹرس (دہلی)	1989
35	عابدؔ مناوری	بہارِ غزل	چاند پریس، جموں	1961
36	عابدؔ مناوری	شمیمِ گل	جموں پرنٹنگ پریس، جموں	1967
37	عابدؔ مناوری	برجستہ	آدتیہ آفسیٹ پریس	1984
38	عرشؔ صہبائی	شکستِ جام	مکتبہ اردو ادب (جموں)	1958
39	عرشؔ صہبائی	شگفتۂ گل	مکتبہ اردو ادب (جموں)	1961
40	عرشؔ صہبائی	نایاب	کمپوزنگ، رنکوکول (2595136)	2004

41	فریدہ کول، ڈاکٹر	سلگتی بہاریں (شعری مجموعہ)	کاف پرنٹرس، سرینگر	2010
42	فرید پربتی، ڈاکٹر	آبِ نیساں	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی	1991
43	فرید پربتی، ڈاکٹر	اثبات	عفیف پرنٹرس لال کنواں، دہلی	1998
44	فرید پربتی، ڈاکٹر	ابرِ تر	مکتبہ علم وادب (سرینگر)	1988
45	فرید پربتی، ڈاکٹر	ہجومِ آئینہ	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2010
46	فرید پربتی، ڈاکٹر	ہزار امکاں (کلیات)	ایس۔ایچ۔آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	2011
47	فاروق نازکی	لفظ لفظ نوحہ	تابش پبلی کیشنز (سرینگر)	1984
48	کشمیری لال ذاکر	شیشہ بدن خواب (شعری مجموعہ)	ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی	1999
49	میر غلام رسول نازکی	چراغِ راہ	شالیمار آرٹ پریس، سرینگر	1989
50	میر غلام رسول نازکی	متاعِ فقیر (شعری مجموعہ)	شالیمار آرٹ پریس، سرینگر	1996
51	منوہر لال دل	نقدِ دل	کوہِ نور پریس (دہلی)	1975
52	میر حسام الدین، ڈاکٹر	ارمغان وادی (شعری مجموعہ)	میزان پرنٹر، بٹہ مالو (سرینگر)	2009
53	نندلال کول طالب	رشحات التخیل	ندارد	1925
54	نذیر آزار	نغمۂ زنجیر پا	جے۔کے۔آفسیٹ پریس (دہلی)	1992
55	ہمدم کاشمیری	ورقِ سادہ	اسکرین پلے (بنارس)	2012
56	ہمدم کاشمیری	دھوپ لہو کی	اکشر اگرافکس، نئی دہلی	2003

ثانوی ماخذ

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب	مقامِ اشاعت (پبلشر)	سنِ اشاعت
1	ایم بشیر الحسن	روحِ ادب	ممتا پبلی کیشنز (سرینگر)	2011

2	برج پریمی، ڈاکٹر	جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما (تنقید و تحقیق)	رچنا پبلی کیشنز (جموں)	2004
3	برج پریمی، ڈاکٹر	کشمیر کے مضامین ''ادب اور ثقافت''	فوٹو لیتھوورکس (دہلی)	1989
4	پریمی رومانی، ڈاکٹر	برج پریمی، ایک مطالعہ	ویپ پبلی کیشنز (جموں)	1993
5	جان محمد آزاد	جموں وکشمیر کے اردو مصنفین	جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر	2004
6	جی۔ایم۔میر	جموں وکشمیر کی جغرافیائی حقیقتیں	مکتبہ رضوان، میرپور، آزاد کشمیر	ندارد
7	حبیب کیفوی	کشمیر میں اردو	مطبع عالیہ، ۱۲۰۔ٹمپل روڈ (لاہور)	1979
8	حامدی کاشمیری	ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب	شیخ محمد عثمان اینڈ سنز (سرینگر)	2010
9	حشمت اللہ خان لکھنوی	مختصر تاریخ جموں وکشمیر	پرنس آفسٹ پرنٹرس، دہلی	1939
10	خواجہ ثناءاللہ بٹ	عہد نامہ کشمیر	علی محمد اینڈ سنز، سری نگر کشمیر	1996
11	سنبل نگار	اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ایم۔کے۔آفسیٹ پرنٹرز	1995
12	ساجد امجد	اردو شاعری پر برِصغیر کے تہذیبی اثرات	غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی	1989
13	شفق سوپوری، ڈاکٹر	غ۔م۔طاؤس ''فن اور شخصیت''	عفیف پرنٹرس (دہلی)	2012
14	شہاب عنایت ملک، پروفیسر	جموں وکشمیر میں اردو زبان (ماضی، حال اور مستقبل)	سنٹر فار پروفیشنل اسٹڈیز ان اردو جموں یونی ورسٹی جموں	2010
15	شمیم حنفی	غزل کا نیا منظر نامہ	تاج آفسیٹ پریس (الہ آباد)	1981

16	شبنم قیوم	کشمیر کا سیاسی انقلاب	کشمیر بک ڈپو پبلشرز، سری نگر کشمیر	1989
17	شبینہ پروین، ڈاکٹر	اردو غزل کی ثقافتی اساس	ینگ پبلیشنگ ہاوس (دہلی)	2008
18	صوفی محی الدین	کشمیر کی ثقافت کے بدلتے نقوش	زہرا پبلی کیشن ہاوس (سرینگر)	2007
19	طاہرہ منظور	ہندوستانی مشترکہ تہذیب اور اردو غزل	انڈین کاؤنسل فار کلچر ریلیشنز	2006
20	عبدالقادر سروری، پروفیسر	کشمیر میں اردو، پہلا حصہ (پسِ منظر)	جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز (سرینگر)	ندارد
21	عبدالقادر سروری، پروفیسر	کشمیر میں اردو (جلد دوم)	جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس (دہلی)	1982
22	عبدالقادر سروری، پروفیسر	کشمیر میں اردو (تیسرا حصہ)	جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس (دہلی)	1984
23	غنی کاشمیری	دیوانِ غنی	کتب خانہ شبلی نعمانی ندوہ (لکھنو)	1845
24	عرش صہبائی	جانے پہچانے لوگ (تذکرہ)	ٹائٹل و فوٹو بلاک، قانون پریس (امرتسر)	1966
25	قمر رئیس	معاصر اردو غزل	سیما آفسیٹ پریس	1994
26	مصرہ مریم	حامدی کاشمیری، حیات اور شخصیت	کمپوزنگ کمپیوٹر سٹی، راجباغ سرینگر	2001
27	مجنوں گورکھپوری	ادب اور زندگی	اسرار کریمی پریس، الہ آباد	1964

28	محی الدین زوؔر کشمیری، ڈاکٹر	روداد اردو	جمع، کشمیر یونیورسٹی(16.03.2011	ندارد
29	محمد منور مسعودی، ڈاکٹر	رنچن سے رنجیت تک (تاریخ کشمیر)	انڈین پرنٹنگ پریس (سرینگر)	1993
30	نندلال کول طالبؔ	جوہر آئینہ" جائزہ، کلام غالبؔ	ودیارتن آرٹسٹ (جموں)	1971
31	وزیر آغا، ڈاکٹر	اردو شاعری کا مزاج	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	1974

رسائل وجرائد

ایوانِ ادب، سہ ماہی، شمارہ، 2 تا 3، مقامِ اشاعت۔ پٹنہ

بازیافت (تحقیقی وتنقیدی مجلّہ) شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، 1997

بازیافت، سالانہ، شعبۂ اردو، کشمیر یونی ورسٹی، 2006

بازیافت (تحقیقی وتنقیدی مجلّہ) جشنِ زریں نمبر، شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، 2007

ترسیل، مجلّہ، ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن، کشمیر یونیورسٹی (سرینگر) 2011

سوونیر، جشنِ کشمیری لال ذاکر، گوہر ہاؤس چنڈی گڑھ، 25/فروری۔ 1995

شیرازہ، ماہنامہ (جموں، کشمیر، لداخ) جلد 45، شمارہ۔ 8 تا 11، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز (سرینگر)

شیرازہ، ماہنامہ، جلد 48، ہمعصر شعری انتخاب، شمارہ، 10 تا 12، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز (سرینگر)

شیرازہ، ماہنامہ، شمارہ، 003، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز (سرینگر)، اشاعت، 1962

شیرازہ، ماہنامہ (جموں، کشمیر، لداخ) جلد 5، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز (سرینگر)

شیرازہ، ماہنامہ۔ جلد 21، (نوجوان نمبر) شمارہ، 11،، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر، 1983

شیرازہ، ماہنامہ، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر، جولائی، 1998

شیرازہ، ماہنامہ، جلد 47، گوشہ، آغا شورش کاشمیری، شمارہ نمبر، 12.11،، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر،

شیرازہ، ماہنامہ، جلد 52، گوشہ شوریدہ کاشمیری، شمارہ نمبر، 1، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر،

شیرازہ، ماہنامہ، غلام رسول سنتوش نمبر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر، اگست، 2010

شیرازہ، ماہنامہ، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر، جولائی، 1998

شیرازہ، ماہنامہ، صوفیانہ موسیقی اور کشمیر، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر، مارچ، 1977

شیرازہ، ماہنامہ، جلد 52، جموں و کشمیر میں اردو شاعری نمبر، شمارہ، 6.7، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر

شیرازہ، ماہنامہ، جلد، 52، جموں، کشمیر، لداخ۔ شمارہ 3.2، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر

شیرازہ، ماہنامہ، جلد، 51، شمارہ، 8، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر

شیرازہ، ماہنامہ، جلد، 37، (جموں و کشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال)، شمارہ، 8.6، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر، دوسرا ایڈیشن، 2004

شیرازہ، ماہنامہ، جلد، 49، شمارہ، 12.11، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر

شیرازہ، ماہنامہ، جلد، 52، شمارہ، 6.7، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سری نگر، کشمیر

ہمارا ادب، شخصیات نمبر 2، نگراں، محمد یوسف ٹینگ، مطبع، فوٹو لیتھو ورکس، دہلی، 1886.1885

ہمارا ادب، نگراں، محمد یوسف ٹینگ، مطبع، ڈی لائٹ پرنٹنگ پریس (دہلی) 1971

ہمارا ادب، شیرازہ انتخاب نمبر، نگراں، محمد یوسف ٹینگ، مطبع، جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس (دہلی) 1978 .1979

ہمارا ادب، نگراں، محمد یوسف ٹینگ، ناشر، کلچرل اکیڈمی (سرینگر) 1973

تحریک بقائے اردو

تحریک ادب

شمارہ ۴۵ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء)

ISSN 2322-0341

A peer Reviwed Urdu Journal
Approved By U.G.C. S. No.41078

گوشہ

م۔اشرف

مدیر اعلیٰ
جاوید انور

Scanned by CamScanner

فہرست

1۔مناجات	بشیر ابن نشاط کشتواڑی	6
2۔کلمات رب کی دریافت،توحید کا طریقہ خدا کا فلسفیانہ تصور،معرفت کے درجات	مولانا وحید الدین خاں	7
مضامین		
1۔عتیق اللہ کی تنقیدی بصیرت،درباب ترجیحات	پروفیسر آفتاب احمد آفاقی	11
2۔بے کرانیاں کی مصور	سعید نقوی	20
3۔ناول "فرات" کے متعلق چند باتیں	پروفیسر صغیر افراہیم	25
4۔تمل ناڈو میں میں اردو نثر کا ارتقا	علیم صبا نویدی	39
5۔مصر میں ہندوستانی فلموں کی مقبولیت	ڈاکٹر ولا جمال العسنیٰ	49
6۔علامتوں اور لفظوں کی مصورہ۔۔پروین شاکر	ڈاکٹر ناظمہ انصاری	52
7۔اقبال اور فلسفہ خودی	ڈاکٹر نظام الدین	56
8۔اردو نظم کا بے نظیر شاعر۔۔نظیر اکبر آبادی	ڈاکٹر جمشید احمد	60
9۔اشفاق احمد۔۔ایک ادبی لیجنڈ	افتخار احمد	65
10۔پریم چند کے ناول "منگل سوتر" کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ	محمد یٰسین	71
11۔مشتاق احمد وانی کی افسانوی کائنات	ڈاکٹر مول راج	75
12۔پریمی رومانی۔۔۔بحیثیت شاعر	ڈاکٹر محمد اشرف شبنم	80
13۔مغلوں کی مختصر تاریخ۔عالم گیر شاعر بجری کے حوالے سے	محمد شعبان	85
14۔صحافت اور اخبار کی مختصر تاریخ	جگ موہن سنگھ	90
15۔جموں و کشمیر میں جدید اردو غزل:ایک تجزیاتی مطالعہ	اویس احمد	97
16۔ذوالفقار نقوی کی شاعری کا تاثراتی جائزہ	محمد شکیل	101

ISSN-2322-0341

Scanned by CamScanner

काशी हिन्दू विश्वविद्यालय
BANARAS HINDU UNIVERSITY

अन्तरराष्ट्रीय संगोष्ठी

"हिन्दी-उर्दू की साझी विरासत और स्त्री लेखन"

بین الاقوامی سیمینار

اردو ہندی کی ساجھی وراثت اور خواتین قلم کار

International Seminar on "Hindi - Urdu Ki Saajhi Virasat aur Stri Lekhan"

on 27th - 29th March 2018.

Certificate

This is certify that Prof./Dr./ Ms./Mr./Mrs/ Ovais Ahmad

Central University of Hyderabad has participated and presented his/ her paper

entitled Urdu Shari mai hindu muslim tehzeeb ke jalkiya

in the **3 day International Seminar on "Hindi - Urdu Ki Saajhi Virasat aur Stri Lekhan"** and contributed towards the success of the seminar.

Head, Department of Urdu
Dr. Aftab Ahmad Afaqui

Organizing Secretary
Dr. Mosharraf Ali

Convener
Prof. Champa Singh

Scanned by CamScanner

GOVT. DEGREE COLLEGE (W)
HUSSAINI ALAM, HYDERABAD, T.S

گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین
حسینی علم حیدرآباد، تلنگانہ

دو روزہ قومی سیمینار بعنوان: اردو کی شعری اصناف

Two-day National Seminar on **"GENRE OF URDU POETRY"** held on 22nd & 23rd March 2019

Sponsored by: NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE (NCPUL), New Delhi
in Collaboration with TELANGANA STATE URDU ACADEMY

Organized by: DEPARTMENT OF URDU

CERTIFICATE

This is to certify that Dr./Mr./Ms. Ovais Ahmad

of University Of Hyderabad. *has presided/attended as*

resource person/participated/presented a paper titled "ریاست جموں و کشمیر کے ایک رومان پرور شاعر حسن علی شہبا انصاری"

in Two-day National Seminar in GENRE OF URDU POETRY held on 22nd & 23rd March 2019.

Dr. Abdul Quddus
Convener

Harbans Kour
Principal

Scanned by CamScanner

DECLARATION

I, **OVAIS AHMAD** hereby declare that this thesis entitled **"JAMMU WA KASHMIR MEIN URDU GAZAL KA FANNI WA FIKRI MUTALAE,1947 KE BAAD"** submitted by me under the guidance and supervision of **PROF.HABEEB NISAR,** is bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in shodhganga / INFLIBNET.

Date: ……

HYDERABAD

Name: **OVAIS AHMAD**

Signature of the Student

Reg. No.16HUPH04

UNIVERSITY OF HYDERABAD

DEPARTMENT OF URDU, SCHOOL OF HUMANITIES

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled **"JAMMU WA KASHMIR MEIN URDU GAZAL KA FANNI WA FIKRI MUTALAE,1947 KE BAAD"** submitted by **OVAIS AHMAD** bearing Reg. No**. 16HUPH04** in partial fulfillment of the requirements for the award of Doctor of Philosophy in **URDU** in the School of Humanities is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for award of any degree or diploma. Part of this thesis has been.

A. Published in the following publications.

1. Jammu wa Kashmir mei Jadeed Urdu Gazal: Aik Tajziyati Mutalae (Tahreeq e adab.-varanasi.ISSN NO-2322-0341,UGC S.NO-41078)

B. Presented in the following Conferences.

1. Urdu Hindi ki Saji Warasat Aur Khawateen Kalam kar**:**Urdu Shayeri mei Hindu Muslim Tahzeeb ki Jhalkiyan(International,Banaras Hindu University, UP)
2. Genre Of Urdu Poetry**:** Riyasat Jammu wa Kashmir Ke Aik Ruman Parver Shayar"Hassan Ali Tanha Ansari".. **(**National, Govt.Degree College,Hyd)

Further, the student was exempted from doing coursework (recommended by Doctoral Committee) on the basis of the following courses passed during his M. Phil programme and the M. Phil degree was awarded.

SL No.	Course Code	Title	Credits	Pass/Fail
1	UR 701	Research Methodology	4.00	Pass
2	UR702	Practical Criticism	4.00	Pass
3	UR721	Textual Criticism	4.00	Pass
4	UR780	Dissertation	12.00	Pass

Supervisor Head of the Department Dean School of Humanities

JAMMU WA KASHMIR MEIN URDU GAZAL KA FANNI WA FIKRI MUTALAE, 1947 KE BAAD

A thesis submitted for the degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

In

UDRU

By

Ovais Ahmad

Reg. No. 16HUPH04

Department of Urdu

School of Humanities

University of Hyderabad

Hyderabad - 500046

India

2021